دولت عثمانیہ
باتصویر
بحیرہ عرب

تاریخ ہند میں جدید انکشاف و انقلاب

دولت غزنویہ
بالتصویر

یعنی

غازی سلطان محمود غزنوی رح اور اسکے جانشینوں کے ولولہ انگیز مجاہدانہ دینی

اور علمی کارنامے اور بیشمار غلط فہمیوں کا ازالہ

مؤلفہ

مولینا محمود الرحمٰن صاحب ندوی

۱۹۳۱ء ۱۳۴۹ھ

حسب فرمائش

شیخ علی بخش و محمد بخش مالکان کتبخانہ دار الادب

اندرون بھاٹی دروازہ لاہور

باراول ایکہزار

(قیمت [illegible] دو روپیہ ۲ عہ)

فہرست مضامین تاریخ دولت غزنویہ

تصاویر

(۱) سلطان محمود غزنوی (سہ رنگ)

(۲) امیر ناصر الدین سبکتگین (دو رنگ)

(۳) مقبرہ سلطان محمود غزنوی

(۴) غزنی کی ایک مسجد۔ (۵) سومنات۔

تاریخ ہند قدیم

ہندوستان کی قدیم تاریخ معدوم ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ کبھی وجود ہی میں نہیں آئی۔ افسانہ تاریخ سے مختلف چیز ہے۔ دراصل ہندوستان قدیم کو فلسفہ اور الہیات سے اس قدر فرصت ہی نہیں ملی۔ کہ وہ تاریخ کی طرف التفات کرتا۔

آج ہندو قوم جن چیزوں کو تاریخ کہتی ہے وہ افسانے ہیں یا شاعری، مثلاً رامائن اور مہابھارت خود ان کتابوں کی اندرونی شہادت اس بات کی تائید کرتی ہے۔ چنانچہ ان کی تحقیقات نہیں بلکہ مبالغہ ہے۔ بالمیک اور تلسی داس مورخ نہیں بلکہ شاعر تھے۔ تاہم کامیاب شاعر۔ ان کی مثنویاں ادبیات میں خاص درجہ رکھتی ہیں۔ یہی ان کی ادبیانہ خدمات کی داد ہے اور بس۔

البتہ ہندوستان قدیم کے متعلق ایک تاریخ ملتی ہے۔ جس کا نام "کوٹلیہ" ہے اور کچھ شک نہیں کہ یہ مستند اور قابل اعتبار ہے جس میں

ایک دور قدیم کے نظام حکومت اور خود راجہ کے حالات سے بحث کی گئی ہے۔ تاہم یہ تاریخ کے بحر بے پایاں میں سے ایک قطرہ سے بھی کم ہے۔
اس کے خلاف مسلمانوں کی مستند تاریخ موجود ہے۔ اور وہ مسلسل اور مفصل ہے۔ اسلامی مورخین کے قلم سے نکلی ہوئی تاریخ ہند بھی سلسلہ وار اور بالتفصیل موجود ہے۔ نہ صرف اس زمانے سے جب مسلمانوں نے ہندوستان پر سیاسی غلبہ حاصل کیا۔ بلکہ اس سے بہت پیشتر کے بعض حالات ہند عربوں کے سفرناموں میں اس طرح موجود ہیں جس طرح چینیوں اور یونانیوں کے سفرناموں میں اور البیرونی کی تاریخ تو نہایت مقبول ہے۔

تاریخ ہند اور عہد اسلام

آج مسلمانوں کے زمانے کی جو نام نہاد تاریخیں انگریزی اردو یا دیگر ہندوستانی زبانوں میں پائی جاتی ہیں وہ سراسر جھوٹ کی پوٹ ہیں۔ کیونکہ ان کی غرض وغایت اظہار معلومات نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ اہم ہے۔ یعنی وہ ضرورت جسے آجکل "پروپگنڈا" کہتے ہیں۔ تعریف خود توہین دیگراں۔
اسلامی ہند پر جو کتابیں لکھی گئیں۔ ان کے مولف بالعموم انگریز ہیں یا پرجوش و متعصب مہاسبھائی۔ اگر اول الذکر طبقے نے اپنی حکومت کی خیر اسی میں سمجھی کہ مسلم حکمرانان ہند کو دل کھول کر کوسا جائے (تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد استوار نہ ہوسکے) تو ثانی الذکر نے بھی اپنی قوم اور اپنے دھرم کی سود وبہبود اسی میں سمجھی کہ

محمود غزنوی - اورنگ زیب اور دیگر شاہان اسلام کو بھی کھول کر بدنام کیا جائے۔

میجر بی۔ ڈی۔ باسو آئی۔ ایم۔ ایس نے انگریزی زبان میں ایک تاریخ شائع کی ہے جس کا نام "رائز آف دی کرسچین پاور ان انڈیا" ہے۔ اس میں قابل مولف نے ثابت کیا ہے۔ کہ "یورپین طاقتوں نے ہندوستان بزور شمشیر نہیں تسخیر کیا بلکہ اس میں زیادہ حصہ فریب کاری کا ہے۔"

موصوف نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ انگریز مورخین اور اہل قلم نے اپنی تبلیغی تاریخ نویسی کی تصویر دل میں اپنی قوم کو ان کوششوں میں جس قدر معصوم، نیک نیت ایماندار وغیرہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ تمام تر مصنوعی رنگ آمیزی ہے اس واسطے پروفیسر سیلی کہتے ہیں کہ انگلش نقطۂ خیال ہمیشہ سیاسی ہی ہوتا ہے۔

یہی بات بے خوف تردید ان "مقدس" مورخین کی نسبت بھی کہی جا سکتی ہے جنھوں نے اسلامی تاریخ پر عنایت بے غایت فرمائی ہے عام اس سے کہ وہ یورپین ہوں یا ہندوستانی۔ اسلامی ہند کی تاریخ اسی چیز کا تو ایک حصہ ہے جسے مسٹر باسو "فریب کاری اور عیاری" کے مترادف قرار دیتے ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی "معارف" کے ایک شذرہ میں کیا خوب تحریر فرماتے ہیں کہ "آج کی تاریخ اس لئے معتبر نہیں کہ موجودہ حکومت کے قواعد طبع واشاعت کی ہمہ گیری میں اس عہد کی صحیح تاریخ کی تدوین ممکن نہیں۔ تاہم جیسے جیسے مورخین کا قلم زیادہ آزاد ہوتا جائیگا عہد ماضی وحال کی تاریخ تصویر زیادہ روشن ہوتی جائے گی لو

مستقبل تاریخ کے محکمۂ عدالت میں سب گنہگار ٹھہریں گے اور میجر باسو اس لئے قابل قدر ہیں کہ انھوں نے اس محکمہ کے افتتاح کا آغاز کر دیا ہے۔"

پروفیسر جادو ناتھ سرکار صحیح تاریخ اورنگ زیب شائع کر کے دنیا کی آنکھیں کھول چکے ہیں۔ بھائی پرمانند ایم اے (سیاسی شدہی سے پہلے) نے بھی تاریخ ہند لکھکر اور ایک دوسرے ہندو مصنف نے ہندی میں ایک کتاب "بھارت میں انگریزی راج" شائع کرنے کی جرأت مردانہ کی مگر سزا پائی۔ چنانچہ ہر دو کتب ضبط ہو چکی ہیں۔

یہ کتاب فی الحقیقت تاریخ ہند کا ایک اہم باب ہے۔ جو بہت سے اسرار کی نقاب کشائی کرتا ہے۔

کچھ شک نہیں کہ عہد برطانیہ میں جس قدر ہندوستانی تاریخیں تصنیف ہوئیں ان میں سب سے زیادہ جس چیز کا مظاہرہ کیا گیا وہ مسلم حکمرانوں کے فرضی مظالم ان کی غلط بد اخلاقیاں، بے سرو پا سفاکیاں، ان کا تعصب اور تنگ نظری ہے۔ جس کی غرض و غایت یہ نہ تھی کہ اظہار حقیقت ہو جائے۔ بلکہ کچھ اور تھی یعنی یہ کہ اہل ہند اپنے سابق حکمرانوں اور مشاہیر کو محض متعصب اور جاہل سمجھیں۔ پس بقول میجر باسو انگریز مورخین کی کتابوں میں صحیح واقعات کی تلاش عبث ہے۔

الغرض جدید تواریخ ہند (جن کے مصنف بالعموم انگریز ہیں) بقول میجر باسو یک طرفہ اور ناقابل اعتماد ہیں۔ مگر یہ امر ناگزیر بھی تھا کیونکہ ایک حقیقی مورخ کو فلسفی ہونا

چاہیئے۔ اور انگریز فلسفی نہیں ہیں۔

مگر اس میں حیرت کی بات کیا ہے۔ مشہور جرمن ادیب و شاعر گوئٹے فلسفۂ تاریخ پر رائے زنی کرتا ہوا لکھتا ہے۔ کہ "تاریخ کا مختلف ازمنہ میں لکھا جانا ضروری ہے۔ مگر اس لئے نہیں کہ جدید انکشافات جلوہ نما ہیں بلکہ محض اس لئے کہ ہر عہد کا نقطۂ خیال خاص ہوتا ہے۔ پس اس وقت تاریخی کتب اُسی اصول پر تصنیف کرائی جاتی ہیں"۔

یہ امر واقعہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں جن انگریزوں نے بھی صحیح تاریخیں لکھنے کی جرأت کی ان کو مجرم قرار دیکر سزائیں دی گئیں۔ مسٹر الیگزینڈر ہملٹن نے اپنے سفر نامے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں اور ان کے ملازمین کی پولیٹیکل حرکات اور چالوں پر تنقیدی نظر ڈالی۔ یہ سفر نامہ ۱۷۳۹ء میں شائع ہوا مگر اس کے بعد نہیں چھپا اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کے چند ہی نسخے دنیا میں باقی رہ گئے ہیں

کپتان کننگھم نے سکھ حکومت کے زوال پر قلم اٹھایا مگر سخت سزا پائی۔

میجر ایونسی بل کو بھی اسی منزل سے گزرنا پڑا۔ اسے ذلیل اور برخاست کیا گیا پس ان میں سے اور کسی کو ایسی جرأت کیسے ہو سکتی تھی۔ حالانکہ بقول مسٹر باسو حقیقت یہ ہے کہ صحیح تاریخ ہند حکومت کے فوجی اور انتظامی حکام ہی لکھ سکتے تھے۔ لیکن ان کے قلم توڑ دیئے گئے۔ اسی سیاسی ملمع سازی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ آج عہد اسلام کی صحیح تاریخ کو ہماری آنکھیں ترستی ہیں۔

دوسرا نمایاں نتیجہ یہ ہے کہ آج طلباء تاریخ ہند خوفناک غلط فہمیوں میں مبتلا

ہیں ان بے چاروں نے غلط واقعات کو صحیح سمجھ لیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ وہ انگریزی زبان کے غلبہ کی وجہ سے فارسی یا عربی کی اصلی تاریخیں مطالعہ نہ کرسکے پس اہل ہند کے باہم دست و گریباں ہونے کی بڑی وجہ یہی ملمع سازی اور دروغ بافی ہے جو نہایت افسوسناک ہے۔

انگریزوں کے علاوہ جن ہندوستانیوں نے تاریخ ہند پر قلم اٹھایا انھوں نے اپنے واسطے معراج زریں یہی سمجھا۔ کہ ان کی کتاب کی سرکاری محکمہ تعلیم قدر کرے۔ یعنی وہ سرکاری درسگاہوں کے نصاب میں شامل ہوجائے۔ تاکہ مصنف طلب منفعت کرسکے۔

عہد اسلام کی تاریخ ہند پر ایک اور نقطۂ خیال سے بھی قلم اٹھایا گیا۔ چنانچہ غلط طور پر یہ فرض کرلیا گیا کہ دوسروں کو بُرا کہنے میں اپنی قوم کی بھلائی اور ترقی ہے۔ اور چونکہ قانون کی وجہ سے حکمران قوم کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لہذا مسلمانوں کو نشانہ بازی کے واسطے منتخب کیا گیا۔

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں۔ کہ ہر قوم کی تاریخ میں اچھے اور بُرے۔ منصفانہ اور غاصبانہ ہر دو اقسام کے واقعات پائے جاتے ہیں (اسلامی ہند بھی ان واقعات سے خالی نہیں ہوسکتا) لیکن صرف تاریکی ہی کو نمایاں کرنا اور روشنی کو چھپانا کہاں کی معقولیت ہے اور اس میں ملک و قوم کی کونسی بھلائی ہے۔

یہ ناحق کوشی ہوگی اگر ہم اس موقع پر اُن بے تعصب اور انصاف پسند ہندو اہل قلم کا ذکر نہ کریں۔ جنھوں نے اخلاقی جرأت دکھاکر وقتاً فوقتاً حق کا اظہار

کیا۔ گویا اپنی قوم کے شر پسند افراد کو چیلنج دیا اور دنیا کو حقیقت سے آشنا کیا۔

بنگالی اہل قلم مسٹر اومیش چندر دت نے "تاریخ اقتصادیات ہند" نیز "تاریخ قدیم تمدن ہند" کتابیں لکھکر حجاب اٹھایا۔ اسی طرح پروفیسر جادو ناتھ سرکار نے اپنی کتاب "اورنگ زیب" شائع کرکے اپنی قوم کے دل و دماغ صاف کرنے کی کوشش کی۔

میجر باسو کی کتاب "رائز آف دی کرسچین پاوران انڈیا" (عیسائی طاقتوں کا عروج ہندوستان میں) بھی اس معنی میں نہایت اہم کتاب ہے ہم ہر ہندوستانی سے اپیل کرتے ہیں۔ کہ وہ ان کتابوں کا ضرور مطالعہ کریں پھر ان کو حقیقت معلوم ہوجائے گی۔ کہ مسلمان حکمران کیا تھے اور انھوں نے ہندوستان پر کیا کیا احسانات کئے۔

ان ہر سہ دیگر مصنفین کے قلم نے اپنی قوم پر مسموم شدہ دل و دماغوں کے واسطے تریاق تیار کیا۔ جس کی اشد ضرورت تھی۔ ورنہ خطرہ کی توسیع یقینی تھی۔ کیونکہ یہ امر مسلمات سے ہے کہ ہندوستان کا مستقبل روشن بنانے کے واسطے ہندوستان کی دو بڑی قوموں ہندو اور مسلم کا اتحاد ضروری اور اشد ضروری ہے۔

اس نقطۂ نگاہ سے کتاب دولت غزنویہ کی تدوین کی گئی ہے

امید ہے کہ ہماری تمنا پوری ہوگی۔ غلط فہمیاں رفع ہوں گی۔ بدگمانیوں کے بادل ہٹینگے۔ ملمع سازی کا قلع قمع ہوگا۔ اور عروس حقیقت بے نقاب ہو کر رہیگی۔ ہندوستان کے فرزندوں کی باہمی نفرت و عداوت، روا داری اور محبت میں تبدیل ہو جائے گی۔ اور آخر کار ہندو اور مسلمان شیر و شکر آزاد فضا میں سانس لے سکیں گے ـــــ وہ بھی کیسا مبارک دن ہوگا۔

میں نے انہیں زرین توقعات کے ساتھ یہ اوراق سیاہ کئے ہیں جو اس وقت اشاعت پذیر ہو رہے ہیں۔

تاریخ ہند میں محمود کو عالمگیر رح سے کم خوفناک نہیں دکھایا گیا ہے۔ گویا وہ ہندو قوم اور ہندو دھرم کا جانی دشمن ہے۔ لیکن "دولت غزنویہ" دنیا کو بتائے گی۔ کہ محمود ایک فاتح سے کچھ بھی زیادہ نہیں تھا۔ فاتح ہر قوم کا یہی کرتا ہے۔ جو محمود نے کیا۔ رامائن کے ہیرو راجہ رام چندر نے اپنے ہم قوم راون سے وہی سلوک کیا جو فاتح بالعموم کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح مہابھارت کے بہادروں نے اپنے عم زاد بھائیوں کا قلع قمع کر کے دم لیا۔ کہتے ہیں کہ اسی عہد سے ہندوؤں کا اس قدر مستقل زوال ہوا۔ کہ وہ آج تک پنپنے نہ پائے چنانچہ وہ حاکم سے محکوم اور اغیار کے غلام بن کر رہ گئے۔

مگر محمود نے (اپنے مختلف العقیدہ) حریفوں سے اعلیٰ قسم کا سلوک کیا۔ چنانچہ راجہ جے پال اپنی طاقت کا غلط اندازہ کر کے غزنی پر حملہ آور ہوتا ہے

مگر ہزیمت کھا کر صلح کا ملتجی ہوتا ہے۔ محمود اسے امان دیتا ہے ۔لیکن راجہ بایں ہمہ بدعہدی کا مرتکب ہوتا ہے ۔جس کی گوشمالی کے واسطے محمود کو ہندوستان پر حملہ کرنا پڑتا ہے ۔

اسی طرح محمود بار بار غلط کار اور بدعہد راجاؤں کی خطائیں معاف کرتا اور ان کی جان بخشیاں کرتا ہے ۔جس کی تفصیلات اِس کتاب میں موجود ہیں ۔

لیکن اس کے باوجود محمود کو ملامت کی جاتی ہے ۔ اور راجاؤں کو بالکل معصوم ظاہر کیا جاتا ہے ۔ امید ہے ۔ کہ کتاب **دولت غزنویہ** اس قسم کی تمام ہلاکت آفرین غلط فہمیاں دُور کرنے میں کامیاب ہوگی اور فرزند ہند کی آنکھیں کھول دیگی ۔ پس اگر ایسا ہوا تو میں یہ سمجھ کر مسرور ہوں گا ۔ کہ میری محنت ٹھکانے لگی ۔ اور یہ اوراق اہل ہند کی غلط فہمی رفع کرنے میں کامیاب ہوسکے؛ فقط
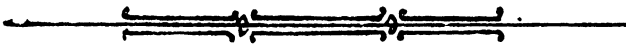
دولتِ غزنویہ

کہتے ہیں کہ یہ عالم، عالم اسباب ہے، میں کہتا ہوں، کہ یہ دُنیا عالم انقلاب اور دُنیائے عروج و زوال ہے۔ جس طرح ایک فرد انسان کے بعد دوسرا شخص اُس کا قائم مقام ہوتا ہے، اُسی طرح ایک قوم، اور ایک اُمت کی وارث دوسرے زمانہ میں دوسری قوم ہوتی ہے۔ ایک قوم کے زوال سے دوسری قوم کے عروج کا سلسلہ ملتا ہے۔ فلسفۂ تاریخ پر نظر ڈالو، تو اسی نتیجہ پر پہنچو گے!

دولت غزنویہ جس کا آغاز ۳۵۰ھ سے ہوتا ہے گویا دولت سامانیہ کی قائم مقام ہے۔ ۲۲۷ھ میں معتصم باللہ عباسی نے وفات پائی اور اُسی وقت سے آفتاب دولت عباسیہ کو گہن لگنا شروع ہوا، مکتفی باللہ عباسی کے زمانہ میں سامانی خاندان کے چشم و چراغ اسمٰعیل نے بخارا میں ایک طاقتور حکومت کی بنا ڈالی۔

اسمٰعیل۔ خداہ کی چوتھی پشت میں تھا، اور اس کا شجرۂ نسب حسب ذیل ہے:

بہرام چوبیں
|
نوشرد
|
طمغات
|
خداہ
|
سامان
|
اسد
|
احمد
|
اسمٰعیل

دولت سامانیہ سامان نے عجب قسمت پائی تھی، اس کا باپ "خداہ" محض مفلس، تنگدست، اور معمولی آدمی تھا، اور ساربانی جیسے ذلیل پیشہ پر اوقات بسری کرتا تھا۔ جب اس کے فرزند سامان نے عہد شباب کے پُر جوش میدان میں قدم رکھا، اور اس کی قوت سامعہ اُن روایات سے آشنا ہوئی، جو اس خاندان کی عظمت و شوکت سے تعلق رکھتی تھیں۔ تو وہ گویا خواب غفلت سے چونک پڑا۔ یعنی اپنے آبائی پیشہ ساربانی کو بہ نظر حقارت دیکھنے لگا، ارتقاء اقوام و افراد کی یہی منزل اوّل ہے، پھر بہادرانہ نغموں اور شجاعانہ گیتوں نے گویا اسے مدہوش کر دیا، وہ اٹھا اور تاخت و تاراج شروع کی۔ حتیٰ کہ شہر

"السـاس" پر تصرف کر لیا، یہ مقام استعجاب نہیں، اگر تم ماضئ بعیدہ میں دور تک دوڑے چلے جاؤ گے، تو ہر ترقی یافتہ اور آئینی دولت کا آغاز تقریباً ایسی ہی صورت میں نظر آئے گا۔ تم ابتداً اکثر بانیانِ حکومت کو غارت گروں، اور رہزنوں سے زیادہ ممتاز شکل اور حیثیت میں نہ دیکھ سکو گے!

خلیفہ مامون الرشید (عباسی) کے زمانہ (۱۷۵ھ) میں سامان کا فرزند اسد اُمرائے عباسیہ کے پہلو بہ پہلو کھڑا نظر آتا ہے۔ اور اس کے باقی تین بھائی احمد، یحییٰ اور الیاس بالترتیب سمرقند، فرغانہ، الساس اور ہرات کی حکومتوں پر مامور ہیں!

۲۶۱ھ میں خلیفہ معتمد (عباسی) نے تمام ترکستان (ماوراء النہر) کی حکومت کی سند نصر بن احمد بن اسد کو عطا کی، اور بخارا کی حکومت نصر کے چھوٹے بھائی اسمٰعیل کو، لیکن ۲۷۹ھ میں نصر نے وفات پائی، اور اب ترکستان کا بے شرکت غیرے واحد گورنر جنرل خوش نصیب اسمٰعیل مقرر ہوا۔ اس کی حکومت کا مرکز بخارا تھا!

اس تاریخی بیان کے موجود ہوتے ہوئے زمانۂ حال کا انگریز مؤرخ لیتھبرج اپنی تاریخ ہند مروجہ پنجاب کے صفحہ ۶۷ پر لکھتا ہے، "کہ اسمٰعیل سامانی صوبیدار ماوراء النہر و خراسان، خلیفہ سے باغی ہو کر شاہ بخارا بن گیا۔"

ہم اس دعویٰ کو تسلیم کر لیتے، اگر مؤرخ کسی قدیم تاریخ کا "سند" حوالہ

دیدینا لیکن دعوے بے دلیل کی اہمیت اور وقعت ظاہر ہے۔

بنی لیث کی ہزیمت کے بعد خراسان کی حکومت بھی اسمٰعیل ہی کے حصّے میں آئی اور بعض صوبے ایران کے بھی اسی کی ماتحتی میں دیدیے گئے یہ زمانہ خلافت معتضم باللہ عباسی کا تھا

اس وقت خلافت بغداد کا انحطاط شروع تھا۔ اور اسی سبب سے چینی اور ترک (غیر مسلم) بار بار اسلامی ترکستان پر حملے کرتے تھے اسمٰعیل نے ان بیرونی دشمنوں کو بار بار شکستیں دیں۔ حتیٰ کہ وہ اس کا لوہا مان گئے۔

ہم کہہ چکے ہیں، کہ خلافت بغداد روز بروز زوال پذیر تھی۔ پس اس وقت مسلمانوں کا ملجا و ماوا صرف دربار بخارا، اور ایشیا بھر میں واحد خادم اسلام امیر اسمٰعیل تھا،

مجاہدین اسلام کو امیر اسمٰعیل ہی کے زیر علم اپنے جوش قلبی نکالنے اور اشاعت اسلام کی خدمات انجام دینے کے مواقع حاصل تھے، علماء دین اسلام اور فضلاء ملّت بیضا اسمٰعیل ہی کے زیر سایہ مذہبی اور علمی خدمات انجام دے رہے تھے، اسمٰعیل اپنی ذاتی شجاعت، دانشمندی، اور دینی خدمت سے اس دور کے مسلمانوں میں ہر دل عزیز بن گیا تھا۔

بمصداق ؎

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد

ہر کہ خود را دید او محروم شد

اور تاتار، افغانستان، خراسان پر قابض ہو گیا تھا۔ بایں ہمہ وہ خلفاء بغداد کا احترام کرتا تھا،

اسمٰعیل نے ۲۹۵ھ میں وفات پائی، احمد اس کا جانشین ہوا، اور اس خاندان میں نصر، نوح اور عبدالملک وغیرہ زبردست حکمران اور خادم ملت پیدا ہوئے!

عبدالملک نے ۳۵۰ھ میں چوگان بازی کرتے ہوئے گھوڑے سے گر کر جان، جان آفرین کے سپرد کی، اور اپنا جانشین اپنے خورد سال فرزند منصور کو چھوڑا،

منصور محض کم سن تھا، اس لئے بعض امراء تو اس کی تخت نشینی پسند کرتے تھے، لیکن بعض اس کے خلاف تھے، اور وہ عبدالملک کے بھائی (عم منصور) کو امیر منتخب کرنا چاہتے تھے،

عبدالملک نے "الپتگین" نامی ایک نوجوان کی تعلیم و تربیت بحیثیت (غلام) اعلیٰ پیمانہ پر کی تھی، جو سن شباب کو پہنچکر شجاع، مدبر اور عالی دماغ ثابت ہوا۔ آقا نے اس کی اعلیٰ خدمات اور اہلیت سے مسرور ہو کر اسے حکومت خراسان پر مامور کر دیا تھا،

یہ شرف صرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس کے غلام بھی ملکوں اور قوموں پر حکومت کرتے رہے ہیں، مسلمانوں کے سوا کوئی اور قوم یہ نظیر پیش کرنے سے معذور رہے، الحمد للہ۔

جب عبد الملک کی وفات پر اُس کی جانشینی کا مسئلہ رونما ہوا، تو اُس وقت الپتگین سے بھی استصواب کیا گیا، مگر وہ منصور کی امارت کے خلاف پایا گیا تاہم وہ راستی پر تھا۔ کیونکہ اسلام مجلس شوریٰ کا نظام اور جمہوریت کا حامی ہے۔ لیکن اُمرائے دربار نے اس کی رائے موصول ہونے سے پیشتر ہی منصور کی تخت نشینی کے مراسم ادا کر دئے تھے،

الپتگین نے منصور کے خلاف رائے دی تھی، لہٰذا منصور کا بر سر حکومت رونما ہو کر الپتگین کے درپے آزار ہو جانا کوئی امر عجیب نہ تھا، منصور نے اُسے دربار میں طلب کیا۔ لیکن وہ نہ آیا، اس لئے کہ مُعبّر خرد نے اس طلبی کے خواب کی تعبیر بجز مذلت طوق و زنجیر اور کچھ نہ بتائی، الپتگین بہ این وجوہ حکومت خُراسان سے دست بردار ہو کر اپنے وطن غزنی کو چل دیا، تین ہزار غلام خاصہ اس کے ہمرکاب تھے، لیکن اس کے درباری امراء اور باقی فوج نے اس کی رفاقت سے مُنہ موڑا، اور طوطا چشمی کی، الپتگین کے اس طرز عمل کے یہ معنی تھے، کہ اُس کے کندھے دربار بخارا کی ماتحتی کے بار سے ہلکے ہو گئے۔

الپتگین کا خروج

دربار بخارا نے تیس ہزار فوج غزنی بھیجی کہ الپتگین کو اس کے متمردانہ طرز عمل کی سزا دے لیکن الپتگین نے اس فوج کو یکے بعد دیگرے دو ہزیمتیں دیں، اور چند ہی روز بعد افغانستان میں ایک زبردست خودمختار حکومت کی بنا ڈالی جس کا صدر مقام غزنی بنایا

منصور نے پندرہ سال حکومت کرنے کے بعد ۳۶۵ھ میں وفات پائی اور اس کے ساتھ ہی گویا دولت سامانی کا آفتاب اقبال ڈھلنے لگا!

منصور کا جانشین اس کا فرزند الرضی نوح ہوا۔ لیکن اس کے آغاز عہد ہی میں اندرونی، اور بیرونی فتنے پیدا ہو گئے۔ امرائے بخارا کی طوطا چشمی مزید برآں، ان تمام باتوں کا مجموعی طور پر نتیجہ یہ نکلا، کہ بغرا خاں نامی ایک زبردست سردار (جو نسل افراسیاب کی یادگار تھا) بخارا پر قابض ہو گیا۔ لیکن خداوند تعالیٰ کی قدرت کہ وہ چند ہی روز بعد بستر علالت پر پڑ گیا، اور ترکستان کو واپس ہوتے ہوئے راستے ہی سے عدم آباد کو کوچ کر گیا اور نوح پھر سلطنت پر قابض ہو گیا۔ لیکن بخاری امراء نے فتنہ و فساد شروع کر دیا، اور اسے ناچار سبکتگین سے امداد طلب کرنی پڑی،

سبکتگین، الپتگین کا خویش تھا۔ الپتگین کی وفات پر اس کا فرزند ابو اسحاق اس کا جانشین ہوا، اور اس کی معزولی کے بعد سبکتگین (جو داماد ی)

بر سر حکومت رونما ہوا جس نے چند ہی روز میں اپنے حسن اخلاق، شجاعت، حمایت اسلام اور عام قابلیت سے اپنے آپ کو الپتگین کا جائز قائم مقام ثابت کر دیا۔

جب نوح نے اس سے استمداد طلب کی ہے، تو وہ اس وقت کافی نیک نامی اور ہر دلعزیزی حاصل کر چکا تھا۔ الپتگین نے نوح کے حریفوں کو شکستوں پر شکستیں دیں۔ بغیر خیال اپنے ذاتی مفاد کے جس کے صلہ میں اسے دربار بخارا سے محض رسمی خطاب و اسناد ملتے رہتے۔

بایں ہمہ شاہ بخارا حکومت نہ سنبھال سکا، لہٰذا اس نے حکومت خراسان بھی سبکتگین ہی کے سپرد کر دی۔ اس کے بعد سبکتگین اور اس کے با اقبال فرزند محمود نے امیر بخارا کے دشمنوں ابوعلی اور فائق کو شکست فاش دیکر خراسان سے خارج کر دیا۔

رجب ۳۸۷ھ میں نوح نے وفات پائی، اس کا فرزند الراضی منصور وارث حکومت ہوا۔ اس کے بعد امارت ابوالحرث کو پہنچی۔ جس نے خراسان کو غزنویوں کے قبضہ سے نکالنا چاہا۔ لیکن محمود نے اس کے گورنر کی فوج کو شکست دی، بایں ہمہ ابوالحرث کا آقائی احترام قائم رکھا، مگر چند روز بعد کوزنک امرائے بخارا نے ابوالحرث کو دولت بصارت سے محروم کر کے عبدالملک بن نوح کو تخت نشین کیا۔ یہی عبدالملک خاتم دولت سامانیہ ہے۔ محمود اسکی امداد کرتا رہا لیکن چند ہی روز میں دامان ملک کے پرزے اڑ گئے اور خراسان غزنویوں کے تحت تصرف میں آگیا۔

دولت سامانیہ کے اسباب زوال غیر معمولی اور جدید نہیں وہی افراط دولت جسکے ثمرات ہیں،

غیر معتدل عیش و عشرت، کاہلی، آرام طلبی، خانہ جنگی اور نااتفاقی، اور ان باتوں کے موجود ہوتے کسی قوی سے قوی سلطنت میں ضعف آجانا، حیرت انگیز امر نہیں اس لئے کہ یہی وہ امور ہیں، جن سے قوائے دماغی، مردانہ اوصاف، شجاعانہ جرأت اور سپاہیانہ روح فنا ہو جاتی، اور زنانہ صفات اُن کی جگہ لے لیتے ہیں۔ اس کلیہ کی صداقت کے مشاہدہ کے لئے ہمیں ماضی بعیدہ میں دوڑ لگانے کی ضرورت نہیں ہے، دورِ حاضرہ ہی اس کی شہادت دے سکیگا!

حکمرانان دولت سامانیہ نے سنہ ۲۷۹ھ سے سنہ ۳۸۶ھ تک حکومت کی، اس سلسلہ میں نو بادشاہ ہوئے جن کے نام شجرہ منسلکہ میں مندرج ہیں:-

بہرام چوبیں	۱- اسمٰعیل
نوسرو	۲- احمد
طغمات	۳- نصر
خداہ	۴- نوح اول
سامان	۵- عبدالملک اول
اسد	۶- منصور اول
احمد	۷- نوح ثانی
اسمٰعیل	۸- منصور ثانی
	۹- عبدالملک ثانی
	خاتم دولت

آغاز دولتِ غزنویہ

یہ لکھا جا چکا ہے۔ کہ سامانی خاندان ایک حد تک دولت عباسیہ کا قائم مقام تھا، پھر اس کی جانشین دولت غزنویہ ہوئی۔ اسلام اسی طریق پر ہر زمانہ میں ثبوت بہم پہنچاتا رہا کہ[۵۱]

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جان دیگر است

الپتگین ایک ترک کی غلام تھا اس نے امیر اسمٰعیل کے عہد میں کسطرح عروج حاصل کیا اسکی تفصیل اوپر گزاری یہی الپتگین دولت غزنویہ کا بانی ہے۔ اس نے سولہ یا بائیس سال حکومت کی، الپتگین کے بعد اس کا فرزند اسحاق اس کا جانشین اور وارث حکومت ہوا لیکن اپنی میں اہلیت حکومت نہ رکھتا تھا[۵۱]

ع میراث پدر خواہی علم پدر آموز

لہذا امرائے دربار نے الپتگین کے خویش سبکتگین کو ۳۶۷ھ میں تخت نشین کیا مورخ تاریخ ہند کا یہ بیان غلط فہمی پر مبنی ہے کہ اسحاق[۵۲] دو برس سلطنت کر کے مر گیا،[۵۳]

---

۵۱ نامۂ خسروان

۵۲ اردو تاریخ ہند مروجہ مدراس پنجاب

۵۳ تاریخ ہند میں اسحاق لکھا ہے لیکن صحیح ابو اسحاق ہے۔ اسحاق ابو اسحاق کا بیٹا ہوگا۔ ابو اسحاق کنیت ہے ابن سبکتگین کی ۔۔۔۔۔۔ تاہم ۔۔۔۔ ابو اسحاق کا اصلی نام کسی تاریخ میں نظر سے نہیں گذرا۔

تاریخ اسلام میں یہ کوئی جدید اور غیر معمولی واقعہ نہ تھا۔ اسلام مسئلہ توریث کا حامی نہیں، جمہوریت اور عام رائے اس کی روح رواں ہے، تاریخ اسلام کو غور سے پڑھو گے، تو معلوم ہوگا۔ کہ جس ملک اور جس زمانہ میں اسلامی نظام حکومت میں توریث و شخصیت کا دخل ہوا۔ فوراً انقلاب حکومت رونما ہوا۔ اور تو اور خلفاء راشدین کا زمانہ ایسے انقلاب سے خالی نہیں ہے۔ حضرت عثمان رضؓ خلیفہ سوم (خویش رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کی شہادت ایسے ہی شکوک کی بنا پر ہوئی، رعایا کا ایک فریق دعویٰ کرتا تھا۔ کہ خلیفہ اپنے رشتہ داروں کو اعلیٰ عہدوں پر ممتاز کر رہا ہے۔ اور اس کا طرز خلافت خلاف اصول جمہوریت اور خود مختارانہ ہے، ماضی قریب میں خلیعِ خلافت عبدالحمید خاں اسی قسم کا واقعہ تھا۔

جب یزید ولی عہد حکومت ہوا۔ تو مدینہ اور مکہ میں احکام پہنچے۔ کہ خطبہ میں اس کا نام شامل کیا جائے۔ اس امر کا اعلان ہوا، تو کہنے والے نے کہا کہ

ع

یہ نئی بات نہیں ہے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ

جانشیں کر گئے جب موت کا پہنچا پیغام

لیکن یہ سُنکر۔

دفعتاً مجمعِ حضّار سے بولا اک شخص

جھوٹ بکتا ہے تو یہ اے خلفِ نسلِ لیام

اپنے بیٹے کو بنایا تھا خلیفہ کس نے ؟

ہاں! مگر قیصر و کسریٰ کی ہی یہ سُنّتِ عام!

یہ طریقہ متوارث ہے تو کفار میں ہے

ورنہ اسلام ہے اک مجلسِ شوریٰ کا نظام

اس سے بھی قطع نظر، نسلِ عرب ہیں ہم لوگ

وہ کوئی اور ہیں ہوتے ہیں جو شاہوں کے غلام!
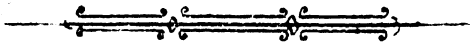
امیر ناصرالدین سبکتگین

امیر سبکتگین کے ابتدائی حالات نہایت دلچسپ ہیں۔ مصنف تاریخ بیہقی کا بیان ہے۔ کہ "میرے جدامجد فرماتے تھے۔ کہ جب میں جنگ ہرات سے فارغ ہوکر نیشاپور آیا، تو ایک روز امیر سبکتگین کی معیت میں معہ دیگر سرداروں کے ایک جانب روانہ ہوا۔ ہم لوگ جب اس مقام پر پہنچے جسے خاکستر کہتے ہیں، تو وہاں ایک روز مقام کیا، امیر نے غربا کو صدقہ دیا، پھر نماز کے وسر گھوڑا طلب کیا، اور چند سرداروں کے ساتھ ایک جانب جنگل میں گیا۔ یہ جنگل ناہموار تھا، اس میں جابجا نشیب و فراز اور ٹیلے تھے، امیر سبکتگین نے ایک پشتہ دیکھکر دفعتاً فرمایا "یافتم"! یہ کہتے کہتے وہ گھوڑے سے اُتر پڑا، اور غلاموں کو ایک خاص مقام پر زمین کھودنے کا حکم دیا، ان لوگوں نے تعمیل کی، غار میں سے کچھ مٹی نکلی، تو اس میں ایک آہنی میخ نمودار ہوئی، یہ بالکل اسی طرح کی تھی، جیسی کہ اصطبل میں استعمال کی جاتی ہیں، یہ دیکھکر امیر نے درگاہ ایزدی میں سجدۂ شکر کیا، بہت رویا، پھر نماز کے لئے مصلا طلب کیا، غلاموں کو آہنی میخ باہر نکالنے کا حکم دیا، اب امیر بیٹھ گیا۔ مگر پھر کھڑا ہوگیا،

یہ حالات ایسے نہ تھے۔ کہ ہم خاموش کھڑے دیکھتے، ایک نے آگے بڑھکر امیر سے اس کی وجہ دریافت کی،

امیر سبکتگین کا بیان

"امیر نے کہا، کہ یہ ایک عجیب واقعہ ہے۔ گوش دل سے سُنو۔ یہ میرے ابتدائی حالات سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ واقعہ میرے امیر الپتگین کے پاس آنے سے بہت مدت پہلے کا ہے۔ جب میں ایک غلام کی حیثیت سے اپنے آقا کے قبضہ میں تھا۔ تو میں نے اس کے ساتھ دریائے جیحوں کو عبور کیا، میرے آقا کے ساتھ سترہ غلام اور تھے، ہم سب شبرغاں پہنچے اور وہاں سے کنرکاناں میں میرے رفیق کنرکاناں کے روبرو پیش کئے گئے۔ اس نے سات غلام میرے علاوہ انتخاب کر کے خرید لے مجھے اور میرے چھ اور رفیقوں کو پسند نہ کیا۔ اب ہمارا آقا نیشاپور پہنچا، یہاں اس کے چار غلام فروخت ہو گئے، میں ناپسند کیا گیا، اب ایک میں رہ گیا، اور دو میرے رفیق، میرا آقا مجھے سبکتگین دراز کہا کرتا تھا، اتفاقاً میرے آقا کے تین گھوڑوں کی پشت میری سواری سے مجروح ہو چکی تھی، جب میں خاکستر پہنچا، تو ایک اور گھوڑا میری سواری سے مجروح ہوا، اب تو آقا نے میری خوب ہی تواضع کی، سواری کی بجائے زین میری گردن پر رکھا، آقا نے قسم کھائی کہ اب مجھے نیشاپور تک پیدل ہی لے جائے گا، چنانچہ اس نے یہی کیا، اس رات

میں نہایت اندوہناک اور دل گرفتہ تھا، دل میں کہتا تھا کہ عجب قسمت پائی ہے، کہ مجھے گویا غلامی کے قابل بھی کوئی سمجھکر نہیں خریدتا، انہیں غمگین خیالات میں سوگیا، اسی رات میں نے خواجہ خضر کو خواب میں دیکھا، آپ نے مجھ سے فرمایا، کہ آخر اس قدر غمگین کیوں ہو، میں نے اپنی بدقسمتی کا حال بیان کیا۔ کہ مجھے کوئی غلام کی قیمت میں بھی نہیں خریدتا، حضرت نے میری تسلی کی، اور فرمایا غم نہ کھاؤ، تم دنیا میں مشہور اور بڑے آدمی بنوگے، اور جب دوبارہ اسی نواح سے گزروگے، تو سردار کی حیثیت میں بہت سے لوگ تمہارے ماتحت تمہارے ہمراہ ہوں گے، لیکن یاد رکھو۔ کہ جب تم رُتبۂ اعلیٰ پر پہنچو، تو بندگان خدا کے ساتھ سلوک ہونا، عدل پروری کو کام فرمانا، تاکہ اقبال وعمر میں ترقی ہو، اور اولاد بھی اس میں حصہ پائے۔

یہ شنکر میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن انھوں نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں لے کر کہا، کہ مجھ سے ان باتوں کا عہد کرو، میں نے حکم کی تعمیل کی حضرت نے میرا ہاتھ ایسے زور سے دبایا۔ کہ درد ہونے لگا، اسی اثناء میں میری آنکھ کھل گئی، درد اب بھی موجود تھا، رات آدہی گزری تھی، میں نے اُٹھکر غسل کیا، نماز پڑہی، پچاس رکعت کے بعد درگاہ الٰہی میں دعا مانگی۔ گریہ وزاری کرتا رہا۔ اب جو میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں، تو پہلے سے کئی گنا زیادہ طاقت موجود تھی، پس میں نے یہ مسخ جواب زمین سے برآمد ہوئی)

اٹھائی اور جنگل میں جاکر بطور نشان کے گاڑ دی۔ وہ تمام کی تمام زمین میں دھنس گئی،

صبح کو آقا نے میخ طلب کی، میں کہاں سے دیتا، آقا نے میری پشت پر تازیانے لگائے، اور قسم کھائی۔ کہ مجھے ارزاں سے ارزاں قیمت پر فروخت کر دیگا، میں آقا کے ساتھ دو منزلیں طے کرتا ہوا نیشاپور پہنچا،

اس وقت امیر الپتگین دولت سامانیہ میں شامل اور سپہ سالاری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز المرام اور نیشاپور میں قیام پذیر تھا،

"میرے آقا نے آخر کار مجھے اور میرے باقی دو رفیقوں کو امیر الپتگین کے ہاتھ فروخت کر دیا، اس کے بعد کی داستان طویل ہے۔ کہ میں کس طرح اس رتبہ پر پہنچا"

سبکتگین، بایں ہمہ عالی نسب اور والا حسب تھا یعنی اس کا سلسلۂ نسب شاہ یزدجرد، خاتم سلطنت ایران سے ملتا ہے، چنانچہ ہمارا دوست لیتھبرج تاریخ ہند کے صفحہ ۶۸ پر لکھتا ہے۔ کہ سبکتگین اصل میں یزدجرد شاہ فارس کی نسل سے تھا، مگر زمانہ کی گردش نے تباہ و خستہ ہو کر ایک سوداگر کے ہاتھ پڑا، اور وہ اُسے بخارا لے آیا۔ یہاں الپتگین نے اسے ہونہار دیکھکر خرید لیا، اور اس کی عقل و دانائی کے سبب ترقی دیتے دیتے اُسے سپہ سالاری کے عُہدہ تک پہنچا دیا،

امیر ناصر الدین سبکتگین
دولت غزنویہ

مگر اس کے باوجود دوسرا انگریز مورخ مسٹر طامسن جس کی انگریزی تاریخ ہند مدارس پنجاب کے نصاب تعلیم میں شامل ہے) سبکتگین کو ترکی غلام بتاتا ہے۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ!

سبکتگین کا شجرۂ نسب حسب ذیل ہے۔

سبکتگین بن جوقان، بن قراء الحکم، بن قزل ارسلان، بن قرانامال، بن فیروز بن یزدجرد بن شہریار، بن خسرو، بن پرویز بن ہرمز، بن نوشیروان!

سبکتگین اپنے حسن لیاقت، شجاعانہ جوشش اور اعلیٰ سیرت کی بدولت حالت غلامی سے ترقی کرتے کرتے مسند امارت پر جا بیٹھا، چند روز کے بعد اس کے مربی الپتگین نے اپنی دختر اس کے حبالۂ ازدواج میں دے دی، اور وہ ان اسباب سے دربار غزنی میں ممتاز نظر آنے لگا حتیٰ کہ الپتگین کی وفات کے بعد اس کے جانشین فرزند ابواسحٰق کی ناقابلیت کی وجہ سے وہ سریر آرائے حکومت ہوا، یہ واقعہ ۳۶۷ھ مطابق ۹۷۶ء کا ہے،

قدیم کتب تواریخ میں الپتگین کے اس زمانہ کا ایک واقعہ مذکور ہے جب فوج میں ایک معمولی سوار کی حیثیت سے ملازم تھا، لیتھبرج صاحب اس واقعہ کو بہ الفاظ ذیل نقل کرتے ہیں۔ مگر اسے واقعہ نہیں، بلکہ دلکش داستان کہتے ہیں!

"جب سبکتگین اعلیٰ درجہ کے سواروں کے زمرے میں ملازم تھا۔
تو ایک دن جنگل میں شکار کھیلنے گیا" وہاں کہیں ایک ہرنی اپنے بچے کے ساتھ چرتی ہوئی نظر آئی، اس کے جی میں آیا، کہ کسی طرح اس بچے کو پکڑ لے

"اس خیال سے گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس کی طرف جھپٹا، اور آخر کار پکڑ کر فتراک سے باندھ لیا، اور گھر کی راہ لی، جب تھوڑی دور نکل آیا تو دیکھتا کیا ہے، کہ اس بچہ کی ماں دردانگیز آواز سے روتی ہوئی پیچھے پیچھے چلی آتی ہے، ہرنی کا یہ حال دیکھکر سبکتگین کا دل بھر آیا، اور وہیں اس بچے کو چھوڑ دیا، یہ دیکھکر اس کی ماں کی جان میں جان آئی، اور خوشی خوشی بچے کو ساتھ لے کر چوکڑیاں بھرتی ہوئی جنگل کی طرف چلی گئی۔ مگر دور تک الٹی پھر پھر کر دیکھتی جاتی تھی۔ گویا زبان حال سے سبکتگین کی رحم دلی کا شکریہ ادا کرتی تھی،

"اسی رات سبکتگین کو خواب میں ایک فرشتہ نظر آیا، اور اس نے بشارت دی کہ تو نے جو آج اس جانور کو مصیبت اور درد میں مبتلا دیکھکر اس پر رحم کھایا تو یہ خدا ئے جل شانہٗ کو بہت پسند آیا، اس کے صلے میں تجھ کو غزنی کی سلطنت ملے گی، مگر دیکھ کہیں ایسا نہ ہو، کہ اس منصب عالی پر پہنچکر یہ تمام خوبیاں جاتی رہیں، اور جس قدر اب بے زبان جانوروں پر ترس کھاتا ہے، اس وقت

آدمیوں پر اس سے بھی کم رحم کرے"

یہ امر ہماری فہم سے خارج ہے، کہ مورخ ممدوح نے اس واقعہ کو دلکش داستان کے نام سے کیوں موسوم کیا، اس میں کونسی بات جدید یا عجیب ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اسے امر واقعہ تسلیم کرنے میں تامل کرتے ہیں سبکتگین کا ہرنی کے اضطراب سے متاثر ہونا، یا خواب میں بشارت سلطنت ملنا یہ ایسی باتیں نہیں، کہ جن کی تمثیل پیشتر کے زمانہ میں نہ مل سکے، بلکہ اس لٹریچر سے جسے، کہ کلام مقدس کا خطاب دیا گیا ہے، اور جس کی تردید کا ہمیں حق حاصل نہیں ہے، اس قسم کے واقعات کی تائید ہوتی ہے، پھر اس میں کوئی بات خلاف فطرت یا خلاف اصول بھی تو نہیں، کہ ایسے واقعہ کو نہ تسلیم کیا جائے!

علاوہ ازیں جب سبکتگین کی زندگی پر ابتدا سے نظر ڈالی جاتی ہے، تو صاف نظر آجاتا ہے۔ کہ وہ آغاز میں ایک غلام سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا، لیکن انجام کار اپنے حسن اخلاق کی بدولت صاحب نام و نگیں ہوا جس کی تفصیل تاریخ میں موجود ہے۔ اور آگے چل کر ہم بھی کسی قدر توضیح کے ساتھ معرض تحریر میں لائیں گے، پس ہم کوئی وجہ نہیں دیکھتے۔ کہ اس واقعہ کو تاریخی واقعہ کی اہمیت نہ دی جائے۔

سبکتگین نے صاحب حکومت ہو کر دانشمندی، قابلیت اور ہمدردی سے حکومت شروع کی، معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس میں ذاتی شجاعت اور معاملہ فہمی

کے علاوہ انتظامی قابلیت بھی بدرجہ اتم موجود تھی، کہ چند ہی روز میں اپنے مقبوضہ علاقہ میں ہر قسم کا انتظام قائم کرکے فوجی قوت بھی معقول قائم کرلی اور اپنے حریفوں پر کافی رعب جمالیا۔

مذکور ہو چکا ہے۔ کہ الپتگین شاہ بخارا کا گورنر تھا، مگر بعدازاں اس نے اپنے کندھے شاہ بخارا کی ماتحتی سے نکال لئے، اب اس کا جانشین سبکتگین بھی خودمختار حکمران تھا، گو شاہ بخارا ان دونوں کو غاصب اور باغی سمجھتا تھا، تاہم اب وہ سبکتگین ہی سے طالب امداد ہوا، اور اسی کی مدد سے وہ بغراخاں (حاکم کاشغر) سے عہدہ برآ ہوسکا، شاہ بخارا نے سبکتگین کو امارت غزنی کی سند عطا کی۔

اس واقعہ سے بھی سبکتگین کی اعلیٰ اخلاقی حالت کا سراغ ملتا ہے، شاہ بخارا نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا وہ معرض تحریر میں آچکا ہے، لیکن بایں ہمہ جب اس سے امداد طلب کی گئی، تو اس نے شاہ بخارا کی استمداد محض مخلصانہ اور بے غرضانہ طریق پر کی، اور اس طرح قدیم حق نمک خواری ادا کیا، شاہ بخارا کا سند امارت یا خطابات عطا کرنا محض برائے نام تھا، اس لئے کہ سبکتگین ایک خودمختار حاکم تھا، تاہم اس نے ان عطایا کو ادب و احترام کے ساتھ قبول کیا۔

اب سبکتگین کا آفتاب اقبال نصف النہار پر چمکنے لگا، ادہر سلطنت بخارا کا

ستارہ افق گمنامی میں غروب ہونے لگا۔ ادہر افغانستان کے علاوہ خراسان اور تاتار کے کچھ حصہ پر بھی سبکتگین کا تصرف ہوگیا'

مسلمانوں کی نظریں اس کی جانب اٹھنے لگیں' مجاہدین اسلام اس کے زیر علم جمع ہونے لگے' کیونکہ بغداد اور بخارا اب ان کے پرسان حال نہ تھے ان میں اس قدر سکت ہی کہاں باقی تھی' اتفاق کہ تازہ اسباب واقعات نے سبکتگین کی توجہ ہندوستان کی جانب منعطف کردی' اور مجاہدین اسلام کو جوش قلبی نکالنے کے لئے ایک نیا میدان مل گیا'

قبل ازیں کہ ہم ان واقعات اور اسباب کو تلاش کریں جن کے سلسلے میں ہندوستان زمانہ مستقبل میں غزنویوں کا جولان گاہ بنا' یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ذیل میں اُن تعلقات کی تفصیل کردیں' جو غزنویوں سے پیشتر مسلمانوں (اعراب وغیرہ) اور اہل ہند کے درمیان رہے' اس سے یہ اندازہ کیا جاسکیگا کہ کیا ہندوستان بہ آسانی اسلام کے قدموں کے نیچے آگیا' کیا ہندوستان مسلمانوں کی حکومت سے مانوس اور اسکی قبولیت کے واسطے تیار تھا یا مخالفت پر تلا ہوا تھا' اور اہل ہند میں مسلمانوں کی مخالفت کا کوئی خاص جوش تھا؟ کیا مسلمانوں کی کامیابی کا سبب حکمرانان ہند کی باہمی رقابت ونا اتفاقی اور فوجی کمزوری تھا (جیسا کہ اکثر انگریز مؤرخین کا خیال ہے) یا کچھ اور اسباب تھے؟

ہمیں یہ بھی تلاش کرنا ہے۔ کہ اس زمانہ میں اہل ہند میں حکمرانہ اور فوجی قابلیت اور قومی وملی جوش کس درجہ تھا'

عربوں اور اہل ہند کا پہلا مصافحہ

(سابقہ اسلامی مہمات)

جنوبی ہند عربوں، اور ہندوؤں کی ملاقات ہندوستان میں قبل از ظہور اسلام ہی بہ سلسلۂ تجارت ہو چکی تھی، عرب تاجروں اور سواحل ہند کے سوداگروں کے درمیان نہایت قدیم زمانہ سے باہمی تعلق چلا آتا تھا، یعنی اس کا آغاز اسلام سے بہت پیشتر ہو چکا تھا،

البتہ بعد اسلام عرب کی قومی تنظیم نے ان تعلقات کو اور زیادہ مستحکم نیز باقاعدہ کر دیا، چنانچہ اب عرب تاجر مثل سابق نہ صرف رومی مال و اسباب عربی مصنوعات و پیداوار ہی ہندوستان لانے لگے، بلکہ ان کے ساتھ ہی اپنی سب سے بڑی دولت اور اپنی سب سے بڑی متاع اسلام بھی اپنے ہمراہ لانے لگے،

اور اب عرب، ہندوستان سے صرف متاع تلوار، خوشبو اور کپڑوں ہی کا ذخیرہ نہیں لے جانے لگے، بلکہ نومسلموں کی کچھ تعداد کو بھی،

ملابار، سندھ، گجرات، کچھ، کوکن، سواحل بنگال اور جزائر ہند کی اقوام

نے مسلمانوں کو فرشتۂ رحمت سمجھکر قبول کیا، عربی سفرناموں اور جغرافیوں میں ان مقامات کے نام اور حالات بکثرت موجود ہیں،

ملے بار اور اس کے اطراف میں ایک پرانی قوم "نائر" آباد تھی، جس سے تمام ہندو (خصوصًا برہمن) نفرت اور چھوت کرتے ہیں، اس قوم کی ایک ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے ہیں۔ ملے بار کے راجہ نے معجزہ شق القمر بچشم خود دیکھا، اور وہ حلقہ بگوش اسلام ہوا،

جب مسلم تاجر، ملے بار پہنچے، تو نائر قوم نے ان کی آمد کو اپنے حق میں گویا رحمت سمجھا، ان کے پاس آکر نوکر ہو گئے، ان سے تعلقات بڑھائے بعض نے عورتیں دے کر مسلمانوں سے رشتۂ اتحاد قائم کیا۔ بہت سے نائر مسلمان ہوئے، جن کو ادہر سے مساوی درجہ اور حقوق دئے گئے، حتیٰ کہ چند روز میں نومسلموں اور عربوں کے درمیان مطلق امتیاز باقی نہیں رہا اور اب ہندو بھی ان کی ویسی ہی عزت کرنے لگے، جیسی وہ مسلمانوں کی کرتے تھے، یہ حال دیکھکر بھی بہت سے نائر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے

نائر قوم کا حال آج بھی تقریبًا ایسا ہی ہے، اگر مذکورہ زمانہ کے بعد اُن اطراف میں پرتگیز دفعتًا بلائے بے درماں کی طرح نازل ہو جاتے، تو شاید تمام ملے باری مسلمان ہو جاتے، مگر پرتگیزوں نے یہاں آکر عربوں کی تجارت کا رستہ بذریعہ سمندر روک کر انہیں تباہ کر دیا، حتیٰ کہ ملے بار کے مسلمانوں کے

تعلقات عرب اور مصر تک سے منقطع ہو گئے۔

تاریخ [illegible]) میں مرقوم ہے۔ کہ ہندوستان کے مغربی ساحل کے بندرگاہوں میں مختلف ملکوں کے تاجر بکثرت آتے ہیں۔ اس وجہ سے یہاں نئے شہر آباد ہو گئے، جن کی آبادی مسلمانوں کی تجارت سے بڑھ گئی ہے، نیز مکانات بکثرت تعمیر ہو گئے ہیں، یہاں کے سردار اور راجہ مسلمانوں پر تشدد کرنے سے پرہیز کرتے ہیں، حالانکہ یہ سرداراوران کی سپاہ بت پرست ہے تاہم وہ مسلمانوں کے مذہب کا بہت کچھ پاس اور لحاظ کرتے ہیں، بت پرستوں اور مسلمانوں کے اس اتحاد کی، اس لئے اور بھی حیرت ہے، کہ مسلمان کل آبادی کا دسواں حصہ بھی نہیں ہیں۔ مالابار کے ہندو راجاؤں کا برتاؤ، مسلمانوں کے ساتھ بالعموم عزت اور مہربانی کا ہے جس کا سبب یہ ہے کہ ان کے ملک میں زیادہ شہروں کا آباد ہو جانا انہیں مسلم تاجروں کی بود وباش کا نتیجہ ہے"

اس شہادت سے یہ ثابت ہوا، کہ ہندو راجہ مسلم تاجروں کے کاروبار یا شعار دین میں بالکل مداخلت نہیں کرتا، بلکہ ان کی عزت کرتا تھا،

اس کی وجہ یہ بھی ہے، کہ اس وقت کا ہندوستان آج ایسا تنگدل یا متعصب نہیں تھا،

عرب جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں نے، ہندوستان کے جن حصوں کا

حال لکھا ہے، وہ وہی ہیں، جو عرب تاجروں کے بحری گزرگاہ تھے، وہ خلیج فارس کے بندرگاہوں سے (جن میں مشہور سیراف اور بصرہ ہیں) سندھ آئے، اور یہاں سے سمندر کے کنارے کنارے کوکن، اور گجرات (کاٹھیاواڑ) کے سواحل سے گزر کر مدراس کے سواحل پر جا پہنچتے تھے، اور پھر یہاں سے لنگر اٹھا کر مشرقی بنگال اور آسام عبور کر کے چین کی راہ لیتے تھے۔ درمیان میں مالدیپ، سیلون، جاوا، سماٹرا، سنگاپور، اور دوسرے جزائر کی طرف بھی نکل جاتے تھے،

تاریخ فرشتہ اور دعوت اسلام مصنفہ ڈاکٹر آرنلڈ سے بھی ان بیانات کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس مقام پر مسلمانوں کو ایک لمحہ یہ بھی غور کرلینا چاہئے، کہ ان کے بزرگوں کو دوسری قوموں کے مقابلہ میں تجارت کے اندر کیا رتبہ حاصل تھا، اور اُن کی کیا حالت ہے۔ حالانکہ تجارت سرمایہ دُنیا و آخرت ہے، کون نہیں جانتا کہ اس ذریعہ سے اشاعت اسلام وسیع پیمانہ پر کی گئی،

مؤرخ سواحل ہند پر، سندھ سے لے کر حدود چین تک متعدد ہندو راجاؤں اور سلطنتوں کے نام گناتے ہیں۔ مگر یہ نام کچھ تو ان قدیم سلطنتوں اور شہروں کے معدوم یا گمنام ہوجانے، کچھ عربی میں تلفظ بدل جانے، اور کچھ کاتبوں کی تحریف سے کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں، ان میں سے بعض کا تذکرہ

حوالۂ قلم ہے۔!

سلطنت بلہرا، جرز، طافن، کش بین، رہمی، مانڈاور موگا وغیرہم علاقہ جات کے نام آتے ہیں۔

ہندوستان کے مستشرق مورخین، ایلیسٹ، ٹاڈ، رینا ڈ، غرہم نے ان کی اصل نکالنے میں سخت کاوش کی ہے، چنانچہ اُن کی تحقیقات کا نتیجہ حسب ذیل ہے:۔

بلہرا کی اصل بلبھہ راسئے ہے، جو اس وقت مالوہ کا راجہ تھا، عرب اُس کو شاہ کا لقب دیتے ہیں،

جُرز، گجر یعنی گجرات کاٹھیاوار ہے!

طافن کی نسبت ان خصوصیات کی بناپر جو عربوں نے بیان کئے، رینا ڈ کی رائے ہے، کہ وہ اورنگ آباد دکن ہے، لیکن وہ طافن کا حل نہیں کرسکا، مولوی سید محمد سلیمان ندوی (مدیر معارف) کی رائے ہے، کہ یہ لفظ دراصل طاقن (ق،ف) کے ساتھ ہے۔ چنانچہ رینا ڈکو اس کا املا طاکن بھی ملا ہے، اور طاقن، طاکن، داکھن، دکن یا دکھن کی خرابی ہے،

کش بین، کچھ بھوج ہے (عربی میں چ شین سے بدل جاتی ہے) یہ ٹاڈ کا قول ہے، مگر رینا ڈ اس کے خلاف اسی نام کو میسور کا مترادف قرار دیتا ہے،

راجہ بلہرا کی حکومت کا مرکز مانکیر دیا مانگیر) تھا جو مونگیر سے بالکل مشابہ

ہے، اس میں علاقہ کم کم (کوکن) بھی شامل ہے،

سب سے پہلا عرب سیّاح

(جس کا سفرنامہ دست برد زمانہ سے محفوظ ہے) وہ عراقی تاجر سلیمان سیرافی ہے، یہ سفرنامہ تیسری صدی ہجری (آٹھویں صدی مسیحی) میں لکھا گیا، اور ۱۸۴۵ء میں اسے ریناڈ نے مع فرانسیسی ترجمہ اور حواشی سلسلہ التواریخ کے نام سے شائع کیا۔

سلیمان مذکورہ بالا رستوں سے گزرتا تھا، اس کا بیان ہے، کہ:۔

" ہندوستان نیز چین والے بلا اختلاف، یہ یقین رکھتے ہیں، کہ دُنیا میں چار بادشاہ سب سے بڑے ہیں، وہ سب سے بڑا شاہ عرب (خلیفہ بغداد) کو سمجھتے ہیں، کہ وہ سب سے زیادہ دولت مند، صاحب جلال و جبروت اور سب سے بڑے مذہب کا بادشاہ ہے، جس سے بڑی کوئی چیز نہیں،

" اس کے بعد خاقان چین، بعدازیں قیصر روم، اور پھر راجہ بلہرا جو کانوں میں سوراخ شدہ آدمیوں کا بادشاہ ہے!

راجہ بلہرا، تمام ہندو راجاؤں سے زیادہ معزز ہے، اور گو ہندوستان کا ہر راجہ اپنی سلطنت میں مستقل ہے، مگر اس کی عظمت سب تسلیم کرتے ہیں بلہرا کے راجاؤں کی عمریں دراز ہوتی ہیں،

یہاں کی رعایا کا یہ عقیدہ ہے، کہ ہمارے راجاؤں کی عمریں اس لئے

بڑی ہوتی ہیں، کہ وہ (عربوں) مسلمانوں سے محبت رکھتے ہیں، تمام راجاؤں میں راجہ بلہرا سے زیادہ عربوں (مسلمانوں) سے زیادہ محبت رکھنے والا کوئی دوسرا راجہ نہیں، اور ان سے اسی طرح سے اس کی رعایا بھی محبت کرتی ہے۔ سلیمان یہ بھی کہتا ہے، کہ

چین والے داڑھی نہیں رکھتے، اور وہ فطرتاً بھی اس سے محروم ہیں لیکن ہندوؤں کی داڑھیاں دراز ہوتی ہیں، وہ لبیں کبھی نہیں ترشواتے،

چین اور ہندوستان کے لوگوں کا عقیدہ ہے۔ کہ بدھ کے بُت ان سے باتیں کرتے ہیں، حالانکہ باتیں ان کے پجاری کرتے ہیں، دونوں ملکوں کے لوگ جانور قتل کرکے کھاتے ہیں، چین میں مذہب ہندوستان سے آیا ہے، دونوں ملک تناسخ کے قائل ہیں اور مجھے جہاں تک علم ہے چین یا ہندوستان میں مسلمان یا عربی بولنے والا، ایک بھی متنفس نہیں ہے،

سلیمان کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کی سیاحت کے وقت ہندوستان میں برہمنی مذہب نہیں بلکہ بدھ مت تھا، دکن اور کوکن کے غلاموں میں عرب تاجروں کی نوآبادیاں تھیں، مگر یہاں کا کوئی باشندہ حلقۂ اسلام میں داخل نہیں ہوا تھا،

عربی تاجروں، اور سیاحوں نے دیب جات (جزائر سراندیپ، سنگلدیپ اور مال دیپ کا ذکر بار بار کیا ہے) سراندیپ (سیلون) میں ان کے عقیدہ کے

مطابق، حضرت آدمؑ اور حوّاؑ کے نقش قدم ہیں، اِدھر سے گزرنے والے ان کی زیارت کو ضرور جاتے تھے

سلیمان تاجر نے تو ان جزائر کے ذکر میں کسی مسلم آبادی کا ذکر نہیں کیا مگر اس کے بعد ابوزید سیرافی نے اس امر کا تذکرہ کیا ہے، اس تاجر نے غالباً تیسری صدی ہجری کے وسط میں سلیمانی سفرنامہ کا تتمہ لکھا۔ اس کا بیان ہے۔ کہ عرب، تامیر، سراندیپ میں برابر آباد ہورہے ہیں، تیسری صدی ہجری کے اختتام اور چوتھی صدی کے آغاز میں ایک ایرانی مسلمان جہاز ران بزرگ بن شہریار نے سالہا سال کے بحری سفروں کے بعد اپنے چشم دید، نیز دیگر جہاز رانوں سے سُنے ہوئے حالات قلمبند کیئے، اور اس کتاب کا نام عجائب الہند رکھا، یہ کتاب مطبع بریل لیڈن نے چھاپ دی ہے،

کتاب بزرگ میں جا بجا اسلامی آبادیوں کا تذکرہ ہے، ایک نومسلم (ہندو) جہازران کا حال ہے، جس نے جہاز رانی کی بدولت کافی دولت حاصل کی تھی۔ اس نے سعادت حج بھی حاصل کی تھی

اس زمانے میں زیمور (ملیبار) اور کالی کٹ کے راجا کے ملک میں مسلمانوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہوگئی تھی کہ ان کے لئے ایک ہنرمند (مسلم قاضی) منتخب کیا جاتا تھا!

جزیرہ جاوا میں بھی مسلم تاجر موجود تھے۔ اور یہ لوگ راجہ کے درباری

آداب ورسوم سے متنفر تھے!

سنگاپور کے راجہ کے دربار میں بھی مسلمان موجود تھے، اسی طرح سے نواح بمبئی میں بھی ان کا سراغ ملتا ہے، سیاح مذکور کا بیان ہے۔ کہ مانگیر کے علاقہ میں ایک شخص نے ایسا درخت دیکھا۔ جس کے پتوں پر کلمہ طیبہ تحریر تھا، ایک مسلمان نے انڈمان کے جزیرہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے روضہ اقدس کی زیارت کی

سب سے پہلے سراندیپ نور اسلام سے منور ہوا، یہاں کے باشندے بودھ مت کے پیرو تھے، بزرگ بن شہریار کا بیان ہے۔ کہ ہندوستان کے پجاریوں، عابدوں، زاہدوں، جوگیوں اور بھکشوں کی بہت سی اقسام ہیں، ان میں سے ایک بیکور (بکوڑا) ہیں، یہ مسلمانوں سے بہت محبت کرتے ہیں، اور ان کا ہماری طرف بہت میلان ہے،

عجائب الہند میں لکھا ہے۔ کہ جب سراندیپ والوں کو آنحضرت کی بعثت کا حال (غالباً عرب تجار کی زبانی) معلوم ہوا، تو انھوں نے ایک قابل آدمی کو تحقیقات کے لئے بھیجا، یہ خلیفہ عمرؓ کا زمانہ تھا، آپ نے اسے اسلام اور رسولؐ اسلام کے حالات سے آگاہ کیا، وہ شخص واپس ہوا، مگر جب مکران (قریب بلوچستان) پہنچا، تو اسے فرشتۂ اجل نے آلیا!

اس سفیر کا غلام واپس سراندیپ پہنچا، اور اس نے اپنے اہل وطن کو اسلام اور مسلمانوں کے حالات بتاتے، اس نے اس سلسلہ میں یہ بھی کہا کہ وہ لوگ پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے، مسجدوں میں سوتے، اور خاکسارانہ زندگی بسر کرتے ہیں،

بزرگ بن شہریار کہتا ہے، کہ اب جو یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ تواضع اور محبت سے پیش آتے، اور ان کی طرف میلان خاطر رکھتے ہیں، وہ اسی سبب سے ہے،

سراندیپ کے بیکور (بکوٹوا) گرمی میں ننگے رہتے، صرف لنگوٹی باندھتے اور جاڑوں میں چٹائی اوڑھتے تھے ایک دوسرا فرقہ رنگ برنگ کے پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتا، بدن پر مُردوں کی خاکستر ملتا، سر اور داڑھی منڈاتا، اور گلے میں مردے کی کھوپڑی لٹکاتا تھا، نیز تواضع اور انکسار کے خیال سے اسی میں کھاتا پیتا تھا،

اس بیان سے بدھ مت اور اسلام کی مماثلت ظاہر ہے،

اب وہ زمانہ آگیا تھا، کہ عرب تاجروں کے ساتھ درویشوں کی کوششیں بھی شامل ہوگئی تھیں، چنانچہ ان کی مساعی جمیلہ سے سراندیپ کے بعد ملے بار کے علاقہ میں آفتاب اسلام چمکا!

دوسری صدی ہجری میں ملے بار میں ہر مذہب و ملت کے سوداگروں

کا گزر تھا، اسی وقت چند مسلمان فقرا بھی پھرتے پھراتے یہاں آ نکلے، شہر کدا کا نور، دگراں کا نور میں قیام کیا۔ وہاں کا راجہ سامری (زمیورن) ان بزرگوں کے فیض صحبت سے مستفید ہوا، مختلف مضامین کے علاوہ مذہبی گفتگو بھی درمیان میں آئی، درویشوں نے اپنا مذہب اسلام بتایا،

راجہ بولا، کہ ہمیں اپنے ملک کے سیاح یہود، ونصاریٰ نیز ہندوؤں کی زبانی معلوم ہوا ہے، کہ اسلام عرب، عجم، اور ترکستان میں خوب پھیلا ہے مگر یہ لوگ تمہارے مذہب کے مخالف ہیں۔ اس لئے ہمیں اسلام کے صحیح حالات معلوم نہیں ہو سکے،

درویشوں نے راجہ کو اسلام کے متعلق سب کچھ بتا دیا، اور وہ کلمہ طیبہ پڑھکر مسلمان ہو گیا، تاہم اس نے اپنا مذہب مخفی رکھا، اور ان درویشوں کو بھی رازداری کی تاکید کی، درویش حضرت آدمؑ وحواؑ کی قدم گاہ کو سرندیپ چلے گئے۔ مگر راجہ نے ان سے درخواست کی، وہ واپس اسی رستے سے آئیں۔

لکھا ہے، کہ جب وہ درویش واپس آئے، تو راجہ نے ملکی انتظام اپنے وزرا کے سپرد کیا، اور خود مخفی طور پر ان بزرگوں کے ساتھ جانب عرب روانہ ہو گیا!

راجہ زیمورن نے عرب ہی میں وفات پائی، اور آخری وقت مسلمانوں کو حسب ذیل وصیت کی:-

"آپ لوگ بہ سلسلۂ تجارت ملے بار میں آمد و رفت جاری رکھیئے، وہاں قیام کیجیئے، مکانات بنائیے، اور اشاعت اسلام کیجیئے"

علاوہ ازیں راجہ نے ایک خط اپنی زبان میں لکھا، اُسے لفافہ میں بند کرکے مُہر لگائی، اور اُسے ملے بار کے ارباب حکومت کے پاس بھیجا، یہاں کی حکومت مسلمانوں کے ساتھ بہ عطوفت پیش آئی، اور اشاعت اسلام کا حکم دیا اول کرنگلوار کرانگانور) میں مسجد تعمیر ہوئی، پھر کولم میں، اور اس کے بعد ہوبائی سوار دی گندار بیدہ چالیٹ (کالی کٹ) باکنو، منگلور، اور کالبخر کوٹ میں مسجدیں تعمیر ہوئیں، اور مسلمان اس ملک میں بہ اعزاز تمام رہنے، سہنے، اور کاروبار کرنے لگے،

تیسری صدی کے آخر، اور چوتھی صدی کے آغاز میں مشہور مؤرخ و سیاح ہندوستان آیا وہ سلیمان کے بیان کی تائید کرتا، اور کہتا ہے کہ سندھ اور ہند کے تمام راجاؤں میں راجہ بلہرا کے راج میں مسلمانوں کی عزت بہت زیادہ ہے، یہاں اسلام محفوظ اور معزز ہے، یہاں جابجا مسجدیں، اور جامع مسجدیں موجود ہیں، یہاں کے بادشاہ چالیس بلکہ پچاس سال تک حکومت کرتے ہیں، یہاں کے لوگوں کا اعتقاد ہے، کہ ہمارے راجاؤں کی عمریں عدل اور مسلمانوں کی عزت کرنے کی وجہ سے زیادہ ہوتی ہیں، ویسی ہی عزت دکن میں مسلمانوں کی ہے۔ یہاں کے راجا صلح پسند ہیں، ہگر (گجرات) کاٹھیاواڑ

کا راجہ مسلمانوں سے اب تک وہی نفرت رکھتا ہے"

مسعودی ۳۰۴ھ میں زمیورس کے ملک میں آیا، "اس وقت یہاں مسلمانوں کی آبادی دس ہزار سے کم نہ تھی (اس میں نومسلم بھی شامل ہیں) بہت سے مسلمان عمان، سیراف، البصرہ، بغداد اور دیگر شہروں سے آکر یہاں مستقلاً آباد ہو گئے تھے، اور انھوں نے شادیاں بھی یہیں کی تھیں، ان میں بعض ملک التجار تھے، چنانچہ موسیٰ بن اسحاق ایک بہت بڑے تاجر، اور ابوسعید معروف بن ذکریا ہنرمند یعنی امیر المسلمین تھے، یہاں کے لوگ مسلمانوں کو بلہر کہتے تھے

پانچویں صدی ہجری میں ابوسعید مغربی مراکش میں بیٹھکر فلکی جغرافیہ لکھتا، اور اس میں دنیا کو بتاتا ہے، کہ تھانہ (گجرات) میں مسلمان بھی آباد ہیں، نیز کھمبات اور کولم (مدراس) میں بھی ان کی آبادی ہے، یہاں ان کا ایک محلہ اور جامع مسجد ہے، ملے بار میں موپلا اور نوایت انہی عرب تاجروں کی یادگار نسل ہیں"

یہ یاد رہے، کہ گو حملہ آور مسلمان اس وقت پنجاب میں داخل ہو گئے تھے، لیکن ہندوستان کے باقی حصص بالکل محفوظ تھے،

جب عرب مسلمان جنوبی ہند میں آئے، تو اس وقت یہاں ویدک دھرم و برہمن مذہب کو زوال ہو چکا، اور ہر طرف بدھ مذہب پھیلا ہوا تھا مسلمان بہرحال ملے بار، سیلون، گجرات (کاٹھیاواڑ) اور کوکن میں پھیل گئے، اور

ان کی تعداد روزافزوں بڑھنے لگی،

یہ یاد رہے، کہ اس وقت بدھ مت، ترکستان سے کابل تک، اور پنجاب و کشمیر سے سندھ تک پھیلا ہوا تھا، گجرات اور ساحلی علاقوں میں جین مت اور ملے بار اور مدراس کے نواح میں ہندوستان کے قدیم باشندے تھے، جن کے مذہب کو نہ بدھ مت سے علاقہ تھا اور نہ برہمن مذہب سے، یہ وہی لوگ تھے، جنہیں درۂ خیبر سے آنے والے مغرور برہمنوں نے ہندوستان سے نکال دیا تھا یا وہ خود ان سے بھاگ کر دور دراز علاقوں میں چلے گئے تھے

مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہے، کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر یہاں کی تجارت کو فروغ دیا، اور کیا ہندو راجہ اور کیا رعایا ان کے ساتھ عزت سے پیش آتی رہی، مسلمانوں نے جنوبی ہند میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں، یہاں کی نومسلم عورتوں سے شادیاں کیں، اسی ملک کو اپنا وطن بنایا، نومسلموں کو جو عموماً ادنیٰ درجہ کے لوگ تھے، اعلیٰ رتبہ دیا، اپنے اخلاق، حسن سلوک اور روحانی کشش سے لوگوں کے دلوں کو اپنی محبت کی زنجیروں میں جکڑ لیا، بقول مولوی سید محمد سلیمان ندوی:-

"اس تصویر میں خون کی سرخی کہیں نہیں جھلکتی"

مہمّاتِ سندھ

ہندوستان میں اسلام، اور مسلمانوں کے داخلہ کا دوسرا رستہ سندھ ہے، پہلی صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) میں شمالی ہند پر چار سلطنتیں محیط تھیں،

ایک سلطنت سندھ جس کی ایک حد سمندر تھی، دوسری بلوچستان تیسری پنجاب کے اندر ملتان کی حد تک، اور چوتھی موجودہ صوبہ متحدہ کے کناروں تک، ملتان کے بعد پنجاب کا جو علاقہ رہ جاتا ہے، عربوں نے اس کا نام چھوٹا کشمیر رکھا ہے۔ اور اس کے بعد موجودہ بڑے کشمیر کا نمبر ہے، اُدھر موجودہ صوبہ متحدہ میں قنوج (ادورا) کی سلطنت شروع ہوجاتی تھی،

اس حد بندی سے ہماری غرض یہ واضح کرنا ہے، کہ اس زمانہ کا سندھ موجودہ سندھ سے بہت زیادہ وسیع تھا، چنانچہ بقول عرب جغرافیہ نویسان و سیاحان قدیم سندھ کے حدود اربعہ حسب ذیل ہیں

اس کی ایک جانب سمندر، دوسری طرف بلوچستان تیسری جانب کشمیر، اور چوتھی طرف سندھ بہ مدت دراز تک شاہان ایران کا باجگزار رہا مسلمان ادھر پہلی صدی ہجری کے آخر (آغاز آٹھویں صدی عیسوی) میں آئے، اس وقت

یہاں برہمنی مذہب نہیں، بلکہ بدھ مذہب پھیلا ہوا تھا، چینی سیاحوں کے تذکرے، ابن خردازیہ کا بیان، نیز عرب مصنفین کے ضمنی اشارات اور تلمیحات بھی اس کی تائید کرتی ہیں!

سندھی اقوام میں سب سے پہلے جاٹ (زط) قوم نے اسلام قبول کیا اور صحابۂ کرام کے زمانہ میں ان میں سے بہت سے عراق عرب جاکر آباد ہوگئے، جاٹ؛ شاہ ایران یزدجرد کی فوج میں ملازم تھے، پس جب تمام ایرانیوں اور مسلمانوں کا مقابلہ ہوا، تو انہیں مسلمانوں کے حالات کے مطالعہ کا موقعہ ملا ہوگا،

سندھ کے راجاؤں اور ایران کے بادشاہوں میں اکثر مقابلہ ہوتا رہتا اور وہ ایک دوسرے پر لشکر کشی کرتے رہتے تھے، اکثر ایسا ہوتا تھا، کہ ایرانی سندھ فتح کر کے اپنا صوبہ بنا لیتے تھے۔ اور کبھی بلوچستان اور ان کے علاقے بھی سندھ میں شامل ہو جاتے تھے، اس تعلق سے سندھ کی بہت سی قومیں ایرانی فوج میں بھرتی ہوگئی تھیں،

حضرت ابو موسیٰ اشعری عربی افواج لے کر ایران آئے، اور یزدگرد کی سپاہ سے نبرد آزما ہوئے، اور انہیں غیر معمولی کامیابی ہوئی، یہ دیکھ کر سندھ کے اسواری قوم کے ایک سردار نے (جس کا نام کالا تھا، اور جو ایرانی فوج میں اپنی خدمات انجام دے رہا تھا) ان کو پیغام بھیجا، کہ ہم لوگ بھی آپ کے مذہب

میں داخل ہونا چاہتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ہم آپ کے دشمن ایرانیوں سے تو جنگ کریں گے۔ لیکن اگر آپ لوگوں میں باہم جنگ ہو، تو غیر جانبدار رہیں گے اور اگر عرب ہم سے لڑیں، تو ہماری حفاظت آپ کے ذمہ ہوگی، نیز ہم اپنے قیام اور دیگر قبائل سے اتحاد کرنے میں خود مختار ہوں گے، اور ہمارے وظائف اعلیٰ درجہ کے ہوں گے،

سپہ سالار اسلام نے جواب دیا، کہ آپ کے حقوق ہم مسلمانوں کے برابر ہوں گے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، وہ لوگ اس پر رضامند نہیں ہوئے مگر خلیفہ حضرت عمرؓ نے ان کی سب شرائط منظور کرلیں، اور یہ سب کے سب مسلمان ہو گئے،

ان لوگوں کے ساتھ سندھ کی دیگر اقوام سیاہ بچہ (کالے) اور جاٹ بھی آ گئے، بہت لوگ عراق عرب میں آکر عرب قبائل کے ساتھ آباد ہو گئے، یہ سندھی قوموں میں اسلام کا پہلا داخلہ تھا، اس کے بعد اس قبیلہ کے اور اشخاص (جو سواحل پر مویشی چراتے تھے) بھی اسلام لے آئے، اور آگے چل کر نہایت مفید اور مخلص ثابت ہوئے، انھوں نے اسلامی افواج میں غیر معمولی اعتماد اور درجہ حاصل کیا،

مسلمانوں کی آمد سے کچھ پہلے سندھ کے برہمن راجہ چچ نے بلوچستان اور مکران پر متواتر حملے کئے، یہ راجہ بڑا صاحب ہمت تھا، بعد ظہور اسلام مسلمانوں

کی طرف سے مکران وغیرہ میں جو فوج متعین کی گئی، ان میں سے ایک عرب سردار محمد علافی نامی نے تمرد کھایا، گویا وہ اپنی قوم سے باغی ہوگیا، پانسو کی جمعیت اس کے ہمرکاب تھی، وہ راجہ تچ سے جا ملا، اور اس کے ہمرکاب ہوکر مسلمانوں سے مقابلہ کیا!

پھر جب آئندہ زمانہ میں عربی فوج بہ تعداد کثیر ادہر آئی، تو مذکورہ بالا راجہ کے بیٹے داہر نے اس کا مقابلہ کیا، اور محمد علافی اب بھی راجہ مذکور کا ہمرکاب رہا، اس کی تفصیل آئندہ آئے گی،

عرب مجاہدین نے اپنا رُخ ہندوستان کی طرف امیرالمومنین حضرت عثمانؓ (خلیفہ سوم) کے زمانے میں کیا، چنانچہ عبداللہ بن عامر الشیبانی مہمات پر مامور کئے گئے، انھوں نے عبداللہ بن عمرہ کو سیستان کا گورنر مقرر کیا، عبداللہ نے بلوچستان اور سندھ کا عزم کیا،

قبل ازیں جب مسلمان حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایرانیوں سے معرکہ آرا ہوئے، نوشاہ ایران نے اپنی مدد کے لئے والیٔ سندھ کو بلایا اور یہ پہلی موقعہ تھا، مسلمانوں اور سندھیوں کی آدیزش کا یہ معرکہ بمقام نہاوند (فارس) واقع ہوا، اس لئے معرکہ نہاوند کے نام سے موسوم ہے،

اسی طرح سندھ کا راجہ والی مکران کا حلیف بن کر مسلمانوں سے نبرد آزما ہوا تھا، یہ جنگ تاریخ میں معرکہ مکران کے نام سے مشہور ہے، علاوہ ازیں

ایک حادثہ اور زیادہ اہم واقع ہوا، اور اس طرح مسلمانوں نے سندھ پر باقاعدہ حملہ سنہ ۹۳ھ میں کیا، اس وقت عراق میں حجاج بن یوسف ثقفی گورنر تھا، اور اس کے ماتحت ایران میں اس کا ہفتاد سالہ بھتیجا محمد بن قاسم ثقفی والی تھا،

مذکور ہو چکا ہے، کہ عراق اور جزائر ہند کے درمیان عربی تجارت کا سلسلہ قائم تھا، اور ان کے جہاز اسباب تجارت لاتے اور لے جاتے تھے، جو سندھ کے ساحلوں سے گذرا کرتے تھے، یہاں خانہ بدوش قبائل آباد تھے، یہ بحری ڈاکے ڈالا کرتے تھے، مالدیپ میں بعض مسلمان تاجر مع اپنے خاندان کے مقیم تھے، سوء اتفاق سے ان میں سے بعض کا انتقال ہو گیا، تو مالدیپ کے راجہ نے مناسب سمجھا، کہ ان کے عیال و اطفال، عراق، عرب بھیج دیئے جائیں چنانچہ ان سب کو ایک جہاز میں سوار کرا کے روانہ کیا،

جب یہ جہاز سندھ کے ساحل پر پہنچا، تو اس علاقہ کے بحری ڈاکوؤں نے اسے لوٹ لیا، اور مسلم خواتین کو بے رحمی سے پکڑ کر لے گئے، ان بیچاریوں میں سے کسی معصوم کی زبان سے یہ درد انگیز آواز نکلی:- "اے حجاج مدد"!

جب جہاز کے بعض لٹے کھٹے مسافر عراق پہنچے، تو ان کی زبانی اس واقعہ کی اطلاع حجاج کو ہوئی، اس نے اسی وقت دیوانہ وار پکار کر کہا:-

"اے خاتونو! ٹھہرو میں آیا"

حجاج نے والئی سندھ کی توجہ اس واقعہ کی طرف منعطف کی، اور لکھا کہ ان مسلم خواتین کو یہاں بہ احترام تمام واپس بھیجدو، مگر راجہ نے یہ لکھکر ٹال دیا کہ وہ ڈاکو میرے قابو سے باہر ہیں، اس لئے مسلمانوں نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لیا، حجاج آمادۂ پیکار ہوگیا،

پس والئی مکران اور والئی سندھ کا مسلمانوں کے دشمنوں کے ہمرکاب ہوکر ان سے مقابلہ کرنا، بحری ڈاکوؤں کی شرارت سے اغماض کرنا وغیرہ اسباب ہیں، مسلمانوں کے سندھ پر حملہ آور ہونے کے' اور یہ قطعًا غلط ہے کہ یہ حملہ بے وجہ ہوا، یا یہ کہ مسلمان دیوانہ وار تلواریں سونت سونت کر ہندوستان کی سرحد پر اس لئے آکھڑے ہوئے، کہ اہل ہند کو بزور شمشیر مسلمان بناڈالیں،

مسٹر لیتھبرج تاریخ ہند میں لکھتے ہیں، کہ:۔

" اہل اسلام میں سے اول اول جس نے ہند پر حملہ کیا ابو العاص عامل یمن تھا، اس نے حضرت عمرؓ کے عہد میں ۱۵ھ مطابق ۶۳۶ء کے اندر بمبئی کے قریب مقام تھانہ پر فوج کشی کی اور لوٹ کا مال لے کر اٹھا چلا گیا "

الفنسٹن صاحب گوہر افشانی فرماتے ہیں۔ کہ:۔

" سمندر کی راہ سے سندھ پر عربوں کا آنا ابتدائی (زمانہ عمرؓی) میں ہوا" اس کے بعد گویا بحری حملہ پر شک کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں، کہ اگر

ایسا ہی ہُوا ہوگا، تو غالب یہ ہے، کہ سندھ کی حسین عورتوں کے لئے لٹیروں نے ارادہ کیا ہوگا، کیونکہ ملک عرب میں اس مُلک کی حسین عورتوں کی کمال آرزو تھی، حسین عورتوں کے لئے بحری حملہ کرنا، اور لوٹ مار کا مال لے کر واپس جانا، عربوں پر شرمناک الزامات ہیں، لیکن امر واقعہ یہ ہے، کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمانوں کا سندھ و ہند پر حملہ آور ہونا سراسر غلط اور بے سند ہے، اس لئے کہ پہلا حملہ درحقیقت خلیفہ سوم کے زمانہ میں ہُوا، جیسا کہ مذکور ہُوا،

اگر لیتھبرج صاحب اور الفنسٹن کا حملہ خلاف واقعہ ثابت ہو جائے تو یہ مصداق بنائے فاسد علی الفاسد"

مذکورہ بالا شرمناک الزاموں کی بھی کوئی حقیقت نہیں رہے گی، لہٰذا ہم اس امر کی کوشش کریں گے، خوش قسمتی سے مسلمانوں کی تاریخ موجود ہے، اور بقول لیتھبرج صاحب یہ تاریخ مفصل اور واضح پائی جاتی ہے کیونکہ مسلمانوں کو علم سیر و علم تاریخ کا ہمیشہ سے شوق رہا ہے، اور ہر عہد کے اندر ان میں کوئی نہ کوئی ایسا نکل آتا تھا، جو اپنے زمانہ کے واقعات قلمبند کر کے تاریخ کا سلسلہ قائم رکھتا تھا،

فاروقی عہد کا چھوٹے سے چھوٹا واقعہ صفحات تاریخ پر ثبت ہے، ہمیں یہ معلوم ہے، کہ اُس زمانہ میں کون کون سے ملک اسلام کے زیر سایہ آئے

آج دنیا کو خلافت فاروقی کی وسعت و حدود کا علم ہے، چنانچہ الفاروق مؤلفہ شبلی میں فتوحات فاروقی کا نقشہ دیا گیا ہے، اور قدیم و مستند تاریخ طبری میں تصریح کی گئی ہے، کہ جنوبی سمت میں فتوحات فاروقی کی عد مکران حصہ (بلوچستان) ہے، اسی تاریخ میں یہ بھی لکھا ہے، کہ اسلامی فوجیں اس وقت مکران سے آگے نہیں بڑھیں۔

یہ ظاہر ہے، کہ جب مسلمان مکران (بلوچستان) سے آگے نہ بڑھ سکے، تو سندھ پر حملہ کس طرح ہوا؟ جس کا ذکر انگریز مورخ کرتے ہیں، پس ان کا یہ بیان فرضی افسانہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور اسے واقعات سے کوئی تعلق نہیں! یہ معلوم ہو جانے کے بعد لوٹ مار اور حسین عورتوں کے لئے حملہ آور ہونے کی حقیقت طشت از بام ہو جاتی ہے!

(۲) انگریزی مؤرخین کا بیان باہم متضاد ہے، الفنسٹن صاحب نے تاریخ ہند میں ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے، کہ مسلمان زمانہ خلیفہ ولید (سنہ ۸۴ھ) میں پہلے پہل سندھ پر حملہ آور ہوئے۔

اس بیان سے عہد خلافت عمری کے حملہ سندھ کی تردید ہوتی ہے اس لئے کہ خلافت فاروقی کا زمانہ سنہ ۲۳ھ ہی میں ختم ہو جاتا ہے، اور انگریز مؤرخ سندھ پر مسلمانوں کا پہلا حملہ سنہ ۸۴ھ میں بیان کرتا ہے۔

(۳) مسلمان بہ زمانہ خلافت فاروقی ایرانیوں کے ساتھ ہنگامہ آرا تھے،

اور سندھ آنے کا رستہ اسی سمت سے تھا، جو رُکا ہوا تھا، لہٰذا وہ اس زمانہ میں سندھ تک کس طرح پہنچ سکتے تھے! مسلمان بعد فتح ایران مکران تک آئے، اور یہی ملک جنوبی حد ہے، فتوحات فاروقی کی، اس وقت مسلمان اس سے آگے نہ بڑھ سکے،

(۴) عربوں کے سندھ پر حملہ آور ہونے کے دو رستے تھے، خشکی کا ایران کی سمت سے جو بوجہ جنگ رُکا ہوا تھا، جیسا کہ مذکور ہوا، دوسرا رستہ سمندری تھا، لیکن عہد فاروقی میں بحری راہ سے بھی حملہ نہیں کیا گیا، جناب معاویہ شام کے گورنر تھے، انھوں نے جناب فاروق سے جزیرہ سائپرس (نزد شام) پر حملہ آور ہونے کی اجازت مانگی، مگر خلیفہ صاحب نے انکار کر دیا،

یہ معلوم ہے کہ زمانہ خلافت فاروقی تک اسلامی حکومت کے پاس جہازی بیڑا نہ تھا، پس ان دونوں باتوں سے ظاہر ہے، کہ اس زمانہ میں ساحل ہند جیسے دور دراز علاقہ پر حملہ کرنا ناممکن تھا، جناب فاروق جنھوں نے سائپرس پر حملہ کرنے کی اجازت نہ دی تھی وہ سندھ پر حملہ آور ہونے کی کیونکر اجازت دے سکتے تھے،

(۵) خود انگریز مؤرخ بحری حملہ کا اس طرح ذکر کرتا ہے، گویا اُسے اس میں شک ہے، پھر کہتا ہے، کہ لٹیروں نے سندھ کی حسین عورتوں

کے لئے ارادہ کیا ہوگا،

ان فقرات کے الفاظ شاہد ہیں، کہ یہ مؤرخانہ بیان نہیں ہے، بلکہ مجتہدانہ (مگر متعصبانہ) قیاس ہے، جس میں لفظی مغالطہ بھی ہے، اگر اس مؤرخ میں اخلاقی جرأت ہوتی، تو وہ "لٹیروں" کی بجائے "عربوں" یا "مسلمانوں" لکھتا، لیکن اس قسم کی جرأت اس وقت ہوسکتی تھی، جب اس کے بیان کو صداقت کے ساتھ ذرہ بھر بھی تعلق ہوتا، اور اس کے پاس ضعیف سے ضعیف بھی تاریخی ثبوت موجود ہوتا! لیکن اس قسم کی مغالطہ دہی سے اسلام اور مسلمانوں کے کیریکٹر پر دھبہ نہیں ڈالا جاسکتا ہے، کیونکہ مسلمانوں کی مستند تاریخ دست برد زمانہ سے محفوظ ہے،

(۶) اگر مسلمان غارت گر حسن ہوتے، تو شام، مصر اور ایران میں اپنے حوصلہ نکالتے (کیونکہ وہاں حسن کے نمونے سندھ سے بہت اعلیٰ تھے) مسلمان عہد فاروقی میں ان ممالک میں فاتحانہ طمطراق کے ساتھ پہنچے، مگر تاریخ شاہد ہے کہ کسی حملہ آور مسلمان نے اس قسم کی کوئی خلاف اخلاق حرکت نہیں کی،

(۷) اس بات کی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں ہے، کہ حضرت عمر کے زمانہ میں عربوں (مسلم یا کفار) نے، حسن و دولت کی غارت گری کے

خیال سے سندھ پر حملہ کیا۔ لیکن اگر اس امر کی تاریخی سند بھی مل جائے (جو محال ہے[1]) تو اس کے معنی یہ ہوں گے، کہ عربی بحری ڈاکوؤں نے حملہ کیا ہوگا، اور بس! اور ظاہر ہے، کہ بحری ڈاکوؤں کے غارتگرانہ حملہ کی ذمہ داری خلیفہ اور تمام مسلمانوں پر عائد نہیں ہوتی، ماضی بعید میں یورپ میں بحری ڈاکوؤں نے جو کشت وخون کیا، اس کی ذمہ داری کیا گورنمنٹ یا قوم کے سر پر ہے ؟

(۸) جب فتح مکران کا مژدہ دربار خلافت میں پہنچا، تو حضرت عمرؓ نے اس ملک کے حالات دریافت فرمائے، اور یہ سُن کر جناب فاروقؓ نے اسلامی سپہ سالار مکران کو لکھا" لایجوز ان مکران احد من جنودھما
یعنی اسلامی فوجوں کے مکران سے بڑھنے کی ممانعت کی جاتی ہے

حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک ایسا واقعہ ہے، جس سے ناواقف شخص دھوکا کھا سکتا ہے، لیکن محقق مؤرخ کی شان اس سے اعلیٰ و ارفع ہے،

[1] اہل عرب، اسلام سے پہلے جہازوں کے مالک نہیں تھے، حجاز کے عرب دریا کے نام سے کانپا کرتے تھے، اور جہاز میں سوار ہونے کی جسارت نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ آج بھی بدوی لوگوں کا یہی حال ہے،

(تاریخ تمدن اسلام حصہ اول مؤلفہ مصری مورخ جرجی زیدان عیسائی)

گورنر بحرین (علاء الحزمی) نے بعہد فاروقی بلا اطلاع خلیفہ شہر اصطخر (متصل شیراز) پر حملہ کیا،

کیا فاضل مؤرخ لیتھبرج نے اسی حملہ کو حملۂ سندھ سمجھ لیا ہے؟

عبداللہ بن عامر کے حملے کے بعد ۴۳ھ (عہد امیر معاویہؓ) میں اعراب کو سندھ و ہند کی جانب التفات کرنے کی فرصت نہیں ہوئی ۴۴ھ ۶۶۴ء میں مہلب بن ابی صفرہ نے سندھ پر حملہ کیا، اور قندھار سے ملتان تک کا کل علاقہ تسخیر کر لیا،

اس مہم کا ذکر فاضل لیتھبرج اپنے انداز خاص میں بہ الفاظ ذیل کرتا ہے "۶۶۴ء میں جب مسلمانوں نے کابل فتح کیا، تو عرب کا ایک امیر مہلب نام اس رستہ ہند میں ملتان تک آیا، اور بہت سے لوگوں کو قید کر کے لے گیا"۔

امر واقعہ یہ ہے، کہ امیر مہلب نے ملتان تک کا علاقہ فتح کیا، اور اس کی تکمیل زمانہ آئندہ میں محمد ابن قاسم نے کی، جس کی تفصیل عنقریب آئیگی لیکن لیتھبرج کے نزدیک اس سے زیادہ کچھ نہ ہوا کہ حملہ آور بہت سے لوگوں کو قید کر کے لے گیا (العجب ثم العجب)

اس زمانہ سے بہت پیشتر سندھ اور جزیرہ لنکا میں مسلمانوں کی تعداد معقول ہو چکی تھی، یہ مسلمان یہاں یا تو بہ تقریب اشاعت اسلام یا بہ سلسلۂ

تجارت مقیم تھے، لیکن تاریخ اسلام کے طالب العلم جانتے ہیں، کہ یہ دونوں مقاصد قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے کچھ اس طرح پیش نظر رہے ہیں، کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا سہل نہیں، مگر افسوس کہ ہمارے حصّہ میں نہ یہ ہے، نہ وہ ہے

وادیٔ نجد میں وہ شور سلاسل نہ رہا　　قیس دیوانہ نظارۂ محمل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے ہم نہ رہے دل نہ رہا　　گھر یہ اُجڑا ہے کہ وہ رونق محفل نہ رہا
(علامہ اقبال)

ہم لکھ آئے ہیں، کہ عبداللہ بن عامر نے عزم سندھ کیا، اور اس سے قبل راجہ سندھ نے نہاوند اور مکران کے معرکوں میں اصول ناطرفداری (نیوٹرل) کو چھوڑ کر مسلمانوں کے دشمنوں کے ہمراہ ہو کر ان سے جنگ کی تھی، نیوٹرل نہ رہنے والے حکمران اور قوموں سے یہی سلوک کیا جاتا ہے،

عبدالرحمٰن مقابل آنیوالی فوجوں کو ہزیمت پر ہزیمت دیتا، اور علم کامیابی آج بھی اُڑاتا لغزدہ (سندھ) تک جا پہنچا، یہی حملہ اول سندھ ہے، جو عہد عثمانی میں ہوا،

عبدالرحمٰن کو اس سے زیادہ فتوحات کا موقعہ نہ ملا، کیونکہ اُسے کابل کی مہمات پر بلا لیا گیا، اب تسخیر سندھ پر سواد العبدی مامور ہوا، جس نے شہر دقیقان (لہجہ عربی) کو فتح کیا

یہ فتوحات عہد عثمانی میں ہوئیں، لیکن ۳۵ھ میں خلیفہ سوم شہید ہوئے، اور مسلمانوں کا قومی و اجتماعی شیرازہ درہم برہم ہوگیا، خلیفہ چہارم جناب حضرت علی المرتضٰی کرم اللہ وجہ کو سندھ اور دیگر ایشیائی مہمات کی جانب التفات کرنے کی فرصت نہ ملی، سندھ پر اس عہد میں کوئی حملہ نہیں ہوا، ہاں سابقہ مقبوضہ علاقہ سے خراج وصول ہوتا رہا،

حضرت علیؓ کی شہادت ۴۰ھ اور اُن کے جانشین فرزند حضرت حسنؓ کی خلع خلافت کے بعد ۴۱ھ میں جناب حضرت معاویہ خلیفہ منتخب ہوئے اور انہوں نے بہ تجدید تمام پھر فتوحات کا سلسلہ جاری کر دیا، چنانچہ ایک ہی وقت میں تیس بہادر جرنیل ایشیا، یورپ، اور افریقہ کی تسخیر پر مامور کئے جنہوں نے بحر و بر میں تہلکہ ڈال دیا، ان تیس جرنیلوں میں سے ایک ممتاز جرنیل مہلب تھا، جس نے سندھ پر حملہ کیا، اور قندہار سے لے کر ملتان تک کا کل علاقہ تسخیر کر لیا۔ سندھ پر مسلمانوں کا کامل تسلط ہوگیا، جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، مہلب کی فتوحات اس سے آگے سندھ اور پنجاب میں نہ بڑھیں اور یہ علاقہ ایک صوبہ یا اسلامی فتوحات کا ضمیمہ بن گیا!

فتوحات سندھ و ہند کی تاخیر کی وجہ مسلمانوں کی ہر سہ بر اعظموں میں فاتحانہ مصروفیت اور خاص ایشیا میں خراسان، ترکستان، سمرقند، بخارا، تمغاج، ترمذ (تاتار) کی فوج کشیاں ہوئیں، یا باہمی رقابت اور نااتفاقیاں!

سنہ ۶۰ھ میں خلیفہ حضرت معاویہؓ نے وفات پائی اور یزید ان کا جانشین ہوا، مگر اسلامی فتوحات کا سیلاب گویا رُک گیا، مسلمانوں کا فاتحانہ جوش مُردہ ہوگیا یزید نے سنہ ۶۴ھ میں وفات پائی، اس کا فرزند معاویہ ثانی وارث خلافت ہوا، مگر چالیس روز بعد وفات پائی۔

اس کے بعد مروان بن حکم، عبد الملک بن مروان۔ عبد اللہ بن زبیرؓ وغیرہم کے قبضہ میں زمام خلافت آئی، اور بالآخر عبد الملک اسلامی دُنیا کا واحد خلیفہ بنا، اور اس وقت پھر بیرونی ممالک کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہُوا،

سندھ کی حکومت پر مجاہد بن سعد التمیمی کو مامور کیا گیا، اور اس نے سندھ کے شہر قندابیل کو فتح کیا، لیکن پھر نااتفاقیاں اور خانہ جنگیاں شروع ہوگئیں، جس کی وجہ سے خلیفہ عبد الملک کی وفات (سنہ ۸۶ھ) اور اس کے فرزند ولید کے زمانہ تک ہندوستان سندھ کے علاقے میں کوئی اضافہ نہیں ہُوا۔

ولید کے زمانہ میں مشرقی فتوحات کی نامزدگی حجاج بن یوسف کے اختیار میں تھی، حجاج نے مجاعہ کے بعد حکومت سندھ محمد بن ہارون کے سپرد کی، جو کچھ عرصہ تک باغی علاقوں کی سرکوبی کرتا رہا،

حجاج نے عبد اللہ بن نابہان اسلمی کو تسخیر دیبل (ٹھٹھہ) کے لئے روانہ کیا، مگر یہ اسی کوشش میں شہید ہوئے، اس کے بعد بدیل کو فوج

دے کر سندھ بھیجا گیا، یہ سپہ سالار محمد ہارون حاکم مکران اور عبداللہ بن قحطان کی امدادی افواج۔ (جو چالیس ہزار سے کم نہیں) لیکر دیبل پر جا پڑا اور راجہ داہر کے فرزند کیشب سے صبح سے شام تک جنگ کرتا رہا، اور آخر کار گھوڑے سے گر کر شہادت پائی سے

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

الغرض اس حملہ میں مسلمانوں کو کامیابی نہیں ہوئی جس کی وجہ بے احتیاطی اور ناکافی سامان حرب بھی تھیں

ان تمام واقعات کے بعد مشہور سپہ سالار ابن قاسم سندھ کیلئے نامزد ہوا، لیکن فاضل لیتھبرج نے ان حملہ واقعات کو دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کر کے، امیر مہلب کے حملے کے بعد صرف یہ لکھدیا ہے، کہ اس کے بعد پھر کئی بار مسلمانوں نے سندھ پر حملے کئے، اور یہاں کی لوٹ سے مالامال ہو گئے،

گویا مسلمان ڈاکو تھے، یا دیوالئے، جو خواہ مخواہ حملے کرتے تھے، حالانکہ واقعات یہ ہیں، کہ مسلمانوں نے سندھ پر فاتحانہ لشکرکشیاں کیں، مخالف فوجوں سے مقابلہ کیا، فتوحات حاصل کیں، ثمرات فتح (خراج وغیرہ) بھی حاصل کرتے رہے، اور انہیں ناکامیابی بھی رونما ہوئی، حملہ سندھ کے

اسباب میں اسلامی خواتین کے لوٹ لینے کا واقعہ بھی کافی اہم ہے۔

محمد ابن قاسم کے حملہ سندھ کا تذکرہ مؤرخ مذکور نے بہ الفاظ ذیل کیا ہے:۔

"آخر ۷۱۲ء میں خلیفہ بغداد کے عہد میں عراق کے عامل حجاز کا بھتیجا، محمد بن قاسم بہت سی فوج لے کر سندھ پر چڑھ آیا، اور سندھ کو فتح کر لیا"

عامل عراق یعنی خلیفہ کے نائب کا نام حجاج بن یوسف تھا، اور یہ نام نہایت مشہور ہے۔ لیکن مؤرخ موصوف نے اس کا نام "حجاز" لکھا ہے، افسوس کہ ایسے ہی واقعات سے مملو تاریخ سرکاری مدارس ہند میں طلبا کو پڑھائی جاتی ہے، العجب ثم العجب ابن قاسم کے حملہ کا سبب تاریخ ہند میں حسب ذیل لکھا ہے، کہ:۔

"راجہ داہر والئی سندھ نے اہل عرب کے کچھ جہاز لوٹ لئے تھے"

ہم اس واقعہ کی تفصیل اوپر لکھ آئے ہیں، مؤرخ مذکور نے ابن قاسم کے حملے کا ذکر جن الفاظ میں کیا، وہ مغالطہ انگیز ہیں۔ "ابن قاسم حجاز (حجاج کا بھتیجا) سندھ پر چڑھ آیا" گویا خود بخود احکام حکومت کے ماتحت نہیں، بلا وجہ! بے سبب!

بایں وجود ہم ضروری سمجھتے ہیں، کہ ابن قاسم کی فتوحات کا بالتفصیل ذکر کریں، جس سے واقعات پر روشنی پڑ سکیگی، بلکہ محمد قاسم کے خصائل کا اندازہ بھی اس کتاب کے پڑھنے والے کر سکیں گے،

یہ لکھا جا چکا ہے۔ کہ گذشتہ مہمات سندھ میں عبداللہ بن نابہال اسلمی نے سندھیوں سے ہزیمت کھائی اور وہیں شہید ہوئے، اور اس کے بعد بدیل نے سندھ پر حملہ کیا، مگر گھوڑے سے گر کر شہید ہؤا، اور اس بار بھی مسلمانوں کو سندھ پر کامیابی نہیں ہوئی

ان ہزیمتوں نے حجاج بن یوسف کے دل کو جوش سے لبریز کیا، غیرت مندوں کے لیئے ناکامی تازیانۂ عبرت ہوتی ہے، خود خلیفہ ولید بوجہ بعدانی مہم سندھ کے خلاف تھا، لیکن آخر حجاج نے اسے اس امر پر رضامند کر لیا، اس نے کہا، کہ اس مہم پر جس قدر روپیہ صرف ہوگا، اس کا بار میری ذات خاص پر ہوگا، نہ کہ ایوان خلافت پر"

حجاج نے اس مہم کا سپہ سالار اپنے نوجوان بھتیجے محمد بن قاسم کو بنایا، ابن قاسم کی عمر اس وقت سترہ، اٹھارہ سال سے زیادہ نہ تھی، وہ حجاج کا خویش بھی تھا۔ اور قبل ازیں مہمات خراسان میں اپنے تدبر اور شجاعت کا نمایاں ثبوت بہم پہنچا چکا تھا، حجاج کا یہ انتخاب نہایت ہی موزوں تھا، جیسا کہ آئندہ معرض تحریر میں آنے والے واقعات سے ثابت ہوگا، الغرض ابن قاسم نے چھ ہزار آزمودہ کار فوج ہمراہ لے کر یہ کہتے ہوئے جانب سندھ حرکت کی ؎

"ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا"

بوقت رخصت اُسے حجاج نے خاص خاص ہدایات کیں، خود محمد قاسم براہ شیراز روانہ ہوا، لیکن سامان حرب و آلات قلعہ کشائی منجنیقیں وغیرہ براہ خلیج فارس روانہ کیا۔

سندھ میں پہنچتے پہنچتے محمد ابن قاسم کے پاس کافی جمعیت ہوگئی، مکران وغیرہ علاقوں میں سے چھ ہزار شامی فوج کے علاوہ اب پندرہ ہزار سوار، چھ ہزار سانڈنی سوار، اور تین ہزار پیادے تھے، یہ واقعہ ۷۱۱ء کا ہے،

کتب تاریخ میں مذکور ہے، کہ یہ اسلامی فوج اس قدر آراستہ اور مکمل تھی، اور اس کے پاس اس قدر سامان مکمل تھا، کہ سپاہیوں کو سوئی دھاگا تک باہر سے نہیں لینا پڑتا تھا،

اس احتیاط و انتظام سے جہاں حجاج کے تدبر پر روشنی پڑتی ہے وہاں یہ بھی واضح ہوجاتا ہے، کہ اس کی یہ پیش بندی اس وجہ سے بھی تھی کہ مفتوحہ علاقہ کی رعایا فوج کی دست بُرد سے محفوظ رہے،

اس روشنی اور تہذیب کے زمانے میں جو سلوک فاتح قوم مفتوح قوم سے کرتی ہے، اس کے نظارے چشم تصور سے بلجیم میں دیکھ لیجئے۔

حجاج بن یوسف، تاریخ اسلام میں کوئی عادل اور دور اندیش حکمران نہیں ہے، بلکہ وہ خونخوار اور جابر مشہور ہے، لیکن بایں ہمہ وہ رعایا کے

حق میں نوشیرواں سے کم نہیں، ع

خزاں ہے جس کی یہ اس کی بہار کیا ہوگی

محمد ابن قاسم مکران سے کوچ کر کے ارمن بیلہ پہنچا، اور اس قلعہ کو فتح کیا،

اب محمد ابن قاسم فاتحانہ کوچ کرتا ہوا (دیبل) جا پہنچا، یہیں اسے منجنیقیں اور سامان حرب جہازی رستہ سے ملا، ایک منجنیق جس کا نام عروسک تھا، اس قدر گراں تھی۔ کہ اس کے کھینچنے کے لئے پانسو جوانوں کی طاقت کی ضرورت ہوتی تھی، علی ہذا القیاس ایک مشہور منجنیق کا نام "معویہ" تھا مدبرا ور دور اندیش حجاج کی جنگی ہدایات مسلسل سپہ سالار کو پہنچتی رہتی تھیں، حتیٰ کہ نقشہ ہائے جنگ تک خود حجاج ہی تجویز کر کے بھیجتا تھا، مگر یہ کوئی نئی بات نہ تھی، خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اپنے زمانۂ خلافت میں ایسا ہی کرتے تھے، ابن قاسم حجاج کی ہدایات سے کافی فائدہ اُٹھاتا تھا،

ابن قاسم نے اپنے گرد بارہ گز عریض اور چھ گز عمیق خندق کھدوائی اور حملہ کیا، تو اہل دیبل محصور ہو کر مدافعت میں مصروف ہوئے، اور محاصرہ کو سات روز گزر گئے، قلعہ تسخیر نہ ہوا، حملہ آور بھی گھبرا اُٹھے اسی اثنا میں مسلمانوں کو ایک عجیب شکل میں امداد غیبی آئی،

آٹھویں روز ایک برہمن قلعہ سے باہر نکلا، اور سپہ سالار اسلام کی خدمت میں حاضر ہو کر اس نے عرض کی، کہ اگر میری جان بخشی کی جاتے، اور حضور مجھ سے وعدۂ انعام کریں، تو میں قلعہ کی تسخیر کا راز بتا سکتا ہوں، اس کی درخواست منظور کی گئی، اس نے بیان کیا کہ اس شہر میں ایک بُدھ مندر ہے اور اس پر ایک ایسا عظیم الشان جھنڈا لگا ہوا ہے۔ کہ وہ تمام شہر کو اپنے سایہ میں لے لیتا ہے۔ ہندوؤں کا اعتقاد ہے، کہ جب تک اس جھنڈے کا سایہ ہمارے سروں پر ہے، کوئی طاقت اس شہر کو تسخیر نہیں کر سکتی اسی بھروسہ پر ہندو آج تک مقابلہ کرتے رہے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ وہ کبھی مغلوب نہ ہوں گے،

لشکر اسلام میں کوفہ کی ڈاک ہر تیسرے روز پہنچتی تھی، اور ادھر کے حالات بھی حجاج کو بھیجے جاتے تھے، اور وہ ہر معاملہ میں ہدایات بھیجتا رہتا تھا،

تسخیر دیبل کے سلسلہ میں جب یہاں کے واقعات اسے لکھے گئے تو اس نے لشکر اسلام کے مشہور منجنیق باز (جعوبہ) کو نشانہ باندھنے اور منجنیق لگانے کے متعلق خاص خاص ہدایات لکھ بھیجیں

علاوہ ازیں دس ہزار روپیہ کے انعام کا وعدہ کیا،

جعوبہ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہکر ایک نشانہ لگایا، کہ مندر کا

گنبد تک اُڑ گیا، اور اس کے جھنڈے کی دھجیاں تک ڈھونڈے نہ ملیں اب قلعہ پر فوراً ہر طرف سے حملہ کیا گیا۔ جان باز خزیمہ کوئی کمند ڈال کر فصیل پر چڑھ گیا، اور دوسرے مجاہدین نے اس کی تقلید کی، الغرض لشکر اسلام قلعہ میں داخل ہو گیا۔ تاہم تین روز تک تلوار چلتی رہی، مگر تابکے محصورین کے حوصلے پست ہو گئے، کیونکہ ؎

جس توقع پر تھی اُن کی زندگی وہ مٹ گئی
جو سہارا تھا اُنہیں وہ آسرا جاتا رہا

(داغ بہ تصرف)

الغرض قلعہ پر فاتحین نے کامل تسلط کر لیا۔ جو مسلمان عورتیں اس قلعہ میں مقید تھیں، اُنہیں آزاد کیا گیا، یہاں مسجدیں تعمیر کی گئیں، اور ایک عظیم الشان چھاؤنی ڈالی گئی، تسخیر دیبل میں یہ واقعہ خصوصیت رکھتا ہے۔ کہ ایک ہندو افسر نے ان مظلوم عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کیا تھا، پس اس ہندو افسر کو نہ صرف زر و مال سے مالامال کر دیا گیا، بلکہ دیبل کا نائب السلطنت (وائسرائے) بنا دیا گیا، ؎

کبھی ہم نے بھی کی تھی حکمرانی ان ممالک پر
مگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان و دل پر تھا!
(شبلی)

تسخیر دیبل کی اطلاع سے راجہ داہر[1] کو سخت تشویش لاحق ہوئی، وہ نوع بنوع کی تجاویز و تدابیر سوچنے لگا، اب ایک جانب اسنے برہمن آباد وغیرہ دیگر قلعہ جات کی مورچہ بندی کی، اور سپاہ جمع کرنے لگا، دوسری جانب حکمرانانہ حکمت عملی سے کام نکالنا چاہا چنانچہ اس نے محمد ابن قاسم کے ساتھ سلسلہ مخاطبت مکاتبت قائم کیا۔ راجہ نے سپہ سالار اسلام کو لکھا:-

---

سلہ راجہ داہر راجہ چچ کا فرزند نسلاً برہمن، اور مذہباً بدھ تھا، اس کی وسعت مملکت کشمیر سے سورت تک، اور مکران سے قنوج تک تھی، راجہ چچ کو حکومت سندھ ایک قدیم خاندان سے ہند و راجہ سے عجیب و غریب طریق پہنچی تھی، اس راجہ کا نام ساہنی تھا، اور قوم راجپوت، بوڑھے والی سندھ کے لاولد مر جانے کے بعد جوان عمر رانی سبھ دیوی نے راجہ کے مستحق حکومت وارثوں کا استیصال کرایا، بہ امداد چچ (جو ایک شاندار برہمن تھا) اور اس پر راجہ کی حیات میں بھی رانی کی نظر التفات تھی، اس کے بعد چچ نے بیوہ رانی سے شادی رچائی۔ لیکن چچ کو کئی دعویٰ داران حکومت سے مقابلہ کر کے ان پر غلبہ حاصل کرنا پڑا، الغرض اس انقلاب حکومت میں عشق و محبت کی کرشمہ سازیوں کو بہت بڑا دخل تھا چچ ایک زبردست حکمران ہوا، اس کی سلطنت کی حدود ایک جانب از قندہار تا بہ قنوج اور دوسری جانب کشمیر تا بہ سورت تھی، گویا تقریباً تمام شمالی ہند کا وہ ایک خود مختار و زبردست راجہ تھا، رانی سبھ دیوی کے دو فرزند داہر و دہرسیہ اور ایک دختر رانی مائی پیدا ہوئی، اس راج کنواری کی شادی راجہ بھاٹیہ سے ہوئی

"تم سے پیشتر بھی عربوں کو فتح ہند و سندھ کا شوق چرایا تھا، لیکن تمہیں معلوم ہوگا، کہ ہمارے بہادروں نے اُن کا قلع قمع کر دیا، اور بقیۃ السیف کو بھگا دیا، اب تمہارے سر میں یہ خبط سمایا ہے، ظاہر ہے، کہ تمہارا بھی وہی حشر ہوگا جو تمہارے پیشروؤں کا ہوا

تم شاید فتح دیبل پر مغرور ہو، کہ مُنہ اٹھائے آگے بڑھے آرہے ہو لیکن تمہاری خطرناک غلط فہمی ہے، تسخیر دیبل کچھ اہمیت اور قدر و قیمت نہیں رکھتی، اس لئے کہ نہ وہاں کوئی جنگی قلعہ تھا۔ اور نہ فوج" وہ محض ایک

بقیہ نوٹ صفحہ ماسبق

لیکن نجومیوں نے راجہ داہر کے دریافت کرنے پر بتایا، کہ علم جوتش یہ کہتا ہے، کہ رانی قلعہ الور سے باہر نہیں جائیگی، اور یہ ہندوستان کی ملکہ بنے گی، گویا حکومت ہند داہر کے قبضہ سے نکل کر رانی کے شوہر کے تصرف میں جانیوالی تھی، فی الحقیقت اس سے زیادہ پریشان کن اطلاع راجہ داہر کیلئے اور کیا ہوسکتی تھی۔ مگر کچھ عقل کام نہ کرتی تھی، کہ کیا تدبیر کرے، آخر ایک برہمن وزیر نے صلاح دی کہ رانی مائی کو اپنے سلک ازدواج میں منسلک کرلے، اور چار و ناچار راجہ کو اس مشورہ پر عمل پیرا ہونا پڑا۔ لیکن مشیت ایزدی کچھ اور تھی، اور انسانی تدابیر اس کے مقابلہ سے ہر زمانہ میں عاجز رہی ہے۔ اس کی تفصیل آگے چل کر معرض تحریر میں آئے گی۔

تجارتی شہر تھا، اور اس کے باشندے بقال، اگر دیبل پر ہمارے بہادروں سے تمہیں سابقہ پڑتا، تو پھر ایک مسلمان کا بھی جان بچا کر لے جانا محالات سے تھا، میرا فرزند کشیب انتخاب شجاعان عالم ہے، وہ فیل سفید کا راکب اور یک صد زنجیر فیل کا مالک ہے۔ پس اگر میں اسے ہی دیبل جانے کا اشارہ کر دیتا۔ تو تم قلعہ کے اندر قدم بھی نہ رکھ سکتے، اب تمہارے حق میں بہتر یہی ہے، کہ واپس لوٹ جاؤ، ورنہ تمہارا بھی وہی حشر ہوگا، جو بدیل کا ہوا، آئندہ تمہیں اختیار ہے،

اس مراسلت کا جواب سپہ سالار اسلام محمد بن قاسم نے حسب ذیل تحریر کر کے راجہ داہر کی خدمت میں بھیجا:۔

از جانب محمد بن قاسم ثقفی، بخدمت متکبر و منکر داہر

تم نے ہمیں اپنی قوت و حشمت، اور فیل و سپاہ کی کثرت سے مرعوب کرنا چاہا۔ لیکن قوت صرف خدا کی قوت ہے "لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم"، ہم امداد الٰہی پر اعتماد رکھتے ہیں، ہاتھی اور گھوڑوں پر نہیں!

نصرت و ہزیمت محض خدائے قادر و توانا کے ہاتھ میں ہے، تم کو یاد رہنا چاہیئے۔ کہ ہمیں دعوت جنگ خود تم نے دی ہے، تم نے سراندیپ کے جہاز لوٹ لئے اور مسلمان بیوہ عورتوں کو مقید کر لیا۔ اور خلیفۂ اسلام کی فہمائش پر توجہ نہ کی، جس کا احترام دنیا کرتی ہے، پس تم سے انتقام لیا

جائے گا، میں خدائے تعالیٰ سے فتح وظفر کی امید رکھتا ہوں، یا دشمن کا سر کاٹ کر خلیفہ کی خدمت میں بھیج سکوں گا۔ یا بر سرِ میدان کام آؤں گا، یہ محض حصول رضائے الٰہی کے لئے ہے، اور مجھے اس سے کامل توقع نصرت ہے۔ فقط ۹۳ھ

محمد ابن قاسم کے اس خط سے حملہ سندھ کی غرض و غایت آئینہ اور اس امر کی تردید ہو جاتی ہے، کہ مسلمانوں نے خواہ مخواہ حملہ کیا تھا، یا مذہبی جوش نے انہیں دیوانہ کر دیا تھا،

بعد فتح دیبل اسلامی فوجیں سیسم جا پہنچیں، اور یہاں سے سپہ سالار اسلام نے نیرون کا رُخ کیا

لیکن اہل نیرون نے پیشتر ہی بہ وعدہ اطاعت و امداد حجاج سے تحریری امان نامہ طلب کیا تھا، اس لئے قلعہ نیرون کے والی نے سپہ سالار اسلام کی خدمت میں اظہار اطاعت و مودت کرتے ہوئے، تحفہ و تحائف پیش کئے، اور مہمات میں ہر قسم کی امداد و رہنمائی کے وعدہ کی تجدید کی اور بہ زمانہ مستقبل اس کو نباہا،

نیرون سے ۳۰ فرسنگ کے فاصلے پر قلعہ بہرج (بھروج) واقع تھا، اس قلعہ پر راجہ داہر کا برادر زادہ حکومت کرتا تھا، بہرج کی رعایا ہتھیار ڈالنے کے لئے ابتداہی سے تیار تھی، تاہم غیور راجہ نے کامل سات

روز تک قلعہ میں محصور ہو کر مقابلہ کیا۔ مگر آخرکار زمانہ کو یاور نہ دیکھ کر شب تاریک کے پردے میں قلعہ سے غائب ہوگیا، اور صبح کو اسلامی فوج بآسانی قابض ہوگئی

یہ لکھا جا چکا ہے۔ کہ حجاج دار الخلافہ ہی میں بیٹھا ہوا سندھی مہمات میں رہنمائی کر رہا تھا، اور ہر قسم کی ہدایات ابن قاسم کو بھیجتا رہتا تھا چنانچہ جب اسلامی فوجیں سیسم میں پڑی ہوئی تھیں، تو حجاج نے حسب ذیل ہدایات سپہ سالار اسلام کو بھیجیں،

(۱) اپنے رفقاء سے عمدہ سلوک کرنا، ان کا درجہ بدرجہ احترام اور تالیف قلوب کرتے رہنا، فوج کی ضروریات کو فوراً بہم پہنچانا، دیکھنا مجاہدین کو کسی قسم کی تکلیف و شکایت نہ ہونے پائے،

(۲) غلہ کی ارزانی کا خیال رکھنا، اور ایسا طرز عمل اختیار کرنا، کہ کبھی گرانی نہ پیدا ہونے پائے۔

(۳) مال وزر، ہاتھی، گھوڑا وغیرہ جو کچھ ہاتھ آئے، وہ مجاہدین کا حق ہے، خبردار اُسے اپنی ذاتی ملک بنانے کا ہرگز خیال نہ کرنا، مال غنیمت مجاہدین کا حق ہے، اس میں سے خمس نکال کر باقی تمام حسب قاعدہ شریعت اُن پر تقسیم کیا جائے، سوار کو دو حصے اور پیادہ کو ایک حصہ دیا جائے۔

(۴) جب مفتوحہ ملک پر کامل تسلط ہو جائے، قلعے اور چھاؤنیاں مستحکم

حاصل کرلیں، تو جو روپیہ باقی بچے، وہ رعایا کی فلاح وبہبود پر صرف کیا جائے۔

(۵) کاشتکار، اہل حرفہ، تجار کی امداد ووظائف اور رعایت سے دریغ نہ کرنا، ملک کی حقیقی ترقی کا انحصار، انہیں جماعتوں پر ہے۔

مشاہدہ بتا رہا ہے، کہ اقوام متمدنہ آج بھی حجاج کی مذکورہ بالا چہارم پنجم دفعات پر کاربند ہیں، یعنی کم وبیش تیرہ صدیاں گزر جانے کے باوجود حجاج کی ہدایات کارآمد ہیں۔ اگرچہ گرانی اور ارزانی کے جی جی اصول پر اس ترقی کے زمانہ میں بھی کسی ترقی یافتہ دولت کی نظر نہیں، یہ یاد رہے۔ کہ حجاج بن یوسف وہ شخص ہے، جو تاریخ میں ظالم وجابر کے نام سے مشہور رہے!

نیرون اور بہرج کی آبادی پیشتر ہی اسلامی حکومت سے مانوس ہو چکی تھی تاہم شمالی جاٹوں نے تمرد دکھایا، اور شبخون مارنے کا ارادہ کیا، مگر خیال کو عمل میں لانے سے قبل ہی ہوشیار ابن قاسم نے اس فتنہ کو دبا دیا۔ ہندو نجومیوں نے اسلامی فتوحات کی پیش گوئیاں کیں، چند روز بعد وہی سپہ سالار اسلام کی خدمت میں حاضر ہو کر خواستگار معافی تقصیرات ہوئے۔ فیاض ابن قاسم نے ان کے قصور "جرم بغاوت" سے چشم پوشی کی، اور نہ صرف اسی پر اکتفا کیا، بلکہ اُن کے سردار کو گراں بہا خلعت عطا کیا، اور ان کے سابقہ علاقے بھی انہیں کو بطور جاگیر دیدیئے گئے۔

یہ ہندو سردار آخر تک مسلمانوں کا ہوا خواہ، معاون ومددگار، عقیدتمند اور مشیر مہمات بنا رہا۔ جس کے اثر سے اور کئی ہندو سردار مسلمانوں کا کلمہ پڑھنے لگے۔

ان واقعات کے بعد جب محمد ابن قاسم (نیرون) کی طرف لوٹا ہے، تو یہ حال تھا کہ یہاں کے لوگ جوق جوق بغرض اظہار عقیدت اس کے پاس آتے تھے۔ اور انعام واکرام جاگیر ومعافی کی سندات لئے بغلیں بجاتے واپس جاتے تھے،

مسلمانوں کی اس ہردلعزیزی کے اسباب کیا تھے؟

اس سوال کا جواب تاریخ بالتفصیل دیتی ہے، اور اس کے حسب ذیل وجوہ بتاتی ہے:۔

۱۔ سپہ سالار اسلام محمد ابن قاسم کی عام فیاض طبعی اور رعایا کی تالیف قلوب

۲۔ مسلمانوں کا اس معاہدہ کا پابند رہنا، جو پیشتر حاکم نیرون سے کیا گیا تھا، اور اس کے ملک ومال سے تعرض نہ کرنا،

۳۔ سندھ کے ایک زبردست سردار (زمیندار) موکہ پسر . . بسایا کا عربوں کا مطیع اور ہوا خواہ بن جانا، موکہ وہ سردار تھا، جس سے راجہ داہر کو بڑی تقویت تھی، اور اس پر بڑا اعتماد تھا،

۴۔ محمد بن قاسم کی فوج میں ہندو سفیروں کا خدمت سفارت انجام دینا،

محمد بن قاسم دریائے سندھ کے کنارے مقام جبل و کریل پر خیمہ زن تھا اور عبور دریا کی تجویز کر رہا تھا، کیونکہ اسے حجاج کا آگے بڑھنے کا حکم پہنچ چکا تھا، اسی اثنا میں راجہ داہر کا فرزند کشیب سندھ کے دوسرے کنارہ پر آپڑا۔ اس کے ہمراہ کافی جمعیت تھی، اور اس لاؤلشکر کا مدعا، سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا۔ کہ عربوں کو سندھ سے عبور نہ کرنے دیا جائے، کشتیاں وغیرہ سب ان لوگوں کے قبضہ میں تھیں، وہ مسلمانوں کے پل باندھنے میں سدراہ تھے۔ اور بظاہر مسلمانوں کا سندھ سے عبور کرنا محال نظر آرہا تھا،

علاوہ ازیں اور کئی مشکلات رونما ہوئیں، گھوڑوں میں وبا پھیل گئی، سلسلہ رسد مسدود ہوگیا، مجاہدین امراض سوء ہضمی اور رطوبت میں مبتلا ہوگئے اور بنا برایں وجوہ اسلامی فوجوں کو یہاں تقریباً ڈیڑھ ماہ (پچاس یوم) قیام کرنا پڑا،

دارالخلافہ کو متواتر ڈاک جارہی، اور وہاں سے ہر قسم کی ہدایات بہ عجلت موصول ہورہی تھیں، تیسرے روز ڈاک مل جاتی تھی، اور اس وقت بھی یہ معلوم کرکے حیرت ہوتی ہے۔ کہ بذریعہ ریل بھی اس سے جلد ڈاک نہیں پہنچ سکتی، حجاج نے سندھ کے حالات معلوم کرکے فوراً عربی نسل کے گھوڑے کافی تعداد میں بھیجے، اور حکم دیا کہ مجاہدین کو بے قیمت دیدئیے جائیں،

فوج کے لئے ایک عجیب وغریب طریق سے سرکہ بھیجا، یعنی روئی سرکہ میں بھگو کر محمد قاسم کو لکھا۔ کہ روئی پانی میں تر کرکے سرکہ نکالا جائے، اور مجاہدین کو استعمال کرایا جائے؟

ہوشیار محمد قاسم نے دریائے سندھ کا نقشہ اور موقع حجاج کو لکھ بھیجا تھا، اس نے پُل باندھنے کا موقع تجویز کرکے سپہ سالار اسلام کو لکھا،

عرب سردار نے کافی فوج ملازم رکھ لی تھی، پس اس فوج کو عرب سرداروں کی ماتحتی میں دریائے سندھ کے اُن ناکوں پر متعین کردیا گیا، جہاں سے راجہ کی فوج کے سدراہ ہونے کا اندیشہ تھا، یہ تدبیر کارآمد ثابت ہوئی اور دشمن کی فوج تعمیر پُل میں مزاحمت نہ کرسکی۔

محمد قاسم نے کشتیوں کا پُل تیار کرانا شروع کیا، سندھی سردار موکہ نے کشتیوں کی فراہمی وغیرہ امور میں غیر معمولی اہتمام دکھایا، لیکن اس کا بھائی راسل (جو راجہ داہر کا طرفدار تھا) مسلمانوں کا سدراہ ہوا، اور علاقہ کے زمینداروں کی جمعیت اُس کے ہمراہ تھی،

سپہ سالار اسلام نے دریائے سندھ کی چوڑائی کے مطابق دریا کے مغربی کنارہ پر کشتیاں جڑوائیں، اور اُن پر اپنے تیراندازوں کو سوار کرادیا کشتیاں آگے بڑھیں، دشمنوں پر تیروں کی بارش کی گئی، حتیٰ کہ دشمن مشرقی کنارہ

سے پسپا ہوگیا، اب ان مسلسل کشتیوں کا ایک سرا دوسرے کنارے پر جا پہنچا، پھر اُسے ساحل پر میخیں گاڑکر مضبوط باندھ دیا گیا، اور اس پل سے (باوجود دشمن کی مزاحمت کے) تمام اسلامی سپاہ عبور کرگئی، دوسرے کنارے پر پہنچکر سپہ سالار اسلام نے ایک معنی خیز تقریر کی، اس نے کہا کہ مجاہدین اسلام! وہ دیکھو سامنے لشکر حریف ہے، اور گویا ہمیں ایک بر اعظم سے مقابلہ کرنا ہے یہ ہمارے پس پشت دریائے سندھ ہے، یعنی ہم دشمنوں سے محصور ہیں، ہمارا وطن عرب یہاں سے کالے کوسوں پر ہے، اب ہم گویا اجل کے سمندر میں غوطہ زنی کرنے والے ہیں، پس جو شخص واپس جانا چاہے اُسے اس وقت اجازت ہے، میدان سے جانا بزدلی، اور مجاہدین پر برا اثر ڈالنا ہے ۔

اس تقریر سے مجاہدین کے سینے جوش سے پُر ہوگئے، اُنھوں نے نعرہ "اللہ اکبر" لگاکر بطور اظہار شوق شہادت سجدہ کیا، صرف تین سپاہیوں نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا، ان میں سے ایک مقروض تھا، دوسرے کے ایک صغیر سن دختر تھی، کہ اس کا کوئی اور مربی نہ تھا، تیسرے کے ضعیفہ ماں تھی جس کی خدمت اس پر فرض تھی،

یہ واقعہ مسلمانوں کے کیریکٹر پر روشنی ڈالتا ہے، کہ وہ فرائض کی ادائگی کے کیسے پابند، اور حقوق العباد کی ادائگی کو کتنا ضروری سمجھتے تھے ۔

عربی لشکر یہاں سے یلغار کرتا ہوا ارور (الڑی اور بھٹے وار (جے پور سندھ) پہنچا، راجہ داہر (والیٔ سندھ) نے محمد علافی[1] کو عربوں کے مقابلہ پر روانہ کرنا چاہا، لیکن اس نے بحیثیت مسلمان اپنے لئے ایسی جنگ حرام بتاکر صاف انکار کردیا، لیکن راجہ کے اصرار اور اظہار احسانات سے مجبور ہوکر اس نے ہراول فوج کے ساتھ بحیثیت مشیر فوجی جانا منظور کیا، مگر اس فوج کو شکست ہوئی۔ مؤرخ تاریخ ہند لکھتا ہے، کہ مسلمانوں نے راجہ داہر کو شکست دی،

[1] محمد علافی دراصل حکومت اسلامیہ کا ایک باغی تھا، خلیفہ عبدالملک کے ابتدائی زمانہ میں خانہ جنگی ہی رہی، اس کے کچھ عرصہ بعد سعید بن اسلم کلابی کو مکران کا والی مقرر کیا گیا، سعید نے ایک باغی سفہومی کا سر کاٹ کر حجاج کے پاس بھیجا، لیکن اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد باغی مقتول کے عزیزوں معاویہ اور محمد علافی نے سعید پر غالب آکر اس کی کچی کھال کھینچی، اور اس طرح انتقام لیا، حتیٰ کہ مکران پر قبضہ کرلیا، حجاج نے علافیوں کے سرغنہ سلیمان کو تہ تیغ کرایا، اور عبدالرحمٰن بن عشا کو ان کے مقابلہ پر بھیجا، مگر وہ میدان میں کام آیا، اس کے بعد مجاعہ بن سعید حاکم خراسان، علافیوں کی سرکوبی پر مامور ہوا، اب علافیوں نے اپنے میں تاب مقاومت نہ دیکھ کر راہِ فرار اختیار کی اور راجہ داہر کے پاس آکر پناہ لی، اور یہ لوگ راجہ کی فوج میں بھرتی ہوگئے، گویا علافی باغی، غدار اور مسلمانوں کے دشمن تھے سیاست راجہ داہر پر باغیوں کو پناہ دینے کا جرم بھی عائد کرتی ہے۔ راجہ کو اعراب

اور جلد ہی ملک پر قبضہ کر لیا، ہندو اگرچہ مایوس ہو گئے تھے، مگر ان کی دلیری دیکھکر حملہ آور دنگ رہ گئے۔ اور راجپوت سپاہیوں نے اطاعت قبول کرنے سے تباہ ہونا بہتر سمجھا، انھوں نے لکڑیاں اکٹھی کر کے ایک بہت بڑی چتا تیار کی

کا سندھ پر حملہ آور ہونیکا اندیشہ تھا۔ اس لئے اس نے علافیوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور مسلمانوں کی مدافعت میں ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھایا، راجہ داہر نے محمد علافی سے دریافت کیا کہ کیا یہ مناسب نہیں کہ راج کنور کیشب (ولیعہد) پیش قدمی کر کے نیروں کے پڑاؤ پر مسلمانوں سے مقابلہ کرے، محمد نے جواب دیا کہ یہ طرز عمل خطرے سے خالی نہیں اس لئے کہ ابن قاسم کے ہمراہ چیدہ اور منتخب بہادر ہیں محمد بن علافی آنے کو تو مسلمانوں کے مقابلہ پر آ گیا، مگر راجہ کی فوج کی شکست، اور اعراب کے طعن تشنیع، غداری کی ذلت برداشت نہ کر سکا، حتیٰ کہ راجہ سے علیحدہ ہو گیا، اور اس کے مرنے کے بعد محمد قاسم کے پاس آ کر طالب امان ہوا، فیاض سپہ سالار نے اس کے جرم بغاوت، اور قومی غداری سے چشم پوشی کی، اور خدمت سفارت اس کے سپرد کی، ہندو راجاؤں کے پاس وہی پیغام لے کر جایا کرتا، اور انہیں مسلمانوں کی اطاعت کی ترغیب و تحریص دیا کرتا تھا، اور محمد علافی ہندو سفیروں سے بہتر کام کرتا تھا، کیونکہ وہ یہاں رہ کر دیسی زبانوں سے واقف ہو گیا تھا، نیز بوجہ مسلمان اور عرب ہونے کے اسلامی مشن کو وہی موزوں طریق پر کامیاب کر سکتا تھا!

جس میں عورتوں اور بچوں نے گر کر جان دی، راجپوت سوار یہاں ہو کر ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور دونوں دروازوں کو کھول کر حملہ آوروں پر جا پڑے، اور جب تک ایک آدمی بھی زندہ رہا، میدان سے منہ نہ موڑا"

افسوس کہ قدیم کتب تواریخ میں یہ بیان نہیں ملتا، کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کی اطاعت کو ننگ و عار سمجھا، اور مرنے کو ترجیح دی، کاش مؤرخ مذکور اپنے اس بیان کی کوئی تاریخی سند پیش کرتا،

یہ بیان بالکل مجمل ہے، لیکن جو تفصیلی واقعات ہم نے لکھے ہیں، اُن سے نہ صرف یہ ظاہر ہے، کہ ہندو راجاؤں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کی بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ ہندو مسلمانوں کی فوج اور دیگر صیغوں میں ملازم تھے، سفارت کے عہدوں پر انہیں ممتاز کیا گیا تھا،

غرضیکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے فریق سے نفرت نہ تھی، بلکہ باہم اعتماد تھا، لیکن انگریزی مؤرخ کے بیان کا نتیجہ اس کے خلاف ہے اور ہم اسے تعلقات بین الاقوامی کے نقطۂ خیال سے افسوسناک امر سمجھتے ہیں!

اب راج کنوار (کشیب) اپنی فوج اور جنگی ہاتھی لے کر عربوں کے مقابلہ پر آیا، خونریز مقابلہ رونما ہوا، سندھی فوج بہ تعداد کثیر کٹ گئی، اور راج کنوار بہ دشواری تمام جان بچا کر باپ کے پاس پہنچ گیا، اب (راسل سردار برادر موکہ مذکور) ابن قاسم کے مقابل آیا اور بعد چندے جنگ زرگری اپنے آپ کو مسلمانوں

کے حوالے کر دیا،

راسل نے اپنے آقا راجہ داہر سے بے وفائی کی، اور اس کی وجہ سوائے اس کے اور کوئی نظر نہیں آتی، کہ آئندہ اسے، راجہ کا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا اور وہ مسلمانوں کی کامیابی کو یقینی جانتا تھا،

راسل نے مجاہدین اسلام کو اس جھیل سے عبور کرایا، جو عربوں اور سندھیوں کے درمیان حائل تھی، اور اب مسلمان بالکل سندھی فوج کے سرپر تھے، راسل اور اس کے بھائی موکہ نے سپاہ اسلام کی ہر معاملہ میں رہنمائی اور امداد کی، اور ہر موقع پر اپنی عقیدت مندی کا ثبوت دیا، ایسے واقعات کسی قوم کی اقبال مندی اور تائید الٰہی کا ثبوت کہے جاسکتے ہیں، ع

عدو شود سبب خیر، گر خدا خواہد

ہوشیار اور فیاض ابن قاسم نے راسل اور اس کے بھائی کی عزت افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، ہر موقع پر اُسے انعامات و اکرامات سے ممتاز کرتا رہا،

اب راجہ داہر کو خود مسلمانوں کے مقابلے پر آنا تھا، اس لئے اپنے دربار کے نجومیوں اور جوتشیوں سے مشورہ کیا، جواب ملا، کہ "زہرہ ہمارے روبرو اور عربوں کے پس پشت ہے اور اس کا نتیجہ ہے ہماری ہزیمت"

راجہ نے کہا، کہ کیا ہماری فتح کی کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی، نجومیوں نے

کہا، کیوں نہیں! آپ زہرہ کا طلائی بُت اپنے افتراک سے باندھ لیں، اس طرح زہرہ پس پشت ہو جائے گی، جس کا نتیجہ ہماری کامیابی ہے۔" راجہ نے اس تدبیر سے کام لیا،

راجہ نے فوج کا ایک دستہ اپنے ایک بہادر کی زیر کمان عربوں کے مقابلہ کے لئے بھیجا، صبح سے شام تک جنگ رہی، مگر بے نتیجہ، دوسرے روز اور تازہ دم فوج ایک دوسرے ہندو سردار کے ماتحت، میدان میں بھیجی، خون کے دریا بہ گئے اور کشتوں کے پل اور پشتے بندھ گئے، ہندو سپاہ قوم و ملک پر قربان ہو گیا،

ان دو روزہ مقابلوں میں بہت سی سندھی فوج کٹ گئی، راجہ نے جنگی کونسل منعقد کی، وزیر نے کہا کہ موجودہ جنگ کے طریق ہمارے لئے نقصان سے خالی نہیں، اس طرح تو ہماری فوج کٹ جائے گی، اب اگر کامیابی کی کوئی صورت ہو سکتی ہے، تو وہ یہ ہے، کہ دشمنوں پر تمام فوج سے یکبارگی حملہ کیا جائے، شاید اسی طرح عربوں کے پاؤں اُکھڑ جائیں، راجہ نے یہ مشورہ قبول کیا،

راجہ داہر اگلے روز پانچ ہزار چیدہ سوار سر تا پا آہن میں غرق، بیس ہزار پیادے، ساٹھ جنگی ہاتھی ہمراہ لے کر میدان میں آیا، وہ خود زرہ بکتر پہنے اسلحہ جات سے اوپچی بنا ہوا سفید ہاتھی پر سوار تھا،

عماری میں دو حسین عورتیں بھی بیٹھی تھیں، ان میں سے ایک راجہ
کوپان کا بیٹرا، اور دوسری تیر دینی تھی، گویا راجہ اس وقت بھی خانہ زین میں
نہ تھا بلکہ خانہ عشرت میں تھا، باقی سندہی فوج کی کمان شہزادہ کیشب
کر رہا تھا،

مسلمان سپہ سالار نے بھی عربی طریق پر اپنی فوج کو میمنہ، میسرہ
مقدمہ، قلب، طلایہ، ساقہ میں تقسیم کر کے ہر ایک کی کمان پر اپنے جانباز
مجاہدین کو قائم کیا، اور صفوں کی درستی کے بعد ایک معنی خیز تقریر کی جس
میں اس نے حمد و نعت کے بعد جہاد غزا کی اہمیت بیان کی اور مجاہدین کو حکم
ربانی یاد دلایا کہ:۔

"تُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ
ذَالِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

مسلمانو! اگر تم سمجھو، تو تمہاری فلاح اسی میں ہے کہ اپنا
مال اور اپنی جان راہ خدا میں دے ڈالو"

اس کے بعد ابن قاسم نے یہ الفاظ قرآن کریم مجاہدین کو بتایا، کہ مسلم
اور غیر مسلم کی جنگ میں کیا فرق ہے، جہاد میں مسلمانوں کے پیش نظر کیا
ہوتا ہے، اور کفار کے مدنظر کیا؟

سلہ پارہ ۲۸ سورہ صف

الذین امنو یقاتلون فی سبیل اللہ والذین کفر و یقاتلون فی سبیل الطاغوت فقاتلو اولیاء الشیطان ان کید الشیطان کان ضعیفا!"

مسلمان خدا کی راہ میں (بغرض حمایت و اشاعت توحید) ہتھیار اٹھاتے ہیں، اور کفار امور شیطانی (بداخلاقی بت پرستی گمراہی) کی حمایت کے لئے، اس لئے یہ ضعیف ہیں (بمقابلہ مومنین کے) فتح مسلم کے لئے ہے۔

سپہ سالار اسلام نے بزدلوں کو حسب ذیل احکام الہی سنا کر اتمام حجت کی:-

وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ

ترجمہ:- جو شخص مقابلہ کفار میں بے ضرورت پشت دکھائے وہ ضرور غضب الہی میں گرفتار ہوگا، اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ جو نہایت خراب جگہ ہے

سلہ پارہ پنجم سورۃ النساء رکوع ۱۰

عسه پارہ نہم سورۃ انفال رکوع ۲

سپہ سالار اسلام نے یہ تینوں امور بیان کر کے اس کی تعبیر و توضیح مجاہدین کے ذہن نشین کی اور آخر میں کہا کہ اگر میں میدان میں کام آجاؤں تو میرے بعد محرز بن ثابت اور اس کے بعد سعید کو سپہ سالار بنایا جائے جنگ شروع ہوئی، مجاہدین فرداً فرداً میدان میں آئے۔ محرز بن ثابت نے سبقت کی اور بہت سے دشمنوں کو خاک و خون میں لٹا کر خود بھی شہید ہو گئے ان کے بعد سعید اور حسن بصری بالترتیب جنت سدھارے، یہ تین سرکردہ اور چیدہ بہادر تو کام آئے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ عربوں کی غیر معمولی شجاعت نے دشمنوں کو مرعوب کر دیا۔ راجہ داہر کے جنگی ہاتھیوں کا منہ پھیر دینا صرف عربوں ہی کا کام تھا اور یہ امر راجہ کے لئے کچھ کم حیرت انگیز نہ تھا، تمام دن ہنگامۂ کارزار گرم رہا اور شام کو دونوں فوجیں اپنے اپنے لشکر گاہ کو لوٹیں۔

اگلے روز پھر علی الصباح ہنگامۂ کارزار شروع ہوا، سپہ سالار اسلام نے فضیلت جہاد کا وعظ کہکر مجاہدین کے دل کو گرما دیا، ان کو امداد خداوندی کا امیدوار رہنے کی تاکید کی اور ہدایت کی کہ لاحول اور قرآن کریم کی آیات تلاوت کرتے رہیں،

سندھی فوج تعداد میں مسلمانوں سے زیادہ تھی۔ تاہم مسلمانوں کو اس امر کا بالکل خیال نہ تھا، کیونکہ ایک سے زیادہ مرتبہ ان کی قلیل فوج دشمن

کی کثیر فوج کو نیچا دکھا چکی تھی۔ ہر طرف سرفروشی اور جان فروشی کا بازار گرم تھا کہ اسی اثنا میں ایک غیر معمولی واقعہ رونما ہوا:۔

چند ہندو فوجی افسر عین اثنائے جنگ میں سپہ سالار کی خدمت میں حاضر ہو کر بطیب خاطر داخل اسلام ہوئے اور پھر اسلامی فوج کے ایک دستہ سے دشمن کی فوج پر پشت کی جانب سے حملہ آور ہوئے، سامنے سے اسلامی لشکر نے پُر زور ہلا کیا، اور اس طرح دو فوجوں کے درمیان گھر جانے کا جو اثر ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے۔ سندھی فوج گھبرا گئی، تاہم شجاع راجہ داہر کے تیور پر ذرا بھی میل نہ آیا، وہ دشمنوں کو دونوں طرف سے روکتا رہا۔

ایسے موقع پر ہندو افسروں کا بغیر کسی قسم کی تحریص و ترغیب کے مشرف بہ اسلام ہونا ان لوگوں کے لئے قابل غور ہے۔ جو اسلام کی روحانی معجز نمائی کے قائل نہ ہو کر ترقی اسلام کو صمصام سے منسوب کرتے ہیں!

اسلامی فوج میں ایک حبشی بہادر تھا، اس نے سپہ سالار اسلام کے سامنے قسم کھائی کہ جب تک راجہ داہر کو ٹھکانے نہ لگا لوں مجھ پر آب و طعام حرام ہے، وہ سیاہ گھوڑے پر سوار ہوا اور نہایت جاں بازی سے سندھی فوج کا مقدمہ اور قلب چیرتا ہوا عین راجہ کے سفید ہاتھی کے سامنے جا

کھڑا ہوا، گھوڑا ہاتھی کو دیکھکر بھڑکا مگر حبشی نے اس کی آنکھوں پر اندھیاری دے کر اُسے سنبھالا اور راجہ پر تیر تولا، لیکن اس سے قبل راجہ کا تیر اس کے لگا اور وہ خانۂ زین سے پشت زمین پر آ رہا، اگر اس وقت خود سپہ سالار اسلام مجاہدین کے قلوب کو نعرۂ تکبیر سے نہ گرما دیتا تو ممکن تھا کہ افواج اسلام پر اس واقعہ کا نامبارک اثر پڑتا۔ لیکن نہیں اس کا یہ اثر ہوا کہ معرکہ میں اور گرم بازاری ہوگئی۔ فریقین کے بہادر پہلے سے زیادہ پُرجوش ہوکر خونی مناظر اور زیادہ ہولناک بنانے میں مصروف ہو گئے صبح سے شام تک لوہا اور خون برستا رہا۔ سندھیوں نے فی الحقیقت نامردی اور شجاعت کا ثبوت دیا۔ لیکن اس کے بہادر تعداد میں بہت کم رہ گئے۔ چنانچہ شام کے وقت صرف ایک ہزار بہادر راجہ داہر کے ہمرکاب تھے اب راجہ اپنی بقیۃ السیف فوج کو ہمراہ لے کر قلعہ راوڑ چلا گیا۔ سپاہ اسلام یلغار کرتی ہوئی وہاں بھی جا پہنچی اور راجہ داہر اپنے ملک و قوم پر نثار ہو گیا یہ واقعہ ۱۰ ر رمضان المبارک ۹۳ھ کو رونما ہوا۔

سلہ یہ روایت افسانے سے زیادہ وقیع نہیں کہ راجہ داہر کی عماری میں آگ لگ گئی اور وہ اپنے ہاتھی کو پانی کی طرف لے گیا۔ اور اپنی عورتوں کو بچاتے ہوئے ہاتھی پر تہ تیغ ہوا۔

سے نکلتے اور دن بھر جنگ کرکے شام کو قلعے میں واپس لوٹ جاتے تھے محاصرے نے طول کھینچا، کامل چھ ماہ گزر گئے، محصورین کی کوشش سے مسلمانوں کا بیرونی سلسلہ بہ آسانی مسدود ہوگیا،

اس وقت ہند و سردار موکری تجویز کے مطابق اسلامی فوج راجہ جے سنگھ کے مقابلہ کو بھیجی گئی، راجہ وہاں سے بھی نکل گیا، اور برہمن آباد والوں پر اس کا برا اثر پڑا۔ اُن کی کمر ٹوٹ گئی، راجہ داہر ملک پر قربان ہوا جے سنگھ نکل گیا، سامان رسد ختم ہونے کو ہے۔ یہ امور برہمن آباد والوں کے لئے مایوس کن تھے، اگر دشمن نے قلعہ بزور شمشیر تسخیر کیا جو یقینی ہے تو وہی سلوک کیا جائیگا جو فاتح مفتوح کے ساتھ کرتا ہے، ان تخیلات نے انہیں ہتھیار رکھدینے پر آمادہ کیا، چنانچہ انھوں نے محمد ابن قاسم کی خدمت میں سفیر بھیجکر امان طلب کی، ان کی درخواست منظور کی گئی اور یہ لوگ راجہ جے سنگھ کے طعن و تشنیع کا نشانہ نہ بننے کی غرض سے خفیف سے مقابلہ کے بعد قلعے کا پھاٹک کھلا چھوڑکر شہر میں چلے گئے۔ حتی کہ مسلمان اس میں داخل ہوگئے۔ کہتے ہیں کہ رانی لادی اسی قلعے کی رانی تھی جو قید کی گئی

غلبہ کے بعد فاتح نے مفتوحین کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اور اس نو مفتوحہ ملک کا انتظام کس اصول پر کیا؟

(۱) محمد بن قاسم نے قلعہ برہمن آباد کو چار برہمنوں کی ولایت میں دیدیا،

جو راجہ داہر کے قریبی رشتہ دار تھے، انہیں چار اشخاص کی کونسل ہر قسم کا ملکی انتظام کرتی تھی۔

(۲) زمین کی مال گزاری کا قاعدہ مثل سابق بحال رکھا

(۳) سندہی مسلمانوں پر عام مسلمانوں کی طرح فوجی خدمت لازمی کی اور اُن کو عام مسلمانوں کے حقوق دئے

(۴) ہندوؤں پر بالعوض فوجی خدمت ایک ہلکا سا (سالانہ ٹیکس) مقرر کیا۔ اور انہیں فوجی خدمت سے مستثنےٰ کیا، اسی (ٹیکس) کا نام جزیہ[1] ہے

(۵) تمام ہندو رعایا کو مذہب اور مراسم مذہبی کی ادائگی میں آزادی دی گئی۔

نوٹ:۔ راجہ جے سنگھ مدت تک منہ چھپاتا پھرا، اول سندھ کے راجہ داہر کے پاس فقیرانہ لباس میں گیا، راجہ عزت سے پیش آیا مگر اسکی ایک رانی راجہ جے سنگھ پر فریفتہ ہوگئی، پس اس سے مایوس ہو کر بدنصیب راجہ پر عزت ریزی کا الزام لگایا، اس لئے جے سنگھ وہاں سے جان بچا کر بھاگا اور پنجاب آیا۔

---

[1] جزا کے معنی بدلا و عوض " جزیہ" کے معنی معاوضہ فوجی خدمت تفصیل کے لئے دیکھو علامہ شبلی رح کا رسالہ "الجزیہ"

(۶) وصولیت لگان کے معاہدے بدستور سابق نمبرداروں چودہریوں اور مقدموں سے کیئے گئے اور ان کو "امین" کا موزوں خطاب دیا گیا۔ یہ سب لوگ سندہی ہندو تھے، اور انہیں اسلامی حکومت کی جانب سے مشرقی طریق پر انعام واکرام دیے جاتے تھے، چنانچہ اُن کے ہاتھوں میں خالص سونے کے کڑے پہنائے جاتے اور عربی گھوڑے مع طلائی زین عطا کئے جاتے تھے،

(۷) زراعت صنعت وحرفت اور تجارت میں کسی قسم کی دست اندازی اور تغیر وتبدل نہیں کیا گیا، بلکہ دوران جنگ اور بدامنی کے زمانہ میں جن کاشتکاروں اور صناعوں کو نقصان پہنچا تھا، ان میں سے ہر ایک کو معاوضہ دیا گیا،

(۸) برہمن راجہ داہر کے ہم قوم اور ملازمت پیشہ تھے، اس لیئے ان کی خاص طور پر عزت افزائی کی گئی، چنانچہ تمام ملکی معزز عہدے ان کے لیئے مخصوص اور موروثی کردیئے گئے، مگر ان لوگوں کو تاکید کی گئی کہ مقررہ خراج سے زیادہ ستانی نہ کریں، انسداد رشوت کے احکام نافذ کیئے

حکومت خود اختیاری (سلف گورنمنٹ) کسے کہتے ہیں؟ یہی تو وہ شئے ہے، جو آج سے بارہ سو سال پیشتر محمد ابن قاسم نے اہل سندھ کو عطا کی تھی، ہاں یہی وہ عنقا ہے کہ صدی ڈیڑھ صدی کی تلاش وجستجو کے بعد بھی

اس کے آشیانہ کا پتہ نہیں ملتا،

تسخیر برہمن آباد کے سلسلے میں بدھ مندر کے پجاریوں کی عجیب وغریب درخواست کا واقعہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے، جب قلعہ میں ہر طرح سے امن وامان ہوگیا اور جدید حکومت نے رعایا کے ہر طبقہ کے ساتھ نہایت فیاضانہ اور تالیف قلوب کا سلوک کیا، تو وہاں کے سب سے بڑے مندر کے پجاریوں نے محمد ابن قاسم کی خدمت میں حسب ذیل مضمون کی درخواست پیش کی:۔

"حضور والا! آپ کی شفقت ومروت سے اہل حرفہ، کاشتکار، زمیندار، غرض کہ ہر طبقہ کی رعایا فیضیاب ہوئی ہے آپ نے ہرجانہ دے کر لوگوں کے نقصانات کی تلافی کی ہے، لیکن ہم لوگ آپ کی شفقت سے محروم ہیں، ہمارے مندر کا کچھ حصّہ اور ایک بُرج شکست ہوگیا۔ ہندو ادھر متوجہ نہیں ہوتے اس لیئے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ لوگ ان کے مندر میں آنے سے ناراض ہوں گے۔ اب مندر میں مثل سابق چڑھاوا اور نذر ونیاز نہیں آتی کہ ہماری بسراوقات ہو۔ اگر چندے یہی حال رہا تو ہماری فاقہ کشی میں کلام نہیں، پس آپ براہ کرم ہماری قوم کو حکم دیں کہ وہ لوگ مندر میں پوجا کے لیئے آیا کریں اور ہمیں

بدستور نذر و نیاز دیں، نیز مندر کی مرمت کا انتظام کریں"

پوجاریوں کی دو خواہشات تھیں:۔

(۱) مسلم حکومت ہندوؤں کو حکماً مندر میں بھیجے کہ وہ وہاں جاکر پوجا کریں اور بھینٹ وغیرہ چڑھائیں،

(۲) شکستہ مندر کی مرمت کا انتظام کرے،

یہ ہر دو امور کہ ہندو اپنے مندروں میں نہیں جاتے اور مندر کی مرمت بھی نہیں کراتے، سیاسی نقطۂ خیال سے مسلمانوں کے مفید مطلب تھے لیکن سپہ سالار اسلام محمد ابن قاسم نے (جو اسی قوم کا لیڈر تھا جو بت پرستی کی دشمن اور بت شکن، مندر شکن مشہور ہے) غریب پجاریوں کی تکالیف کا احساس کر کے احکام جاری کیئے کہ

"ہندو بدستور سابق بدھ کے مندر میں پوجا کے لیئے جایا کریں نیز نذر و نیاز اور چڑھاوا چڑھائیں اور مندر کی مرمت کریں"

اس حکم کی تعمیل ہوئی، مندر کی عمارت درست کی گئی، پوجا کرانے والے آنے لگے اور چند ہی روز میں اس کی رونق و عظمت پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی ~

یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطر محبت کی
کہ جن سے بوستان ہند برسوں تک معطر تھا

(شبلی مرحوم)

جاٹ سندھ کے اندر ایک جرائم پیشہ اور سرکش قوم تھی۔ رہزنی اور کشت و خون اس کی عام عادت تھی اور غارت گری اور سرقہ گویا وجہ معاش۔ محمد ابن قاسم نے اس قوم کا انتظام ہندو وزیر (سی ساگر) کے سپرد کر دیا، جس نے راجہ چچ اور راجہ داہر کے سابقہ قوانین اس قوم میں رائج کئے۔ جس کے مطابق قرار پایا کہ

(۱) جاٹ قوم کے اشخاص ایک خاص قسم کا لباس بطور شناخت و امتیاز پہنیں،

(۲) گھوڑے پر سوار نہ ہوں

(۳) اظہار شان دہقانی کی غرض سے موٹی چادر اوڑھیں اور کُتّے ساتھ رکھیں۔

(۴) سرکاری فوج کے لئے سامان رسد فراہم و مہیا کریں،

(۵) مال مسروقہ کے برآمد کرانے میں پولیس کو امداد دیں،

جب یہ ضوابط محمد ابن قاسم کے روبرو بغرض توثیق و تصدیق پیش ہوئے تو اس نے ان میں ایک کا اور اضافہ کیا:۔

(۶) جاٹ قوم کے افراد ہر ایک مسافر کو ایک روز، بیمار کو تین روز اپنے ہاں ٹھہرا کر انہیں کھانا کھلایا کریں،

اب اسلامی فوجیں آلور (حیدرآباد سندھ) کی جانب روانہ ہوئیں یہ

شہر سندھ کا مرکز راجدھانی اور مشہور جنگی مقام تھا اثنا سے راہ میں جو شہر آئے وہاں کے باشندوں نے اظہار عقیدت کیا اور فاتحین کے استقبال کے لئے اپنے قومی شعار کے مطابق کوئی سنکھ جھانجھ اور کوئی باجے بجاتا آیا الغرض درمیان میں کوئی دشواری سدراہ نہیں ہوئی اور اسلامی لشکر الور پہنچا،

یہاں کا حاکم فیوفی (ابن داہر) تھا۔ جو شجاعت و شہامت میں اپنے باپ کا خلف الرشید تھا، وہ محصور ہوکر آمادۂ جنگ ہوگیا۔ محاصرہ نے طول کھینچا، فیوفی مدت تک اپنی خاندانی عظمت وشجاعت کا ثبوت بہم پہنچاتا رہا، علاوہ ازیں اس نے اپنی رعایا کے ذہن نشین کیا کہ راجہ داہر ہنوز زندہ ہے، اور ہندوستان کے متعدد راجاؤں کی کمکی فوج لئے کوئی دم میں یہاں پہنچا چاہتا ہے، ان توقعات پر محصورین کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے اور وہ جان توڑ توڑ کر حملے کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کامل ایک ماہ گزرجانے پر بھی ہنوز قلعہ تسخیر نہ ہوا تھا،

اس پالیسی اور جنگی چال کا علم سپہ سالار اسلام کو بھی مل گیا، چنانچہ فوراً اس کا توڑ کیا گیا، مرحوم راجہ داہر کی رانی (لاڈہی) نے (جو اب محمد بن قاسم کی منکوحہ بیگم تھی) بلندی پر کھڑے ہوکر راجہ کی موت کی خبر دی، اور ایک ہندو جوگن نے اپنے علم کے ذریعے سے اس امر کی تصدیق کی،

یہ سن کر اہل قلعہ کی کمر ٹوٹ گئی۔ گردنیں جھک گئیں۔ شہزادہ فیوفی مع اپنے

عیال واطفال اور خزانہ ومال، رات کو وہاں سے چل دیا، صبح کو محاصرین نے
قلعہ پر قبضہ کرلیا، رعایا نے اظہار عقیدت کیا، اس لئے ان سب کو امان دی
گئی، اُن کے مال و دولت سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا، اور یہاں تک رواداری
کو جائز رکھا گیا، کہ جن فوجی اشخاص نے آخر دم تک سر نیاز نہیں جھکایا تھا
انہیں بھی رانی لادیبی کی سفارش سے معاف کر دیا گیا، الور (حیدر آباد سندھ)
ایک مالا مال اور تجارتی شہر تھا، جس میں کروڑوں روپے کی اجناس اور
سیم وزر موجود تھا، لیکن سپاہ اسلام نے اسے نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا، یہ
یہ واقعہ ان لوگوں کی توجہ کا محتاج ہے، جن کا قول ہے کہ ابن قاسم جیسے
مسلمان حملہ آوروں کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا، کہ مال و زر تخت و
تاراج کرے، اور بس!

بعد استحکام و انتظام الور اسلامی فوجیں مُلتان کی سمت بڑھیں،
قلعہ بابیہ سدراہ تھا، یہاں کا والی راجہ داہر کا چچا زاد بھائی کُکسیہ بن چندر[1]
کچھ عرصہ قلعہ بند ہو کر مقابلہ کرتا رہا۔ مگر بالآخر قسمت کو منحرف دیکھ کر سپہ سالار
اسلام کی خدمت میں حاضر ہو گیا، سپہ سالار اسلام اس کے ساتھ شاہانہ
مدارات سے پیش آیا، اور مہمات ملکی میں اسے اپنا مشیر بنا لیا، وزارت
خزانہ ومال کے مناصب بھی اسی کو عطا کیے۔ کُکسیہ نے اپنے عقیدتمندانہ

[1] یہ راجہ زبان سنسکرت کا عالم فاضل تھا،

طرزِ عمل سے اس قدر رسوخ حاصل کیا، کہ "شاہی مہر" بھی اس کی تحویل میں دے دی گئی،

اب دریائے بیاس مجاہدین کے روبرو تھا، اُسے عبور کرکے اسلامی فوجیں ملتان کے حدود میں جا پہنچیں، قلعہ اسکندرہ پر سات یوم متواتر تلوار چلتی رہی، خون کی ندیاں بہ نکلیں، لیکن بالآخر قلعہ دار مرعوب ہوکر فرار ہوگیا، اور قلعہ پر مجاہدین کا قبضہ ہوگیا، اس کے بعد قلعہ سلہ مسخر ہُوا۔ جو دریائے راوی کے جنوب میں واقع تھا، لیکن یہ قلعہ بھی بآسانی مسلمانوں کے قبضہ میں نہیں آگیا، بلکہ کامل سترہ روز تک دشمن قلعہ سے باہر نکل نکل کر جانبازانہ مقابلہ کرتے رہے، ڈھائی سو کے قریب مجاہدین شہید ہوئے جن میں پچیس افسر تھے،

ملتان کا معرکہ مجاہدین کوچ کرکے ملتان جا پہنچے، گھاٹ ہی پر دشمنوں نے آ روکا، ہندو افسر کا نام بجے رام تھا، جو صبح سے شام تک ہندو فوج کو لڑاتا تھا اور یہ سلسلہ کامل دو ماہ تک قائم رہا، گرانی غیر معمولی طور پر رونما ہوئی، گدھی کی سری پانسو درہم کو فروخت ہوگئی، مقابلہ برابر جاری تھا، اسی اثنا میں راجہ داہر کا عم زاد بھائی گورسیہ ولد چندر مرعوب ہوکر کشمیر کو فرار ہوگیا، تاہم باقی ہندو سردار اپنی فوج کو برابر لڑا رہے تھے، حتیٰ کہ ایک ملتانی ہندو نے سپہ سالار

اسلام کو موقعۂ سُرنگ بتایا، سُرنگ نکالی گئی اور اسی طرح قلعہ کشائی میں دو تین دن سے زیادہ صرف نہیں ہوسے، اس مہم کا تمام مال غنیمت محمد بن قاسم نے مجاہدین پر تقسیم کر دیا، اس لئے کہ انہیں یہاں غیر معمولی صعوبتیں رونما ہوئی تھیں،

سپہ سالار اسلام بیت المال میں خمس وغیرہ بھیجنے کے لئے مغدور تھا، کہ اسی اثنا میں ایک ہندو اس کی خدمت میں حاضر ہوا، اور جان بخشی و جاگیر طلب کر کے اس نے ایک قیمتی دفینہ بتا نے کا اقرار کیا، اس سے ان امور کا وعدہ کیا گیا، چنانچہ اس نے ایک قدیم دفینہ بتایا، جسے کھودنے پر اس میں سے حسب ذیل مال برآمد ہوا،

(۱) پچاس مکعب گز سونے کا ایک بت جس کا وزن (۲۳۰) من تھا

(۲) سونے کے چھوٹے چھوٹے بُت چھ ہزار

(۳) سونے کی چالیس دیگیں، جن میں سے سترہ ہزار دو سو من طلائے خالص برآمد ہوا،

(۴) جواہر و مروارید کا بیش قیمت ذخیرہ

چونکہ یہ دولت مال غنیمت سے علاوہ تھی، اور مال غنیمت تمام کا تمام مجاہدین میں تقسیم کیا جا چکا تھا، لہذا محمد ابن قاسم کا ارادہ تھا کہ دفینہ کا کل مال دارالخلافہ کو روانہ کر دیا جائے، لیکن جس روز یہ خزانہ روانہ ہوا، اسی روز

حجاج کا اُسے خط ملا، جس میں تحریر تھا کہ

"آئندہ جس قدر مال و دولت ہاتھ آئے، وہ دارالخلافہ نہ بھیجیں، بلکہ ہندوستان ہی میں" کارہائے رفاہ عام" اور تعمیر مساجد وغیرہ میں صرف کیا جائے۔"

یہ حجاج بن یوسف کا حکم ہے، یعنی اس مسلمان کا جو ظالم وجابر مشہور ہے، اس حکم سے اس قول کی واقعیت کا بھی اندازہ کرو کہ اعراب دولت اور خوبصورت عورتوں کے لئے حملے کرتے تھے،

اب محمد بن قاسم ملتان کے جنگی مقامات پر عرب سرداروں کو چھوڑکر خود شمالی پنجاب کی جانب متوجہ ہوا، اور حکیم شیبانی کو راجہ قنوج کے مقابلہ پر مامور کیا، یہ سُن کر راجہ بھی آراستگیٔ سپاہ، و استحکام قلعہ جات میں مصروف ہوا، لیکن حملہ قنوج سے پیشتر ہی حجاج نے وفات پائی (۹۵ھ) اور اسی وجہ سے سندھ وہند کی مزید فتوحات میں روکاوٹ پیدا ہوگئی، محمد ابن قاسم اس مہم کا ارادہ ترک کرکے روڑہی واپس پہنچا، اور بیلمان کو تسخیر کرتا ہوا کیرج (واقعہ جنوبی سندھ) پر جا پڑا، وہاں کا راجہ سرمیدان کام آیا،

محمد بن قاسم کی فتوحات ۹۳ھ میں اور اس کے بعد ہوئیں، جیساکہ بالتفصیل مذکور ہوا، اس وقت تخت خلافت کا مالک خلیفہ ولید عبدالملک تھا، پھر ۹۶ھ میں سلیمان بن عبدالملک خلیفہ ہوا،

محمد ابن قاسم کی موت کے متعلق ایک فرضی افسانہ مشہور ہے، جسے ہندو اہل قلم نے بار بار دوہرایا ہے، حالانکہ اگر وہ راست بھی ہو (وہ راست نہیں ہے) تو اس سے ہندو قوم کی کوئی تعریف نہیں نکلتی

غلط طور پر مشہور ہے کہ خلیفہ عبد الملک نے محمدؐ بن قاسم کو سندھ سے گرفتار کرا کے بہ عذاب الیم قتل کرایا اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ قاسم نے راجہ داہر کی جن لڑکیوں کو حرم سرائے خلافت کے لئے بھیجا تھا انھوں نے قاسم سے انتقام لینے کے لئے عبد الملک سے جاکر یہ جھوٹی شکایت کی، کہ اے خلیفہ اب ہم تیرے کام کی نہیں، کیونکہ ابن قاسم ہماری پہلے ہی عصمت دری کر چکا ہے، کہا جاتا ہے خلیفہ یہ سُن کر برہم ہوا، اور اس نے قاسم کو گرفتار کرا کے اُس کا سر قلم کرایا۔ اس کی کھال کھینچوا کر اس میں بھُس بھروایا، اور اسے جلایا، افسوس کہ تاریخ فرشتہ میں بھی یہ افسانہ درج ہے۔ یہ روایت سرتاپا غلط، اور بالکل لغو ہے، وجوہ ملاحظہ ہوں:۔

(۱) سندھ خلیفہ عبد الملک کے بعد فتح ہؤا، یعنی خلیفہ سلیمان کے زمانے میں۔

(۲) ابن قاسم، خلیفہ سلیمان کے حُکم سے گرفتار ہؤا، مگر مذکورہ بالا جُرم کی پاداش میں نہیں،

(۳) فرشتہ کو غلط فہمی ہوئی، اور اس سے فارسی اور دیگر مؤرخوں

نے اس افسانہ کو نقل کیا،

(۴) عربی مورخوں بلاذری الجیری وغیرہ نے اس افسانہ کا ذکر تک نہیں کیا

(۵) قاسم بعہد سلیمان بعلت بغاوت گرفتار کرایا گیا، سلیمان کے خلیفہ ہونے سے پیشتر ابن قاسم کے سرپرست حجاج نے سازش کی تھی، کہ وہ خلیفہ نہ ہو، اور ابن قاسم بھی اس میں شریک تھا، پس جب سلیمان خلیفہ ہوا، تو اس نے تمام سازشیوں کو سزا دی، اور قاسم بھی نہ بچ سکا، پس بہرحال یہ افسانہ غلط ہے کہ داہر کی بیٹیوں نے ابن قاسم کی جھوٹ موٹ شکایت کی، اور خلیفہ نے اُسے گرفتار کرا کے قتل کرا دیا،

ایک روایت یہ ہے کہ محمد ابن قاسم، صالح بن عبدالرحمن کی تلوار سے شہید ہوا، جس کے بھائی کو حجاج نے تہ تیغ کیا تھا،

محمد ابن قاسم کی مہمات مذکورہ بالا سے ظاہر ہوتا ہے، کہ وہ نہایت شجاع، دل چلا، منتظم اور فیاض طبع تھا، وہ سختی کی بجائے نرمی اور انتقام کے مقابلہ میں معافی اور فیاضی سے کام لیتا تھا۔ تعصب اس کو چھُو تک نہیں گیا تھا، دیکھو اس نے اہل سندھ کے ساتھ کیسا رواداری اور فیاضی کا سلوک کیا

محمد ابن قاسم کے زمانہ میں سندھ کے اندر اسلام کافی پھیل چکا تھا اور وہاں کے بودھیوں اور برہمنوں نے بطیب خاطر اسلام قبول کر لیا تھا،

قاسم کے بعد سندھ کی امارت پر یزید بن کثیر مامور ہؤا اور اس کے بعد حبیب بن مہلب، مگر اس وقت ہندو سردار تمرود کھانے لگے تھے، حبیب صرف روڑ ہی کے سرکشوں کو سیدھا کر سکا،

صفر ۹۹ھ میں خلیفہ سلیمان نے وفات پائی اور اپنا جانشین فاروق ثانی (عمر بن عبدالعزیز) رضی اللہ عنہ کو چھوڑا۔ خلافت میں برقی رفتار سے خوشگوار انقلاب ہؤا۔ خلفاء راشدین کا زمانہ از سرِ نو عود کر آیا، ان کو جنگ و جدال زیادہ پسند نہیں تھا، اس لئے انھوں نے جنگی مہمات کی بجائے راجگان سندھ کی خدمت میں اسلامی مشن بغرض تبلیغ بھیجے، جنہیں معقول کامیابی ہوئی، بعض راجاؤں نے خوشی خوشی اسلام قبول کیا، چنانچہ راجہ داہر کا بیٹا جے شب (یا جیشیہ) معہ چند دیگر رؤساء کے اسلام لایا۔ اور ان کے ساتھ ہزاروں ہندو مسلمان ہوئے۔ دیگر راجہ بھی ایمان لائے ان کی رعایا نے بھی دامن اسلام میں پناہ لی، کیونکہ اس زمانہ میں کسی راجہ یا بادشاہ کے تبدیل مذہب کے معنی یہ تھے۔ کہ اس قوم نے مذہب تبدیل کیا

تاریخ اسلام میں یہ ایک عجیب امر نظر آتا ہے۔ کہ جب مسلمانوں کی فتوحات کا زور ہوتا ہے۔ تو اشاعت اسلام رُک جاتی ہے۔ لیکن جب مسلمان بظاہر مغلوب ہو جاتے ہیں۔ تو اسلام اقوام عالم میں اس طرح پھیلتا ہے، جس طرح بن میں آگ۔ انگریزی عہد حکومت بھی اس کی تائید کرتا ہے، سلطنت مغلیہ کا

خاتمہ ۱۸۵۷ء میں ہوتا ہے۔ انگریزی عہد میں ۱۸۸۱ء میں پہلی مردم شماری ہوتی ہے تو مسلمان پانچ کروڑ شمار ہوتے ہیں پھر ۱۸۹۱ء میں پانچ کروڑ ستر لاکھ اور پھر ۱۹۰۱ء میں چھ کروڑ بیس لاکھ اور ۱۹۲۱ء میں چھ کروڑ ستر لاکھ ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آج اُن ملکوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے، جہاں اُن کی ایک روز بھی حکومت نہیں ہوئی، مثلاً حبش، سیلون، برما اور اس کے مقابلہ میں جہاں صدیوں تک حکمران رہے، ایک بھی مسلمان نہیں، مثلاً سپین خود ہندوستان میں یہ حال ہے کہ نواح دہلی (جو مرکز حکومت تھا، اور جہاں اورنگ زیب موجود تھا) وہاں آج بھی غالب تعداد غیر مسلموں کی ہے،

تو کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ اسلام بزور شمشیر نہیں پھیلا جیسا کہ اسلام کے حاسد کہتے ہیں، بلکہ اس کی اشاعت کا سبب ایک ہی تھا، یعنی اس کی صداقت، ہاں اس نے اقوام عالم کو اپنی اسی شمشیر سے مغلوب کیا، یہی حال سندھ کا ہوا، یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پُر امن زمانہ میں قاسم سے زیادہ اسلام سندھ میں پھیلا۔ ۱۰۵ھ تک فتوحات ہند و سندھ رُکی رہیں، خلیفہ ہشام نے جنید بن عبدالرحمن المری کو فتوحات سندھ پر مامور کیا جس نے عمر بن مسلم الباہلی سے چارج لیا۔ جنید فتوحات کو وسعت دینے کا آرزومند تھا، اس وقت مسلمانوں کی حکومت دریائے سندھ تک تھی، جنید نے دریا کو عبور کرنا چاہا، مگر اسے بجے شب کے علاقے سے گزرنا پڑتا تھا، جو

مسلمان ہو چکا تھا، پس اُسے خوف ہُوا کہ کہیں جنید اس کے مُلک پر قابض نہ ہو جائے۔ اس لئے اس نے آگے بڑھکر حریف کو روکا۔ اور کہا ہم تو مسلمان ہیں۔ اور خلیفہ عبدالعزیز نے یہاں کی حکومت ہمارے سپرد کی ہے!

یہ سُنکر جنید نے ضمانت پیش کی، کہ اس کے ملک پر قبضہ نہیں کیا جائے گا، راجہ نے بھی ضمانت دی۔ مگر راجہ بالآخر مُرتد ہوکر آمادۂ جنگ ہو گیا، اب ایک دوسرے نے ضمانتیں واپس کر دیں۔ راجہ نے ہندو بہادر اور ہندو فوج لے کر جنید کی فوج سے جنگ کی۔ مگر شکست کھائی۔ اور گرفتار ہو کر قتل ہُوا مگر قصّہ ارتداد تنقید طلب ہے۔

راجہ کے بھائی ججے نے چاہا۔ کہ وہ کسی طرح بچکر عراق چلا جائے اور وہاں والی عراق خالد قسری کے روبرو اپنا اور جنید کا مقدمہ پیش کرے۔ مگر وہ بھی جنید کے ہاتھ سے تہ تیغ ہُوا،

اب جنید جانب جنوب بڑھا، تاکہ راجۂ گجرات کو (جو جادۂ اطاعت سے منحرف ہو گیا تھا) تنبیہہ کرے، راجہ نے راجگان ہند کی افواج کے ساتھ جانبازانہ مقابلہ کیا، ہندوؤں نے قومی اور مذہبی جوش کا کامل ثبوت دیا،

لیکن ان کے حق میں کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلا، چنانچہ مسلمانوں نے گجرات فتح کر لیا۔ اب (بہار راجہ) جنید یلغار کرتا ہُوا شہر بروج تک جا پہنچا، اور کچھ کاٹھیاواڑ مغربی و شمالی حصص راجپوتانہ بہار اسٹیٹ اور شمالی میں وسط پنجاب جھنگ شور کوٹ

تک کا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ و تصرف میں آگیا،

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد خلفائے بنی امیہ میں سے کسی ایسے دوسرے خلیفہ کا نام معلوم نہیں، جس نے ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کی کوشش کی ہو پس اسلام نے یا تو خود بخود اپنا رستہ صاف کیا، یا طالبان حق نے خود آگے بڑھکر دستگیری کی خواہش کی، یا علماء، مشایخ اور تجار نے اپنا فرض تبلیغ ادا کیا،

تاہم سندھ میں اسلامی مرکز قائم ہو چکا تھا، اور اس کے قیام نے اس کے اطراف میں روشنی پھیلانے کا خوب کام کیا،

منصور کے زمانے میں سندھ کا شہر گندھار فتح ہوا، اور وہاں ایک مسجد تعمیر ہوئی، جس کا نتیجہ نہایت مبارک ہوا، اسلام کا خوب غلبہ ہوا، وہاں کے لوگوں نے مسجد کو مایۂ خیر و برکت سمجھا اور اُسے متبرک مانا،

بنو عباس کے زمانہ میں مسلمانوں کی توجہ سندھ کی طرف ہوئی، اور اس وقت یعنی ۸۰ھ میں واصل بن عطا نے علم الکلام کی بنیاد ڈالی،

جہم بن صفوان کی ایک بودھ مذہب کے عالم سے گفتگو ہوئی، جس نے مناظرے کا رنگ اختیار کیا،

بدھ مت کے عالم نے جو خدا کی مستقل ہستی کا قائل نہ تھا جہم سے سوال کیا کہ تمہارا خدا پانچوں حواسوں سے تو معلوم نہیں ہوتا، پھر تم نے خدا کی ہستی کیونکر دریافت

کی - اور ہم اس کا کیونکر یقین کریں،
جہم لاجواب ہوا۔ مگر اس نے واصل کو یہ واقعہ لکھا، اس نے کہا کہ اس سوال کا جواب بالکل آسان ہے، آدمی کے پاس حواس خمسہ کے علاوہ علم اور معرفت کی ایک شے دلیل بھی ہے، چنانچہ دیوانہ، ہوشیار، زندہ اور مُردہ میں بظاہر کوئی فرق نہیں۔ پس یہ باتیں صرف دلیل ہی سے معلوم ہوتی ہیں،
بودھ عالم نے یہ جواب پسند کیا۔ مگر کہا یہ تمہارے دماغ سے پیدا نہیں ہوا، جہم نے واصل کا نام لیا۔ اور بودھ عالم اس کے بھی پاس گئے، گفتگو کی اور بالآخر مسلمان ہو گئے۔

ایسے بہت سے واقعات سندھ میں پیش آتے رہے، اسی طرح اشاعت اسلام کا لاتناہی سلسلہ جاری رہا، اور روزافزوں ترقی ہوئی راجہ، امراء، شریف خاندان اور عوام الناس داخل اسلام ہوئے، اور ان میں سے اکثر نے اشاعت اسلام میں غیر معمولی دلچسپی لی، اور وہ اسلام کے حق میں نہایت مبارک ثابت ہوئے۔

آمدم برسر مطلب۔ جنید کا منصوبہ یہ تھا، کہ وہ تمام ہندوستان کو تسخیر کرے۔ اور آثار سے اس کی کامیابی یقینی تھی، لیکن اسی اثناء میں اس کی خدمات کی ضرورت خراسان (ترکستان) میں رونما ہوئی، چنانچہ وہ ۱۱۱ھ میں اس مہم کے تہیہ کے لیئے خراسان روانہ ہوگیا، اور معاملات سندھ پر اس کی بجائے

تمیم بن زید مامور ہوا۔ لیکن سندھ ہی میں اسلامی فتوحات رُک گئیں۔ اس لئے کہ تمیم اس کا اہل نہ تھا۔ خلیفہ ہشام بھی خلقاً صلح جو اور امن پسند تھا۔ قتل و خونریزی کو بہ نگاہ کراہیت دیکھتا تھا۔ اتفاق سے اُسے تمیم وغیرہ گورنر بھی اسی مزاج کے ملے، جس کا نتیجہ سندھ میں مسلمانوں کا سیاسی زوال تھا۔

تمیم کا جانشین حکم بن عوام الکلبی ہوا، ۱۲۵ھ میں ہشام نے وفات پائی۔ ولید بن یزید اس کا جانشین ہوا، مگر ۱۲۶ھ میں پاداش معاصی میں تہ تیغ ہوا۔ اس کے عہد میں بھی بیرونی فتوحات بند رہیں۔ راجگان ہند جو مسلمانوں کے باجگذار تھے یکے بعد دیگرے تمرد دکھانے لگے۔

ولید کے بعد اس کا لائق فرزند یزید وارث حکومت ہوا۔ لیکن چھ ماہ سے زیادہ خلافت نہ کر سکا، پینتیس سال کی عمر میں انتقال کیا۔

اس کے بعد عالم انتزاع اور خانہ جنگی رہی، جس کا سلسلہ ۱۲۷ھ تک پہنچا۔ جب مسلمانوں کے مرکز میں یہ گُل کھل رہے ہیں تو ہندوستان میں اسلامی طاقت کو کیوں نہ زوال ہوتا۔ سندھ کے مسلمان اپنی حفاظت کے تہیہ میں مصروف ہوئے۔ حکم بن عوام الکلبی گورنر سندھ نے بغرض مدافعت و حفاظت بطور حفظ ماتقدم سندھ میں جدید چھاؤنیاں قائم کیں۔ ان کو مورچوں اور خندقوں وغیرہ سے مستحکم کیا۔ اکثر امرائے اسلام اور عام مسلمانوں نے اسی مامن میں آ کر پناہ لی۔ جن میں بہادر عمر بن محمد بن قاسم بھی تھا، چونکہ عمر شجاعت اور قوت انتظامی

میں اپنے نامور اور فاتح باپ کا خلف الرشید تھا، اس لئے اس جدید چھاؤنی کا چارج اُسے دیا گیا۔ یہ انتخاب نہایت موزوں تھا۔ عمر کو ہندو فوجوں سے بارہا مقابلہ کرنا پڑا، لیکن اس کے دشمنوں نے ہر بار مُنہ کی کھائی

اب مسلمانوں کی یہ حالت تھی، کہ دارالخلافہ سے انہیں کسی امداد کی توقع نہ تھی۔ سندھ کا ذرہ ذرہ ان کی جان کا خواہاں تھا، ملک کے اصلی وارث اُن کے خارج کرنے کے لئے ناخنوں تک زور خرچ کر رہے تھے، نتیجہ یہ تھا۔ کہ گو یہ فاتحانہ حیثیت نہ رکھتے تھے (جو ان کے بزرگوں کو حاصل تھی) تاہم وہ زمین کے اس قطعہ پر اپنی قوت بازو سے فرور قابض تھے، جو ان کے بزرگوں کی وسیع فتوحات کی یادگار تھا، سندھ میں مسلمانوں کی یہ حالت عباسیوں کے عہد تک رہی، عبداللہ (سفاح) کا عہد بھی اسی صورت میں گزرا، سندھ پر عربوں کا ایک صدی سے زیادہ مدت قبضہ رہا، دارالخلافہ سے کوئی مہم سندھ و ہند کو نہ آسکی،

۱۴۳ھ میں خلیفہ منصور نے عمر بن حفص کو فتوحات سندھ کے لئے نامزد کیا۔ اور کچھ عرصہ بعد عباس سندھ پر مسلط ہو گئے۔ منصور کے بعد مہدی خلیفہ ہوا۔ اس نے ۱۵۹ھ میں ایک جہازی بیڑا خلیج فارس کے رستے فتح سندھ کے لئے روانہ کیا۔ اس کے ساتھ باقاعدہ فوج کے علاوہ مجاہدین (والنٹیرز) بھی تھے صاحب جہاز عبدالملک بن شہاب المسمعی تھا،

مسلمانوں نے شہر باربد کو تسخیر کر کے سندھ میں از سرِ نو اسلامی رُعب قائم کر دیا، لیکن اس شہر میں فتوحات کو ایسی وسعت نہیں ہوئی، تاہم سابقہ خراج گزار راجاؤں نے پھر سر نیاز خم کر دیا، اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ اس وقت اسلامی فوجیں روم اور خراسان میں مصروف تھیں۔ سنہ ۱۶۹ھ میں مہدی نے وفات پائی، اس کے جانشین ہادی کی یک سالہ حکومت میں بھی فتوحات سندھ کا سابقہ رنگ رہا،

سنہ ۱۷۰ھ میں مشہور خلیفہ ہارون الرشید تخت خلافت کا وارث ہوا۔ لیکن اس کی توجہ زیادہ تر یورپ اور افریقہ کی جانب منعطف رہی، اس لئے سندھ میں کوئی عظیم الشان کارروائی نہ ہو سکی، البتہ مغربی ہند کے راجہ اس کے خراج گزار تھے، مامون الرشید اور معتصم باللہ کے عہد خلافت میں بھی تقریباً یہی حال رہا،

سنہ ۲۲۷ھ میں معتصم باللہ نے وفات پائی۔ اور اس حادثہ کے ساتھ عباسیوں کا زوال شروع ہوا۔ سندھ کا جس قدر حصہ مسلم گورنروں کے ماتحت تھا، اس پر اسلامی نشان لہراتا رہا۔ مگر زمانہ شناس ہند و راجگان نے اپنے کندھوں کو خلافت کے جوئے سے ہلکا کر لیا۔ مگر بعد ازاں اس حالت پر قناعت نہ کر کے مسلمانوں کو دبانا اور ان کے علاقے چھیننا شروع کئے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کے پاس صرف چند چھاؤنیاں اور تھوڑی سی زمین رہ

گئی۔ سندہی نومسلم یا تہ تیغ کئے گئے، یا جلا وطن، کچھ لوگ مرتد بھی ہوئے یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن شجاعان عرب نے اپنی قوت بازو پر اپنی مختصر سی اسلامی ریاست کو سندھ میں قائم رکھا، یہی جمعیت تھی، جو عربوں کے خروج کے وقت سندھ میں موجود پائی گئی۔ مورخ ہند لکھتا ہے، کہ

"۲۵۰ھ میں راجپوتوں نے مسلمانوں کو سندھ سے نکال دیا"

مگر ۴۲۸ھ تک" سندھ ہندوؤں کے قبضہ میں نہیں آیا"

اس ایہام و اجمال کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے،

تمام واقعات تمہارے روبرو ہیں۔ اب تم ہی انصاف کرو، کہ آیا اعراب ہند و سندھ پر غارت گران دولت و حسن کی حیثیت سے حملہ آور ہوئے، یا انھوں نے فاتحانہ پیش قدمی کی۔ آیا ان کے حملوں کے خاص وجوہ تھے، یا خواہ مخواہ اٹھ دوڑے تھے، بالتفصیل معرض تحریر میں آچکا ہے، کہ وہ آسانی سے ملک پر قابض نہیں ہو گئے۔ سندھ حلوائے بے دود نہ تھا بلکہ لوہے کا چنا تھا، قدم قدم پر مسلمانوں کی مزاحمت تلوار سے کی گئی، ملک ملت کے حامیوں نے کامل شجاعت، کامل جوش سے قومی و مذہبی رنگ میں متفقہ قوت سے جان بازانہ اور دلیرانہ مقابلہ کیا۔ لیکن وہ مشیت ایزدی کو کیا کرتے!

تم نے دیکھا، کہ جس سرکش اور گستاخ سے گستاخ دشمن نے مسلمانوں

کے سامنے سر نیاز جھکا دیا۔ اُس کی جانب دست اُلفت بڑھایا گیا۔ سینکڑوں تاج بخشیاں کی گئیں۔ باغیوں تک کو بالکل معاف کردیا گیا۔ جزیہ اور خراج پر رعایا کو امان دی گئی۔ رفاہ عام پر توجہ کی۔ مندروں کی تعمیر کا حکم دیا۔ رعایا کو مذہبی آزادی دی، اس سے زیادہ یہ کہ رعایا کو حکومت خود اختیاری اور حکومت میں حصّہ دیا گیا۔ ان پر شریفانہ اعتماد کیا گیا،

انگریز مؤرخ تاریخ ہند میں لکھتا ہے، کہ:۔

"ہندوؤں کی دلیرانہ طبیعت بار بار جوش میں آتی تھی۔ سلطنتوں کا فوجی انتظام بہت اچھا تھا۔ وندھیاچل کے شمال کی طرف تینوں دریاؤں کی وادیوں میں ہندو راجہ حکمران تھے۔ شمال مغرب میں سندھ کے میدانوں میں اور دریائے جمنا کے اُس پار ہندو راجاؤں ہی کا زور تھا۔ بہار سے گنگا کی جنوبی وادی تک پال خاندان کی حکومت تھی۔ وندھیاچل ہندوستان کو دو حصص میں تقسیم کرتا تھا۔ اور مشرقی اور وسطی طبقے میں پہاڑی جنگجو قومیں آباد تھیں ساحل بمبئی کی مغربی حد پر مالوے کی ریاست واقع تھی۔ ہند کے جنوب میں کئی بہادر ہندو راجہ حکمران تھے"،

اس بیان سے بھی ہمارے دعوے کی تائید ہوتی ہے بے شبہ ہند و سندھ میں ہندو قوت کامل عروج پر تھی اور یہ بھی سچ ہے۔ کہ اہل ہند نے فی الحقیقت جانبازانہ جوش کا نمونہ دکھایا، مگر خدائی تائید کا کیا جواب؟ اور

مجاہدین اسلام کا جوش فرو کرنے والی چیز اُن کے پاس کہاں تھی! اعراب باوجود اپنی قلت تعداد کے دشمنوں کے ٹڈی دل کو زیر و زبر کرتے ہوئے فاتحانہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ کیونکہ سوائے خدائی طاقت کے (جو گویا ان کی تائید میں تھی) کوئی طاقت ان کو خائف نہیں کر سکتی تھی۔

انگریز مؤرخ تاریخ ہند لکھتا ہے۔ کہ

"اس سے پہلے کہ اسلام کا زور ہندوستان میں ہو، مسلمان ہندوکش کے مغرب تک کُل ایشیا افریقہ اور جنوبی یورپ میں فرانس اور سپین تک جا چکے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندو سندھ کی مزاحمت، اعراب مجاہدین کی فتوحات میں سدراہ ہوئی۔ حقیقت نفس الامری یہ ہے، کہ مسلمان یورپ، افریقہ اور دیگر حصص ایشیا کی فتوحات میں اس قدر منہمک رہے، کہ وہ سندھ و ہند کے دور دراز ملک پر مسلسل توجہ منعطف نہ کر سکے۔ دیکھو کسی خلیفہ نے بذات خاص ادہر حملہ نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا۔ کہ خشکی یا تری کے رستہ مہمات بھیجیں۔ جس کی تفصیل اوپر گزاری۔ پس وجہ تاخیر فتوحات ہند و سندھ اس کے سوا اور نہ تھی، کہ مسلمان دیگر ممالک کی فتوحات میں مصروف ہو جاتے تھے، اس زمانہ کے ہندو بہادر ضرور تھے۔ اور انھوں نے ہر موقع پر جان بازی اور قومی حمیت کا ثبوت دیا۔ پھر جب وقتاً فوقتاً انھوں نے دیکھا کہ اسلامی دار الخلافہ دوسرے اہم معاملات میں مصروف ہے۔ اور فی الحال ادہر

توجہ نہیں ہو سکتی، تو انھوں نے زمانہ شناسی سے کام لے کر تمرد دکھایا، مسلمان فاتحان سندھ کو آنکھیں دکھائیں، بایں ہمہ یہ نہیں کہا جا سکتا، کہ اہل ہند کی شجاعت براہ راست مجاہدین اسلام کی سدراہ ہوئی!

سندھ کے راجاؤں کو جیسے جیسے اسلام سے واقفیت ہوتی گئی۔ ان کا میلان طبع ادہر ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ ایک راجہ کو اولاد رسولؐ سے غایت درجہ کی عقیدت و محبت ہوگئی

جب سادات علویہ نے منصور عباسیہ کی خلافت میں خروج کیا اور ان کو کچھ کچھ کامیابیاں ہونے لگیں تو محمد علوی کے فرزند عبداللہ اشتر نے اپنے باپ کے حکم سے سندھ کا رخ کیا،

اس وقت ایک عرب (عمر بن حفص) سندھ کا والی تھا۔ اس نے عبداللہ کا استقبال نہایت شان سے کیا۔ اور سندھ میں عباسیوں کی بجائے علویوں کی حکومت کا اعلان ہونیوالا تھا۔ سیاہ علموں کی جگہ سپید علم لینے والے تھے۔ کہ دفعتاً علویوں کو شکست ہوئی۔ اور ساری تجویز خاک میں مل گئی۔ عبداللہ نے اپنے مہربان میزبان سے کہا۔ کہ اب میری جان تمہارے ہاتھ میں ہے۔ عمر نے اس کی تسلی و تشفی کی۔ اور کہا کہ یہاں سندھ میں ایک بہت بڑا راجہ ہے، جسے رسولؐ کریم اور ان کی اولاد کے ساتھ بے حد عقیدت ہے، تم اس کے پاس چلے جاؤ۔ بالکل محفوظ رہو گے۔

عبداللہ نے اس پر عمل کیا، راجہ نے اُن کا خاص احترام کیا، وہ باعزاز تمام راجہ کے پاس رہنے لگے، حتیٰ کہ رفتہ رفتہ ان کے چار سو طرفدار زیدی بھی ان کے پاس آ جمع ہوئے

منصور کو ان واقعات کی اطلاع ہوئی۔ تو اس نے عمر کو سندھ کے مشرقی سے ہٹا کر افریقہ کے مغرب میں والی بنا کر بھیجدیا۔ ادہر راجہ نے محض اہلبیت کی خاطر منصور ایسے باجبروت بادشاہ کی خفگی کی پروا نہیں کی۔ سندھ کے ایک راجہ نے خلیفہ ہارون الرشید کو حسب ذیل خط لکھا۔

"آپ ایسے گروہ کے سردار ہیں۔ جو انصاف پسند نہیں۔ وہ صرف تقلیدی مذہب رکھتے ہیں اور تلوار سے غلبہ پاتے ہیں۔ اگر آپ کو اپنے مذہب کی صداقت کا یقین ہو۔ تو کسی کو میرے پاس بھیجو۔ جس سے میں مناظرہ کروں اگر حق آپ کی طرف ہوا۔ تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ ورنہ آپ میرے مذہب میں آ جائیے۔

رشید نے ایک محدث راجہ کے پاس بھیجے، دربار کے پنڈت نے راجہ کی طرف سے محدث سے سوال کیا۔ کہ آپ کا خدا علی الاطلاق ہے، یا نہیں؟ محدث نے جواب دیا، بیشک ہے؟

پنڈت تو کیا وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ اپنا مثیل پیدا کرے اگر نہیں کر سکتا، تو وہ قادر علی الاطلاق نہیں ہوا۔

محدث، یہ کلامی مباحث ہیں اور ہم ان میں پڑنا بدعت سمجھتے ہیں،

پنڈت، (راجہ سے) میں نے یہی عرض کیا تھا،

اب راجہ نے ہارون الرشید کو لکھا۔ کہ پہلے تو صرف میرے دربار کے پنڈت ہی کہتے تھے۔ کہ اسلام مدلل مذہب نہیں ہے۔ اور مجھے اس بات کا یقین نہیں تھا۔ مگر اب تو اس واقعہ سے اس امر کی تصدیق ہوگئی،

اس وقت تک ہارونی دربار میں محدثین کا دور دورہ تھا۔ اور علم الکلام کے عالم کس مپرسی کے عالم میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ اب اُن کی طلبی ہوئی۔ خلیفہ نے ایک نوعمر متکلم کے سامنے راجہ کا سوال پیش کیا۔

اس نے جواب دیا۔ کہ امیرالمومنین! یہ سوال ہی غلط ہے۔ کیونکہ جو مخلوق ہوگا وہ حادث ہوگا وہ مثل قدیم نہیں ہوسکتا۔ پس یہ سوال، کہ خدا جو قدیم یعنی ازلی و ابدی ہے، وہ اپنا مثیل پیدا کرسکتا ہے۔ یا نہیں؟ ایسا ہے جیسے کوئی یہ سوال کرے، کہ کیا خدا اپنے آپ کو عاجز یا جاہل بھی بنا سکتا ہے یا نہیں "؟

اب ایک متکلم راجہ کے پاس بھیجا گیا، جس کا نام معمر تھا۔ حریف پنڈت اُن کی شہرت پہلے ہی سُن چکا تھا۔ اس نے دل میں کہا، کہ اگر یہ یہاں تک آ پہنچا، تو پھر خیریت نہیں، اس لئے اس نے رستہ ہی میں معمر کو زہر دلوا دیا

سندھ[1] اور ہندوستان میں اسلام کا خاص احترام کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوؤں نے جب کبھی مسلمانوں کو سندھ کے کسی علاقہ سے بے دخل کیا، تو اکثر مساجد کا احترام قائم رکھا، اور وہاں کے مسلمانوں کے جمعہ جماعت میں خلل نہیں ڈالا۔

ایک مسلمان افسر نے مامون المتوفی ۲۱۸ھ کے عہد میں سندان (واقع کچھ) فتح کیا، مگر ہندوؤں نے اُسے جلد ہی واپس لے لیا۔ مگر وہاں کی مسجد کو علی حالہٖ چھوڑ دیا۔ اور وہاں مسلمانوں کی خاص تعداد رہ گئی تھی، جو اس میں نماز ادا کیا کرتی اور خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتی تھی۔[2]

سندھ کے جو حکماء اور اطباء ہارون الرشید اور مامون کے زمانے میں بغداد گئے، ان میں سے جہاں بعض اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے وہاں بعض نے دین اسلام قبول کیا۔ ان میں سے ایک حکیم کا نام صالح بن بہلہ ہندی تھا۔ سندھ کے بہت سے نومسلموں نے علوم و فنون حاصل کر کے بلند رتبہ پایا۔ تاریخ میں ان کے نام موجود ہیں۔ ایک سندھی عالم جو پہلے غلام زادے تھے، سندھ سے مدینہ گئے۔ وہیں طرح اقامت ڈالی۔ فن مغازی سیر

---

[1] ذکر المعتزلہ، یحییٰ زیدی طبع حیدرآباد دکن صفحہ ۲۲ (منقول از رسالہ معارف نمبر ۲ جلد ۱۲)

[2] بلاذری یورپ صفحہ ۴۴۶

میں امام الفن کہلائے۔ ان کے ہزاروں شاگرد تھے، ان کی نماز جنازہ ہارون الرشید نے پڑھائی۔ ان کا نام ابو معشر نجیح سندھی تھا۔ اسفرائینی ایران پہنچے۔ فن حدیث کے باکمال اُستاد تھے۔ ان کا وطن سندھ اور اصلی نام رجاء السندہی تھا۔ ان کے خاندان میں بہت سے حفاظ حدیث ہوئے۔

مشہور ادیب ابوالعطا سندہی تھا۔ عربی زبان کا مشہور شاعر کشاجم سندہی بن شاہک کا فرزند تھا۔ جو بغداد کے پُل پر فروکش ہوئے تھے۔ ابو نصر فتح بن عبداللہ جو مشہور متکلم تھے۔ سندہی الاصل تھے،

خاص ہندوستان میں (جہاں کوئی اسلامی حکومت نہ تھی) وہاں مسلمان تاجر موجود تھے۔ جو اشاعت اسلام سے غافل نہ تھے۔ ہندوستان، کشمیر، ملتان اور کابل کے مابین ایک شہر تھا۔ جس کا نام عربی تاریخ میں شہر عسیفان آتا ہے (مقام کا نام معلوم نہیں ہوا۔ غالباً پنجاب کا کوئی شہر ہوگا) اس شہر میں ایک بہت بڑا بودھ خانہ (بُت خانہ) تھا۔ جس کا معتقد وہاں کا راجہ بھی تھا۔ اور یہ مندر کے پوجاریوں کو بڑے بڑے نذرانے دیا کرتا تھا۔

اتفاق سے اس راجہ کا بیٹا بیمار پڑا۔ راجہ نے پُجاریوں سے کہا کہ تم سب مل کر اپنے بُت سے میرے بیٹے کی صحت کی التجا کرو۔ پوجاریوں نے اس حکم کی تعمیل کی اور راجہ کو شہزادہ کی صحت کا مژدہ سُنایا۔ مگر مریض جلد ہی مر گیا جس کی وجہ سے راجہ کو اپنے مذہب سے سخت نفرت ہوگئی۔ چنانچہ اس

نے بُت خانہ ہموار کرا کے بودھ کی مورت کے پرخچے اُڑا دیے، پجاریوں کو قتل کر ڈالا۔

اس کے بعد راجہ نے اپنے دربار میں مسلم تاجروں کو طلب کیا جنہوں نے راجہ کے سامنے توحید پیش کی۔ اور راجہ مسلمان ہوگیا۔ یہ واقعہ خلیفہ معتصم باللہ المتوفی (۲۲۷ھ) کے عہد کا ہے۔ راجہ کو مسلمان دیکھکر یقیناً وہاں کی رعایا بھی داخل اسلام ہوگئی ہوگی

ساوندری (سندھ) کے لوگوں نے محمد ابن قاسم کے زمانے میں اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ لیکن ۲۵۵ھ تک یہ تمام شہر مسلمان ہوگیا۔ جیسا کہ بلاذری نے فتوح البلدان میں لکھا ہے۔

ہندی میں اسلام پر پہلا رسالہ { عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز

تیسری صدی کے آخر میں سندھ کے صدر مقام منصورہ کا حاکم تھا، کشمیر بالا اور کشمیر زیرین ہی کے درمیان الرا کا راجہ تھا۔ اس کا نام مہروگ بن رایگ تھا اور یہ ہندوستان کے تمام راجاؤں سے بڑا تھا۔ اس نے ۲۷۰ھ میں حاکم منصورہ کو لکھا۔ کہ آپ میرے پاس کسی ایسے شخص کو بھیجئے جو مجھے شریعت اسلام کے حقائق ہندی زبان میں آکر سمجھائے۔ حاکم منصورہ نے ایک عراقی عالم کو جو مدت تک ہندوستان رہے تھے اور یہاں کی زبانوں سے خوب واقف تھے

اپنے دربار میں بلاکر یہ واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے ہندی زبان میں ایک قصیدہ لکھا۔ جس میں اسلام کے ضروری مسائل بیان کردئے۔ یہ قصیدہ راجہ کی خدمت میں بھیجا گیا۔ راجہ نے اسے دیکھکر اس کے مصنف کو طلب کیا۔ یہ تین برس وہاں رہے۔ جب واپس پہنچے۔ تو عبداللہ نے راجہ کا حال پوچھا انھوں نے جواب دیا کہ راجہ دل، اور زبان دونوں سے مسلمان ہوچکا ہے[1] لیکن وہ حکومت چھوٹ جانے کے خوف سے اسلام کا علانیہ اعلان کرنے سے جھجکتا تھا۔ انھوں نے راجہ کو قرآن شریف کا ہندی ترجمہ سورۂ لیسین تک سُنایا اور اس نے اقرار توحید کیا۔

اس کے بعد راجہ ایک علیحدہ مکان میں رہنے لگا اور چھپ چھپ کر نماز بھی پڑھنے لگا۔ تیسری صدی کے آخر میں سندھ اور ملتان کے اندر دو تین خودمختار اسلامی ریاستیں باقی رہ گئی تھیں۔ مگر یہ حکومت بغداد سے آزاد تھیں باقی سندھ پر ہندو راجہ حکمران تھے۔ اور یہ خودمختار تھے۔ مگر اس کے باوجود ہندو راجہ مسلمانوں کے مذہبی رسوم سے تعرض نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ مسلمان حکمرانوں سے ان کی معرکہ آرائیاں ہوتی رہتی تھیں۔

اسی سلسلہ میں سندھ آنیوالا اعراقی سیاح کہتا ہے۔ کہ ملتان میں ایک عرب قریشی خاندان حکمران ہے۔ اور اس کی حکومت میں ہندوؤں کا ایک بڑا بتخانہ

---

[1] بلاذری صفحہ ۴۴۶

ہے۔ جس کی زیارت کو ہندو دُور دُور سے آتے ہیں اس میں نذرانوں کا گراں بہا خزانہ ہے"۔ سیاح مذکور کہتا ہے، کہ جب کوئی ہندو راجہ ملتان کی اسلامی حکومت پر حملہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے، تو والیٔ ملتان اس بُت خانہ کو تباہ کر دینے کی دہمکی دیدیتا ہے اور اس سے آئی بلا ٹل جاتی ہے۔

۳۷۵ھ تک ملتان اور منصورہ کی اسلامی سلطنتیں قائم رہیں۔ ایک سیاح کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ملتان کا مذکورہ بالا بُت خانہ بدھوں کا مندر تھا۔ چوتھی صدی کے آخر میں گو سندھ میں مسلمانوں کی آبادی کم رہ گئی۔ تاہم وہاں ایک اسلامی ریاست قائم رہی۔

اس وقت قنوج میں بھی خاصی اسلامی آبادی تھی۔ اُن کی ایک چھوٹی سی ریاست بھی تھی۔ شہر پناہ کے اندر ایک جامع مسجد بھی تھی۔ منصورہ کی جامع مسجد خاص شان رکھتی تھی۔ مسلمانوں نے خوب ترقی کی تھی۔ اگرچہ زیادہ آبادی ہندوؤں کی تھی۔ تاہم مسلمان کیا تجارت اور کیا علم میں نمایاں صورت رکھتے تھے۔ دیبل (کراچی) میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی۔ مگر چوتھی صدی میں نیرون خالص اسلامی شہر تھا۔ جہاں اسلام کے بڑے بڑے عالم فاضل موجود تھے۔ چوتھی صدی کے آخر میں سندھ کی عام حالت یہ تھی کہ عوام بُت پرست تھے۔ اور یہاں کے مسلمان اہل حدیث، بعض داؤدی ظاہری مذہب کے پیرو، مگر ملتان کے مسلمان شیعہ تھے۔ تاہم اہل سنت کی جماعت

بھی کم نہ تھی۔

منصورہ (قزدار) میں خوارج کی آبادی تھی۔ اور ان کا ایک سردار بھی تھا۔ ان کی ایک مسجد بھی تھی۔ شہر میں امن وامان تھا۔ چونگی رہی بالکل نہیں ہوتی تھی۔ مندرجہ بالا بیانات سے معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان کے اکثر حصص محمود غزنوی سے پیشتر ہی نور اسلام سے منور ہو چکے تھے۔ اسلام ہندوستان کا ایک عمدہ اور معزز مذہب سمجھا جاتا تھا۔ اور اسلامی آبادی کا سلسلہ دریائے سندھ سے لیکر ایک طرف قنوج تک اور دوسری طرف ملتان، کشمیر اور مقداذ تک پھیل چکا تھا۔ اور عوام تو عوام یہاں کے راجاؤں کا میلان طبع اسلام کی طرف ہو چکا تھا۔

افغانوں اور ہندوؤں کے تعلقات

لودھی اور سور خاندان کی اولاد کثیر سے[1] جن کا مورث اعلیٰ خالد بن عبد اللہ ایک عرب تھا، پشاور اور کوہاٹ وغیرہ اضلاع پر دست برد شروع کی۔ یہ علاقہ راجۂ لاہور کے زیر اقتدار تھا۔ مگر اب اس پر افغان متصرف ہو چکے تھے راجہ نے اپنے ایک سردار کو ہزار سواروں کی جمعیت سے ان کی سرکوبی کے لئے بھیجا، گھمسان کا رن پڑا۔ جس میں تقریباً تمام ہندو فوج کٹ گئی، افغانوں نے دلیر ہو کر راجہ کا اور علاقہ دبا لیا۔ اب راجہ لاہور کو اور بھی غصہ آیا۔ چنانچہ اس

[1] افغان، عرب، خالدی ہیں، یا قبطی یہودی، یا اولاد یافث۔ یہ لوگ اعراب کی فتح کابل کے وقت چنداں قوت نہ رکھتے تھے، تاریخ فرشتہ میں مذکور ہے کہ خالد بن عبد اللہ نامی ایک عرب حاکم کابل سے ناخوش ہو کر کوہ سلیمان کی جانب نقل مکان کر گیا اور اپنی دختر کا عقد ایک کوہستانی مسلمان کے ساتھ پڑھا یا جس سے لودی اور سور پیدا ہوئے۔ تقریباً ایک صدی میں ان دونوں (لودی، سور) خاندانوں میں اولاد کثیر پیدا ہوئی۔ جس کے افراد نے کوہ سلیمان سے باہر نکل کر پشاور، ستواری کوہاٹ بنوں پر حملہ کر کے ان پر قبضہ کر لیا۔

نے اپنے بھتیجے کو دو ہزار سوار اور پانچ ہزار پیادوں کی جمعیت کے ساتھ افغان سرکشوں کی سزا دہی کے لئے روانہ کیا۔ یہ ہندو فوج طاقتور تھی، اس لئے افغانوں نے کابل، غور، غزنی کے مسلمانوں سے امداد چاہی۔ چنانچہ چار ہزار بہادر ان کی امداد کے لئے پہنچ گئے۔ پانچ ماہ میں ستر سے کم مقابلے نہ ہوئے۔ افغانوں نے ہٹنے کا نام نہ لیا۔ آخر بوجہ موسمی سختی ہندو فوج نقصان کثیر اٹھا کر بے فیصلہ فتح و شکست واپس چلی گئی۔

راجۂ لاہور کا شجاع بھتیجا موسم کھل جانے پر تازہ دم فوج لے کر پھر افغانوں کے مقابلہ کو چلا، غور غزنی والوں نے بدستور سابق متفقہ قوت سے ہندوؤں کا مقابلہ کیا۔ مگر یہ عام مجاہدین تھے۔ ان میں کوئی سردار یا حکمران نہ تھا۔ اٹک اور پشاور کے درمیان متعدد خونریز معرکے ہوئے۔ کبھی ہندو افغانوں کو دبیلتے ہوئے پہاڑوں، دروں تک پہنچا تے اور کبھی افغان ہندوؤں کو دریائے سندھ تک پسپا ہونے پر مجبور کرتے تھے۔ مگر یہ سلسلہ کئی ماہ تک قائم رہا۔ آخر ہندوؤں کو بے نتیجہ ہی واپس آنا پڑا۔ اس لئے کہ موسم برشکال آگیا۔ اور اندیشہ ہوا کہ کہیں دریائے سندھ طغیانی سے ناقابل عبور نہ ہو جائے۔ الغرض ہندو سندھ پار اور افغانوں کے حلیف اپنے اپنے وطن واپس چلے گئے اب یہ لوگ گویا آزاد اور خود مختار تھے۔

ان واقعات کے کچھ عرصہ بعد قوم کھوکھر اور راجۂ لاہور میں مخالفت ہو گئی

کھوکھروں نے افغانوں سے رابطۂ اتحاد قائم کرنیکے لئے سلسلہ جنبانی کی۔ لیکن کوئی معاہدہ ہونے سے قبل راجۂ لاہور نے افغانوں کی جانب دست مؤدت بڑھایا۔ کیونکہ راجا افغانوں کی قوت کا تماشا خوب دیکھ چکا تھا۔ افغانوں نے اس دعوت محبت کا خیر مقدم کیا اور دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا جس کی ضروری دفعات حسب ذیل ہیں :۔

(الف) اس ملک کے علاوہ جو اب تک افغانوں کے قبضہ میں ہے دریائے سندھ کے کنارے کا علاقہ بھی افغانوں کا ملک تصور ہوگا۔

(ب) افغان قوم کھوکھر کے معاملات میں مداخلت نہ کریں گے۔

(ج) افغان، کابل، غزنی کی سمت سے مسلمانوں کے ان حملوں کو روکیں گے جو راجۂ لاہور کے علاقہ پر کئے جائیں گے۔

کس قدر عجیب بات ہے، کہ مسلمان (افغان) لاہور کی ہندو سلطنت کی حفاظت کا بیڑا اٹھاتے ہیں، پھر لطف یہ کہ اپنے ہم مذہبوں کے مقابلہ میں آج کتنے ہندوستانی ان باتوں سے واقف ہیں ؎

تمہیں لے دیکے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا ظالم تھا، ستمگر تھا

مذکورہ بالا معاہدہ کی تکمیل کے لئے افغانوں نے قلعہ خیبر تعمیر کیا۔ اور آخر تک اپنے عہد کو نباہا۔ چنانچہ سامانی عہد میں کوئی حملہ خیبر کی سمت سے ہندوستان

پر نہیں ہؤا۔ اور یہ ملک افغانوں کی بدولت بیرونی حملہ آوروں کی تاخت و
تاراج سے محفوظ رہا۔ تا زمانہ ظہور دولت عالیہ غزنویہ گویا قلعہ خیبر افغانوں
اور ہندوؤں کے پولٹیکل اتحاد کی ایک قدیم ترین تاریخی یادگار ہے۔ الپتگین
نے غزنی میں جدید سلطنت کی بنیاد رکھی۔ تو جنوبی سمت بڑھا۔ اس لئے کہ
باقی ہر سہ اطراف کو امیر بخارا کی سلطنت کی حدود دبائے ہوئے تھیں الغرض
الپتگین کا سپہ سالار قلعہ خیبر فتح کرتا ہؤا۔ پشاور آ پہنچا۔ اور علاقہ آزردسے
ستلج میں چھاؤنی ڈال دی۔ یاد رکھئے یہ علاقہ افغانوں کا تھا۔ کسی ہندو راجہ کا
نہ تھا۔ افغان اس حملہ کی تاب مقاومت نہ لاکر راجہ لاہور جے پال سے
طالب امداد ہوئے۔ راجہ بھٹنیر نے راجہ جے پال کو صلاح دی۔ کہ غزنی
اور لاہور کے درمیان ایک حلیف افغانی ریاست قایم کی جائے۔ جو
مغربی حملہ آوروں کی باحسن وجوہ روک تھام کر سکے۔
القصہ مجوزہ افغانی ریاست قائم ہو گئی۔ جسے راجہ جے پال نے زرین
امداد دی۔ اور ایک زبردست افغان شیخ حمید کو جائز والئے ریاست تسلیم کیا
اور سواحل سندھ کا علاقہ اس کی حدود ملک قرار پایا۔ یہی ریاست عرصہ تک الپتگین
کی اسلامی فوجوں کی پیش قدمی روکتی رہی۔ یعنی راجگان ہند کے لئے خود
سینہ سپر ہوتی رہی۔ لیکن جب خود الپتگین اپنی ٹڈی دل فوج لے کر آ پڑا تو پھر
سوائے گردن تسلیم خم کرنے کے اور کوئی چارہ کار نہ رہا۔ شیخ نے افغان کو پیغام

وغیرہ علاقہ کے بجائے اپنا مفتوحہ علاقہ ملتان اسے دے دیا۔ جو عہد بنی امیہ سے مسلمانوں کے تصرف میں چلا آیا تھا۔

عہد سبکتگین

عربوں۔ افغانوں اور اہل ہند کی اس قدر معرکہ آرائیوں کی تفصیل کے بعد اب ہم پھر ناصر الدین سبکتگین کے عہد میں پہنچ جاتے ہیں۔

سبکتگین کے زمانہ میں مسلمانوں کی کیا حالت تھی؟

اسلام کا فاتحانہ اثر سندھ و ہند میں بالکل نہ تھا۔ ہندو باجگزار راجہ خلافت بغداد کی اطاعت کے جوئے اپنے کندھوں سے ڈال چکے تھے بہت سا ملک مسلمانوں کے قبضہ سے نکال لیا تھا۔ لیکن مسلمانوں کو یہاں سے خارج کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ ہنوز مسلمانوں کی سندھ کی ایک حد پر حکومت موجود تھی، پھر مصر میں اسماعیلیہ کے زور پکڑتے ہی مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ یہ سچ ہے، کہ مصر کے ان مسلمان حکمرانوں نے ہند و سندھ پر کبھی حملہ نہیں کیا۔ لیکن ان کی فاتحانہ اولوالعزمی کی داستان اہل ہند کے کانوں تک برابر پہنچ رہی، اور ان کو مرعوب کر رہی تھی اور یہ امر دوسری طرف مسلمانان سندھ کی تقویت قلبی کا باعث تھا۔ اگرچہ انہیں مصر سے کسی فوجی امداد کی براہ راست کوئی امید نہ تھی،

موجودہ مسلمانان ہند کی تقویت قلبی کا باعث آج بھی ان کی قومی الیعنی

اسلامی سلطنتیں ہیں ۔ خواہ وہ دنیا کے کتنے ہی دور دراز علاقوں میں کیوں نہ واقع ہوں ۔ اور خواہ ان سے براہ راست کسی قسم کی امداد کی اُمید نہ ہو ۔ ان کی ہستی بہرحال ہمارے لئے ایک قوت ہے ۔ یہ فرق ہے مسلمانوں اور ان اقوام میں جن کی کوئی قومی سلطنت نہیں

راجہ جے پال کا حملہ غزنی پر

یہ بیان ہو چکا ہے ۔ کہ مغربی حملہ آوروں سے حفاظت کی غرض سے راجہ جے پال[1] نے سرحد پر افغانی ریاست قائم کی تھی ۔ لیکن بالآخر افغانی سردار شیخ حمید نے سبکتگین کے ساتھ موافقت کی ۔ اور اس طرح مسلمان حملہ آوروں کے لئے ہندوستان کا دروازہ کھل گیا ۔ پس یہ رنگ بدلا دیکھکر راجۂ لاہور نے سبکتگین کے ہند پر حملہ آور ہونے سے پیشتر ہی (بطور حفظ ماتقدم) اس کا زور توڑنا اور اس رخنہ کو بند کرنا چاہا ۔

سبکتگین کی پولیٹیکل قوت

بایں ہمہ کہ سبکتگین نے خاص قوت پیدا کر لی تھی اور اس نے شیخ حمید کے بہت سے قلعے فتح کر کے آخر کار اس سے سلسلہ اتحاد مستحکم کر لیا تھا تاہم

---

[1] جے پال ذات کا برہمن ۔ پنجاب اس کے زیر نگین تھا ۔ لاہور اس کا دارالحکومت تھا ۔ اس خاندان کے حکمرانوں کے سکوں پر سانڈ اور سوار کی تصاویر پائی جاتی ہیں ۔ اس لئے یہ خاندان سانڈ اور سوار کے نام سے بھی مشہور ہے ۔ دیکھو تاریخ ہند !

اس کی قوت بادی النظر میں غزنی کی ایک چھوٹی ریاست سے زیادہ نہ تھی جو موجودہ کابل کے برابر بھی نہیں ہوگی اسے اپنے کسی ہمسایہ حکمران یا سردار سے بھی مدد ملنے کی امید نہ تھی،

یہ امور محرک تھے۔ کہ خود راجۂ لاہور[1] پیش قدمی کر کے سبکتگین پر حملہ آور ہوتا، بھلا راجہ اپنی طاقت سلطنت، کثرت آبادی، اور مال مالی کے مقابلہ میں غزنی جیسی حقیر ریاست کو کب نظر میں لا سکتا تھا، فی الحقیقت یہ ایک دانشمندانہ اور شجاعانہ اگر یہ کشتن روز اول کے مصداق، طرز عمل تھا۔ اگر یہ تدبیر کامیاب ہو جاتی۔ تو اس میں شک نہیں کہ کچھ مدت کے لئے یہ بیرونی فتنہ ضرور دب جاتا۔

الغرض راجہ جے پال اپنی بہادر سپاہ کے علاوہ راجگان ہند کے چیدہ اور منتخب بہادر ہمرکاب لے کر سندھ پار ہوا۔ اور نواح جلال آباد میں خورک گھاٹی کے قریب جا پہنچا۔

حملہ خود راجہ جے پال نے کیا۔ جسے مؤرخ لیتھبرج بھی تسلیم کرتا ہے مگر بایں ہمہ طامس کہتا ہے کہ "سبکتگین نے اسکے ملک پر حملہ کیا۔ افسوس اس قسم کی تاریخ نونہالان ہند کو پڑھائی جاتی ہے،

جب سبکتگین نے ہندو فوج کی آمد سنی تو اپنی فوج خاصہ، اور کئی ہزار

---

[1] طامس، جے پال کا دارالحکومت بھٹنڈا بتاتا ہے۔

مجاہدین ہمراہ لے کر دشمن کے مقابل آیا۔ مؤرخ ہند نے تاریخ ہند میں اسی لشکر کشی کا بالفاظ ذیل ذکر کیا ہے؟

"اس وقت لاہور میں راجہ جے پال (جو ذات کا برہمن تھا) راج کرتا تھا اس نے دریائے سندھ سے اتر کر پشاور کی گھاٹی میں (جو افغانستان سے پنجاب کو آتی ہے) سبکتگین پر حملہ کیا"

ہندوؤں کو شکست

فاضل مؤرخ نے اسباب حملہ اور اس کے نتائج سے اغماض کر کے اس کے آگے یہ لکھدیا ہے کہ اس وجہ سے سبکتگین نے پنجاب پر دو دفعہ یورش کی۔ اور جے پال اور اس کے سارے راجپوت رئیسوں اور دہلی و اجمیر و قنوج وغیرہ کے راجاؤں (جو اس کی مدد کے لئے جمع ہوئے تھے) ان سب کو شکست فاش دیکر اور بہت سا مال لے کر غزنی کو مراجعت کی"

ہم اس اجمال پر قناعت نہ کر کے واقعات پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے!

کہتے ہیں کہ خورک گھاٹی کے قریب ایک چشمہ تھا، جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اگر اس میں از قسم نجاست کوئی شے ڈالی جائے تو طوفان، رعد، و برق، برفباری اور بارش شروع ہو جاتی تھی، لکھا ہے کہ سبکتگین نے اس چشمہ میں نجاست ڈلوا دی۔ جس سے طوفان آیا۔ اور بارش و برف باری ہوئی۔ اور سردی[۱] کی شدت سے ہندو فوج مرنے لگی

درخواست صلح

پھر مجبور ہو کر راجہ نے سبکتگین سے صلح کی درخواست کی۔ اس روایت کا تجربہ اگر سائنٹفک طریق سے بھی کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ واقعات کے سلسلے میں شامل کی جا سکے بہرحال اس میں کلام نہیں کہ ہندوؤں کی شکست کی وجہ غزنویوں کی تلوار نہ تھی، بلکہ قدرت کی تلون مزاجی یا بہ اصطلاح اسلام تائید غیبی تھی، کاش ہندوؤں کو تاریخی مذاق ہوتا۔ اور آج ہم ان کے بیان سے واقعات کی تطبیق کر سکتے۔

سبکتگین کا بہادر بیٹا محمود (جو اس مہم میں باپ کا ہمرکاب تھا) اس صلح کے خلاف تھا۔ اور وہ دشمنوں کا بالکل استیصال کرنا چاہتا تھا۔ لیکن رحمدل سبکتگین نے پیغام صلح کو منظور فرمایا۔ الغرض حسب ذیل شرائط پر باہم صلح ہو گئی

شرائط صلح

(۱) راجہ جے پال تاوان جنگ (خرچہ جنگ) ادا کرے گا۔

(۲) پچاس ہاتھی بھی سلطان کو پیش کریگا۔

(۳) شمالی قلعہ بھی سبکتگین کے تصرف میں دیدیگا۔

(۴) ہندو یرغمال غزنی میں رہیں گے۔

(نوٹ متعلقہ صفحہ سابقہ) اہل ہند کیلئے افغانستان کی سردی اب بھی ناقابل برداشت ہے، خونی برف تو گویا پیغام اجل ہے۔ ۱۸۴۲ء کی مہم میں انگریزی اور ہندوستانی فوج اسی برف باری کی بھینٹ چڑھی۔

۵۔ چند مسلمان سردار خرچہ جنگ لینے کے واسطے راجہ کے ساتھ لاہور جائیں گے۔

بدعہدی

راجۂ لاہور اپنی باقی فوج لے کر لاہور واپس ہوا۔ تو معاہدہ کے متعلق روپیہ دینے سے انکار کر دیا، اور مسلمان سرداروں کو قید کر دیا۔[1] فریقین کے طرز عمل اور کیرکٹر پر ایک سرسری نظر ڈالو۔

جب راجۂ لاہور کے طرز عمل کی اطلاع دربار غزنی میں پہنچی۔ تو سبکتگین کو سخت افسوس ہوا۔

انتقام یا حملہ اول سبکتگین

مسلمانوں میں برہمی اور جوش کے جذبات پیدا ہو گئے۔ ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ کہ بدعہد کافروں سے ضرور انتقام لیں گے۔ الغرض سامان جہاد ہونے لگا۔ اور بیس ہزار مجاہدین غزنی سے لشکر ہندوستان

[1] زمانۂ قدیم بھارت میں ایلچی یا پیغامبر کی زندگی کو متبرک خیال کیا جاتا تھا اور اس کو محض قید کی سزا دینا بھی گناہ میں داخل سمجھا جاتا تھا، مہابھارت ادیوگ پرب (۸۸۔۱۸) میں دھرت راشٹر لکھتے ہیں۔ رشی گنیش ایک ایلچی ہے۔ اور رشتہ کے لحاظ سے ہمارا پیدا ہے۔ اس نے کوروں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا۔ بھلا یہ تمہیں کیسے واجب ہے۔ کہ اُسے قیدی بناؤ۔

(رسالہ ترجمان مارچ صفحہ ۱۱)

کے لاکھوں دشمنوں کے مقابلہ کو چلے۔

یہ سبب ہے سبکتگین کے حملہ اول ہند یا پنجاب کا! غزنی مجاہدین اثنائے راہ کے تمام کوہستانی قلعہ جات فتح کر کے درہ خیبر تک آپہنچے اور اس دشوار گزار گھاٹی سے گزر کر ہندو فوج کو بھگاتے ہوئے پشاور کے قریب آکر سانس لیا۔ پھر اس علاقہ کو زیر و زبر کرتے ہوئے قلعہ لمغان پر جا پڑے، اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یہ سب کچھ ہوا۔ مگر راجہ لاہور سبکتگین کے مقابلہ کو نہ آیا۔ اس لئے مسلمان اٹک تک آکر غزنی واپس چلے گئے۔

بایں ہمہ راجہ غافل نہ تھا، بلکہ وہ چپکے چپکے تیاریوں میں معروف تھا وہ سمجھتا تھا کہ جب تک سبکتگین جیسے دشمن کا زور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نہیں توڑ دیا جائے گا۔ تب تک پنجاب بلکہ تمام ہندوستان خطرہ سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس نے راجگان ہند سے اس معاملے میں خط و کتابت کی، ان میں قومی و مذہبی حرارت پیدا کی اور بحیثیت مجموعی ہندو قوم میں حب الوطنی اور قوم پرستی کے جذبات پیدا کئے۔ طامسن کہتا ہے کہ "تین سال بعد ۹۹۱ء میں جے پال نے سلطان کے برخلاف ہند و راجگان کی ایک مجلس (کونسل) مرتب کی" ان تمام کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستان کے چیدہ اور منتخب ترچھے بانکے راجپوت، راجگان دہلی

اجمیر اور قنوج کی اور دیگر ہندو ریاستوں کی فوجیں اس کے جھنڈے کے نیچے آ جمع ہوئیں اور غزنی پر حملہ کرنے کا بہادرانہ عزم کیا گیا۔ کامل تین سال ان تیاریوں میں لگے!

امیر سبکتگین بھی ہندو راجاؤں کے منصوبوں سے بے خبر نہ تھا چنانچہ وہ ابھی غزنی نہیں پہنچنے پایا تھا کہ اسے راجۂ لاہور کے عزائم کی اطلاع ہوئی اور اس نے پلٹ کر فوراً ہندوستان کی جانب رُخ کر دیا چنانچہ پشاور کے قریب جا کر دم لیا۔ جہاں ہندو فوجیں پہنچ چکی تھیں۔

یہ مقابلہ برابر کا نہ تھا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کی فوج میں ایک اور پانچ کی نسبت تھی۔ لیکن بہادرانِ اسلام نے قلت وکثرت کے سوال کو عموماً بنظر حقارت دیکھا ہے۔ کیونکہ ان کو تعلیم دی گئی ہے اور مشاہدہ کرایا گیا ہے:۔

کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ

اس لئے اگر غزنی کے بہادر ہندوؤں کی کثیر فوج سے مرعوب نہ ہوئے تو تاریخ اسلام میں یہ کوئی جدید اور عجیب بات نہ تھی۔ سبکتگین نے اپنی فوج کو کئی حصوں میں تقسیم کیا۔ ہر حصہ باری باری ہندوؤں سے مقابلہ کے لئے جاتا تھا، اور ایک کے تھک جانے پر دوسرا دستہ تازہ دم پہنچ جاتا تھا۔ سبکتگین دانستہ جنگ کو طول دے رہا تھا۔ اس کے برخلاف ہندو

فوج تمام کی تمام برسرپیکار تھی۔ جب ہوشیار سبکتگین نے دیکھا کہ دشمن کی فوج تھک چکی ہے۔ تو اس نے اپنی فوج خاصہ سے حملہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی تمام مجاہدین اللہ اکبر کہکر دشمنوں پر جا پڑے۔ خونریز اور دل ہلا دینے والا معرکہ ہوا۔ فریقین کے بے شمار بہادر کام آئے۔ بایں ہمہ نتیجہ ہندوؤں کے برخلاف نکلا۔ اُن کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ بقیۃ السیف فوج بھاگ نکلی جن کا مجاہدین نے تعاقب کیا۔ تاہم راجہ جے پال میدان سے اپنی جان سلامت لے جانے میں کامیاب ہوا۔ مجاہدین کو کامل فتح ہوئی۔ اب مال غنیمت ان کا حق تھا۔ علاقہ پشاور فاتحین کے زیر اقتدار آیا۔

یہ جنگ فیصلہ کن یا انقلابی ثابت ہوئی۔ جس نے راجہ جے پال کی کمر کو توڑ دیا۔ چنانچہ اس کے بعد اس میں کیا کسی ہندوستانی راجہ میں اتنی جرأت باقی نہ رہی۔ کہ وہ جنگ میں تقدیم کرے۔ اور بڑھکر دشمن کے ملک پر حملہ کرے۔

اب دریائے اٹک تک کا تمام ملک غزنویوں کی حکومت میں شامل ہوا۔ راجہ جے پال نے خراج دینا منظور کیا جو سبکتگین کی وفات تک متواتر بیس سال تک غزنی کے خزانہ میں داخل ہوتا رہا۔

مسٹر طامسن لکھتے ہیں کہ "راجہ جے پال ان ہزیمتوں اور نقصانات کو نہ انگیز کر سکا۔ چنانچہ اس نے چتا میں بیٹھکر اپنی جان کو آتش سوزان کے حوالے

کیا۔ اور اپنے بعد ہندوستان کو بیرونی حملوں سے بچانے کے لئے اپنے فرزند آنند پال کو چھوڑا۔"

یہ وہ جنگی مہمات اور ان کے نتائج ہیں، جن کی بابت تاریخ ہند میں صرف اس قدر تحریر ہے کہ "سبکتگین نے دو حملے کئے۔ ہندو راجاؤں کو شکست دی۔ اور بہت سا مال لیکر واپس گیا" بہت سے مال سے مراد مال غنیمت ہے جو بہرحال فاتح کا حق ہوتا ہے۔ اور آج بھی کہ تہذیب، شائستگی اور روشنی کا زمانہ مانا جاتا ہے۔ یہی سکہ رائج ہے۔ غور پر ناکام حملہ کیا۔ محمد سور کے جو علاقے بڑھ گئے (تفصیل آئندہ آئے گی)

۳۸۷ھ میں سبکتگین کو پیغام اجل پہنچا۔ چنانچہ وہ بیس سال حکومت کر کے چھپن سال کی عمر میں بمقام موضع ترمذ (بلخ) راہی مُلک بقا ہُوا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

سُلطان محمود غزنوی

ولادت سلطان محمود غزنوی ان اشخاص میں سے ایک ہے جو اپنے کارناموں کی بدولت تاریخ اسلام میں بلکہ دُنیا کی تاریخ میں خاص شُہرت رکھتے ہیں۔ خوش نصیب محمود نے جمعرات شب عاشورہ ۳۶۱ھ کو پردۂ عدم سے عالم شہود میں آنکھیں کھولیں اور آغوش مادری کو اپنا گہوارہ بنایا[1]۔ اس کی ماں زابل کے ایک با اقتدار سردار

[1] کتب تاریخ میں مذکور ہے۔ کہ اس ولادت سے ایک روز قبل سبکتگین نے یہ عجیب و غریب خواب دیکھا کہ اس کے آتشدان سے ایک درخت اُگا اور اس کا سایہ تقریباً تمام دُنیا پر پھیل گیا۔ سبکتگین اس خواب سے گونہ متردد اور تعبیر کے انتظار میں تھا کہ اس اثنا میں اس نے تولد فرزند کا مژدہ سُنا۔ اور وہ سجدہ شکرانہ خداوندی میں گر پڑا۔ اور خواب کو مولود کی اقبالمندی کی بشارت سمجھا۔ محمود اس کا نام رکھا۔ تاریخ میں یہ بھی تحریر ہے کہ علاقہ پشاور میں دریائے سندھ کے کنارے ایک مشہور اور قدیم بُت خانہ تھا۔ یہ محمود کی شب ولادت دفعتًا خود بخود گر پڑا۔ نجومی بیان کرتے تھے کہ محمود اور آنحضرت صلعم کا طالع یکساں تھا، ہر چند اقوال نجومی مومنین کے لیے کوئی وقیع شے نہیں، تاہم اس قدر ضرور ہی کہنا پڑتا ہے۔ کہ خرابیٔ بُت، بت خانہ پر نظر کر کے منجموں کا قول اتفاقات پر مبنی ہی۔ (بقیہ نوٹ صفحہ مابعد)

کی دختر تھی۔ جس وقت سبکتگین نے وفات پائی۔ محمود اس وقت خراسان میں تھا اس لئے کہ اسے یہاں کی حکومت پر باپ نے مامور کر رکھا تھا۔

شہزادہ اسمٰعیل اور اس کا حشر

محمود کا بھائی شہزادہ اسمٰعیل (جو عمر میں اس سے چھوٹا، اور الپتگین کا نواسہ تھا) اپنے آپ کو مستحق حکومت سمجھتا تھا۔

محمود اول تو عمر میں بڑا تھا۔ دوم باپ کی حیات ہی میں شجاعت، انتظام ملک اور عام لیاقت میں کافی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اسمٰعیل نے تاج و تخت پر قبضہ کر لیا۔ مراسم تخت نشینی ترمذ در بلخ (جہاں سبکتگین نے وفات پائی تھی) ادا کی گئی تھیں۔ خود سبکتگین نے اس کی جانشینی کی وصیت[1] کی تھی، جس کی مصلحت آگے چل کر معلوم ہوگی۔

مورخین کا بیان ہے۔ کہ اسمٰعیل نے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی بے پناہ پر خزائن کے دروازے کھول دئے۔ ایشیا میں حکومت ہر دلعزیز بنانے کی یہ ایک عام تدبیر تالیف قلوب ہے۔

جب سبکتگین کی وفات اور اسمٰعیل کی تخت نشینی کی اطلاعات نیشاپور تک

(بقیہ نوٹ صفحہ ماسبق)، رسول کریمؐ نے جو کام عرب میں کیا وہی محمود نے ہند میں، ان کے ادنیٰ غلام کی حیثیت سے کیا وکفیٰ باللہ شہیدا۔

[1] نامۂ خسروان۔

"THE NEW UNION" PRESS, LAHORE

جا پہنچیں - اور محمود کے کان میں پڑیں - تو باعث تاسف و تحسر ہوئیں، اس نے فوراً بعجیل پسند اور ناعاقبت اندیش بھائی کو حسب ذیل مراسلت بھیجی جس کے حرف حرف سے دیانت، انصاف، برادرانہ اُلفت، دینداری اور دوراندیشی ٹپکتی ہے۔ اس نے لکھا :-

"جان برادر !" بخدا تم دنیا بھر کے انسانوں سے زیادہ عزیز ہو۔ میں تمہاری ہر ایک ضروریات کے مہیا کرنے پر آمادہ ہوں۔ خواہ وہ ملک کے متعلق ہوں یا خزائن کے۔ مجھے کسی سے دریغ نہیں"

"سب جانتے ہیں۔ کہ ملک گیری، لشکرکشی، انتظام مملکت اور مردم شناسی وغیرہ اُموریں مجھے تم سے زیادہ تجربہ ہے، اگر تم میں یہ اوصاف مجھ سے زیادہ ہوتے، تو میں تمہاری اطاعت اپنے لئے مایۂ سعادت سمجھتا۔ پدر بزرگوار نے بے شک تمہیں اپنا جانشین مقرر کیا۔ لیکن اس کا حقیقی سبب میری عدم موجودگی اور دارالامارت سے بُعد مکانی ہے جو محض دفع الوقتی کے لئے تھا۔ اس خوف سے کہ مبادا اغیار ملک و حکومت میں دراندازی کا ارادہ کریں۔ پس اب مناسب یہ ہے کہ ترکۂ پدری حسب فرمان مالک الملک عز اسمہٗ ہم دونوں بھائی باہم تقسیم کریں۔ غزنی مجھے دیا جائے۔ بلخ کی حکومت تمہارا حصہ ہے۔ فوج کے کمانڈر انچیف بھی تم ہی ہوگے۔

صاحب نامۂ خسروان لکھتا ہے "کہ اسماعیل نے اس تحریر کو سرسری

سمجھا اور محمود کو اس کا جواب تک نہ بھیجا۔

محمود اپنی فوج کی معیت میں غزنی کی طرف چلا۔ اس کا عم اور اس کا برادر نصر اس کے ہمرکاب تھے۔ اسماعیل نے بھی سپاہ لے کر اپنے مقام (بلخ) سے حرکت کی۔ حتیٰ کہ دونوں لشکر ایک دوسرے کے بالمقابل آکھڑے ہوئے۔

محمود اپنی تلوار بھائی اور اس کے رفقا کے خون سے آلودہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے میدان جنگ سے بھی اپنے برادر نامہربان کے پاس پیغام مصالحت بھیجا۔ جسے اگر قبول کیا جاتا۔ تو فتنہ دب جانے کے علاوہ اسمٰعیل کی بھی عزت رہ جاتی۔ لیکن اس نے قبول نہ کیا اور صاف انکار کر دیا۔

میدان کارزار گرم ہوا۔ فریقین کے بیشمار بہادر بے جان ومغفور ہوئے خون کی ندیاں بہ نکلیں۔ آخرش محمود کامیاب ہوا۔ اسمٰعیل میدان سے پسپا ہوکر غزنی میں قلعہ گیر ہوا۔ محمود غزنی جا پہنچا۔ دونوں بھائی ملے۔ عذر و معذرت کے بعد صلح و صفائی ہوگئی۔ اور دونوں بھائیوں میں عہد و پیمان ہوگئے۔ اسمٰعیل نے حکومت کا چارج اور خزائن کی کنجیاں محمود کے حوالے کیں۔ خراسان کی حکومت اسمٰعیل کو عطا کی گئی۔ محمود نے ملک محروسہ میں جدید عمال مامور کیئے۔ اور اس کے بعد مع اسماعیل کے بلخ کی جانب کوچ کیا۔

کہتے ہیں کہ ایک شب دونوں بھائی بیٹھے ہوئے باہم گفتگو کر رہے تھے۔ اسمٰعیل پر شاید غنودگی چھائی ہوئی تھی۔ یہ اتفاقاً محمود نے بھائی سے ... سرسری طور پر کہا:-

اسمٰعیل! اگر اقبال تمہاری یاوری کرتا۔ اور تم مجھ پر قابو پاتے۔ تو میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟!!

غافل! اور ناعاقبت اندیش اسمٰعیل کی زبان سے دفعتاً نکلا "برآں بودم اگر بر تو دست یابم در دز سے بزندان کنم، و آنچہ بخواہی برایت آمادہ سازم"!

محمود یہ سُن کر گویا دل میں چونک پڑا۔ اس وقت اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہوگا۔ کہ اگر اب بھی انقلاب برپا ہو جائے۔ اور میری جان اسمٰعیل کے رحم پر ہو۔ تو وہ بلاشبہ میرے ساتھ وہی سلوک کریگا۔ جو کہتا ہے تاہم وہ اس وقت خاموش ہوگیا۔ لیکن چند روز بعد اسمٰعیل کو والیٔ گرگان کے سپرد کیا۔ کہ قلعہ میں نظر بند کر دے۔ اور اس کی مرضی کے مطابق اس کے لئے سامان آسائش مہیا کرے۔ سوائے آزادی کے۔ افسوس اسمٰعیل کو وہ سزا ملی جو اس نے محمود کے لئے تجویز کی تھی۔ اسمٰعیل کا اسی قلعہ میں انتقال ہوگیا۔ اس کا زمانہ اقبال مندی صرف چار سال تھا۔

محمود اسمٰعیل کے قضیۂ نامرضیہ سے مطمئن ہو کر

۳۸۷ھ ۹۹۷ء میں جلوہ آرائے تخت حکومت ہوا۔ اس وقت اس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس نے چندے اپنی ننہال زابلستان میں قیام کیا۔ اسی تعلق سے محمود کو سلطان زابلی بھی کہتے ہیں۔

ایبک خاں سلطان محمود نے اوّلاً ابوالحرث سامانی والیٔ بخارا اور خلف بن احمد ایک باغی حاکم کو صلح و جنگ سے زیر کر کے اور ایبک خان شاہ ترک کو شکست دے کر وسط ایشیا میں اپنا رُعب قائم کیا۔

ابتدائی مہمات اور ترکستان اس کے ممالک محروسہ ... میں شامل ہوگیا۔ تفصیل آئندہ آئے گی۔

اسی طرح خوارزم پر لشکر کشیاں ہوئیں۔ اور طویل خونریزی کے بعد اس پر متصرف ہوگیا۔ پھر عراق عجم کی جانب رُخ کیا۔ اور مجدالدولہ دیلمی کو زیر کر کے خود اس پر قبضہ کیا۔ اور یہاں کی حکومت اپنے فرزند مسعود کو عنایت کی۔

مؤرخ ہند لیتھبرج لکھتا ہے۔ کہ محمود نے تخت نشین ہوکر اوّلاً تو ماوراءالنہر کا ملک جو بحیرۂ خزر سے لے کر دریائے اٹک تک پھیلا ہوا تھا، اس میں اپنا سکہ بٹھایا۔ اور پھر عنان توجہ ہند کی جانب پھیری۔ اب ہم سلطان

---

(۱) تاریخ ہند لیتھبرج۔ لیکن انگریزی تاریخ طامسن صاحب میں ۹۹۹ء تحریر ہے کہ غالباً محمود نے تین سال زابلستان میں قیام کیا۔"

محمود کی ہندوستانی مہمات کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ مصنف تاریخ ہند سلطان محمود کی ہندوستانی مہمات کی تمہید میں لکھتا ہے "محمود کا ہند کی دولت پر تو دانت تھا ہی، مگر ساتھ ہی یہ بھی آرزو تھی کہ بڑے بڑے بانکے راجپوتوں کو تلوار کے زور سے دین اسلام میں داخل کرے۔ اس کا سبب فاضل مؤرخ اپنے زعم میں حسب ذیل لکھتا ہے:۔

"خلیفہ بغداد نے اس کے مذہبی جوش کو دیکھکر ایک گراں بہا خلعت اس کے پاس بھیجا تھا۔ اور" امین الملت یمین الدولہ" خطاب بھی دیا تھا۔ پس محمود نے یہ عہد کر لیا تھا۔ کہ میں دین اسلام کے پھیلانے کے لئے ہر سال ہند پر حملہ کروں گا"

مسٹر طامسن اپنی انگریزی تاریخ ہند مروجہ مدارس سرکاری پنجاب میں تحریر کرتے ہیں۔ کہ "کہتے ہیں۔ اُس نے (محمود نے) قسم کھائی تھی۔ کہ میں ہر سال کافروں کے برخلاف چڑھائی کروں گا۔ اور اس نے پنجاب پر حملہ آوری شروع کر دی"

انگریزی مؤرخین کے مندرجہ بالا بیان سے حسب ذیل معلومات بہم پہنچتی ہیں:۔

(۱) سلطان محمود کو ہند کی دولت کی طمع تھی۔

(۲) وہ بانکے راجپوتوں کو تلوار کے زور سے مسلمان کرنا چاہتا تھا

(۳) اس نے عہد کر لیا تھا۔ کہ میں دین اسلام کے پھیلانے کے لئے ہر سال ہند پر حملہ کروں گا۔ اس نے قسم کھائی تھی۔ کہ ہر سال کافروں کے خلاف چڑھائی کرے گا۔

(۴) اور یہ اس لئے کہ خلیفۂ بغداد نے خطاب و خلعت عطا کیا تھا۔

قبل اس کے کہ ہم ان امور کی تنقید و تحقیق میں مصروف ہوں۔ ہم ان دعوؤں کو واقعات کی روشنی میں دیکھیں گے۔

عربوں نے سندھ و ہند پر کیوں لشکرکشیاں کیں؟ اور ان سے کیا کیا نتائج مترتب ہوئے؟ فاتح عربوں نے مفتوحین کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا؟ چھیڑ کس کی طرف سے ہوئی تھی؟ الپتگین، سبکتگین اور راجۂ لاہور کی آویزش کے کیا اسباب تھے؟ کیا آغاز اہل غزنی کی جانب سے ہوا تھا؟ ان تمام سوالات کے جوابات بالتفصیل معرض تحریر میں آچکے ہیں۔

جن لوگوں کی نظر صرف انگریزی تاریخوں کے صفحات تک محدود ہے اور وہ انہیں تاریخوں کو اعتماد کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ ان کے نقطۂ خیال سے تو محمود کے ہند کے حملوں کے دو ہی اسباب ہیں۔ ایک دولت ہند کی طمع، دوسرے بانکے راجپوتوں کو بزور شمشیر داخل اسلام کرنا مگر ہم واقعات کے اندر تلاش کریں گے کہ کیا سلطان محمود کی مہمات ہند کے یہی راز ہیں، یا کچھ اور ہیں!

اکھا جا چکا ہے کہ جب راجہ جے پال کو سبکتگین کے مقابلہ میں شکست ہوئی

تو راجہ نے ادائگی خراج کی شرائط پر مصالحت کرلی۔ یہ خراج تاحیات سبکتگین کابل میں سال تک ادا ہوتا رہا۔ لیکن سبکتگین کی وفات کے بعد خزانہ غزنی میں خراج ہند نہیں پہنچا۔ بلکہ راجہ آنندپال نے شمالی حدود پر پیشقدمی شروع کردی۔ شمالی ہندوستان کے ہندوؤں نے آنندپال کی سرپرستی میں محمود کے خلاف اتفاق شروع کیا۔ اور پشاور کو ان کے قبضہ سے نکالنے پر آمادہ ہوئے۔ شاید راجہ کو یہ جرأت اس وجہ سے ہوئی۔ کہ محمود ان دنوں بخارا اور ترکستان کی مہمات میں مصروف تھا :۔

حملہ اوّل

الغرض یہ اسباب حقیقی ہیں، سلطان محمود کے حملے اول ہند کے جو سنہ ۳۹۲ھ (۱۰۰۱ء) میں پنجاب پر ہُوا۔ اس حملہ کا ذکر مورخ ہند لیتھبرج نے صرف یہ الفاظ ذیل کیا ہے:۔

محمود کے حملے "یہ حملہ راجہ جے پال والئی لاہور پر ہُوا۔ جس میں راجہ کو شکست ہوئی۔ اور محمود قلعہ وبھٹنڈا فتح کر کے غزنی کو اُلٹا پھر گیا۔" تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سلطان محمود مع اپنی فوج اور والنٹیرز (مجاہدین) کے کوچ کرتا ہُوا پنجاب تک آ پہنچا۔

راجہ جے پال محمودی عزائم سے بے خبر نہ تھا۔ چنانچہ جب اسلامی لشکر یہاں پہنچا ہے۔ تو ٹڈی دل ہندو لشکر نواح پشاور میں زمین گیر تھی۔ اکثر ہندو راجہ اپنی اپنی فوجیں لے کر راجہ جے پال کی امداد کے لئے میدان میں پہنچ چکے تھے اور ایک ایک ہندو سپاہی اور افسر کا دل جوش سے لبریز تھا مقابلہ کا وقت آ پہنچا۔ اسلامی فوج اپنے سپہ سالار کی ماتحتی میں میدان میں آئی۔ اُدہر سے ہندو فوجیں آگے بڑھیں دربازار کشت وخون گرم ہُوا۔ اس وقت سلطان محمود اپنی پندرہ ہزار فوج خاصہ لئے علیحدہ کسی خاص

موقع کا منتظر تھا۔

ہندو فوج اپنے شجاع افسروں کی ماتحتی میں نہایت جوش اور شدت سے مقابلہ کر رہی تھی۔ صبح سے دوپہر تک یہی عالم رہا۔ مسلمانوں نے بھی کامل طور پر اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے۔ لیکن کامل چھ گھنٹے کی جنگ نے ہندو فوج کو گویا تھکا دیا۔ میدان کا یہ رنگ دیکھکر سلطان اپنے پندرہ ہزار جانباز رفقاء کو ہمرکاب لے کر دشمنوں پر طوفان کی طرح آپڑا۔ ہندو افسروں نے اپنی فوج کو ہر چند ابھارا۔ لاکھ کوششیں کیں، لیکن وہ اس تازہ دم فوج کے حملے کی تاب نہ لاسکی۔ حتیٰ کہ اس کا دل چھوٹ گیا۔ ہمت ٹوٹ گئی۔

نتائج اور وہ اس قدر مرعوب ہوگئی۔ کہ چند ہزار مسلمانوں نے پانچ لاکھ دشمنوں کو اسیر کر لیا۔ اسی جماعت میں دیگر ہندو سردار اور راجگان کے علاوہ خود راجہ جے پال موجود تھا۔ ڈاکٹر اقبال اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں "کہ جن ہاتھیوں پر ان کو بھی بھروسا تھا۔ وہی خرابی کا سبب بنے، اُدہر تو انھوں نے اپنی فوج کو روند ڈالا۔ اِدہر سے محمود کے سواروں نے جو حملہ کیا، تو مسلمانوں کو پوری فتح ہوئی اور ان کی سلطنت دریائے سندھ کے دائیں کنارے تک آپہنچی"

راجہ جے پال اور دیگر ہندو سردار سلطان محمود کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ اور ان سے زر فدیہ لے کر انہیں آزاد کر دیا گیا۔ اسی طرح بہت سے

اسیران جنگ آزاد کئے گئے، راجہ جے پال کی نہ صرف جان بخشی بلکہ تاج بخشی بھی کی گئی۔ راجہ نے خراج دینا منظور کیا، اور اس سے معمولی شرائط پر صلح ہوگئی؟

ان واقعات کے ساتھ ساتھ ہی انگریزی مؤرخین کے ان دعوؤں پر نظر ڈالو۔ کہ "محمود محض بہ طمع دولت، اور بانکے راجپوتوں کو بزور شمشیر مسلمان کرنے کے لئے ہند پر حملہ آور ہوتا تھا"

اگر محمود کی مہمات ہند کی غرض وغایت محض اسی قدر تھی (جیسا کہ انگریزی مؤرخین کا اجتہاد ہے) کہ ملک و دولت فراہم کرے۔ تو اس وقت کونسی قوت اس امر کی مانع تھی۔ کہ وہ راجہ جے پال کے ملک و مال پر قابض نہ ہو جائے اور اگر وہ بانکے راجپوتوں کو شمشیر کی نوک سے مسلمان کرنیکا آرزومند تھا۔ تو راجہ جے پال اور اس کے رفقاء راجگان سے زیادہ بانکا راجپوت اُسے اور کون مل سکتا تھا؟ خصوصاً جب وہ سب کے سب بالکل محمود کے قبضہ میں تھے۔ محمود نے جے پال جیسے دشمن کا (جو بار بار بغاوت اور تمرد جیسے جرائم کا مرتکب ہو چکا تھا، جس نے خود پیش قدمی کر کے غزنی پر حملہ کیا تھا) اسے تلوار کے زور سے مسلمان نہیں بنایا، پھر اُسے اس وجہ سے تہ تیغ نہیں کیا بلکہ اس سے نہایت نرمی اور حلم کا سلوک کیا۔ اس کی جان بخشی، تاج بخشی کی، اور معمولی شرائط خراج پر مصالحت کر لی۔ حالانکہ وہ فاتح تھا۔ اور اُسے حق تھا کہ مغلوب و مفرور

دشمن سے کڑی سے کڑی شرائط منظور کرائے۔ مگر آج محمود اور جے پال جیسا واقعہ پیش آئے تو ہم نہیں خیال کر سکتے۔ کہ کوئی فاتح مفتوح کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرے گا۔ جیسا محمود نے جے پال کے ساتھ کیا، حالانکہ آج زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے۔

پس تم ان واقعات کی روشنی میں دیکھو۔ کہ محمود کس حد تک طامع دولت اور کس درجہ بانکے راجپوتوں کا دشمن تھا؛ اس جنگ کے نتائج کے سلسلہ میں مؤرخ ہند (لیتھبرج) لکھتا ہے کہ "راجہ جے پال غیرت کے مارے زیست سے بیزار ہو کر چتا میں بیٹھکر مر گیا اور اس کے بعد اس کا بیٹا راجہ انند پال سلطنت غزنی کا باجگزار راجہ بنا رہا۔

کیا سلطان کی جان بخشی کے بعد راجہ کا خودکشی کرنا دانش مندی سمجھا جا سکتا ہے؟ خصوصاً موجودہ زمانے میں۔ تاہم اس کی ذمہ داری سلطان پر عائد نہیں ہوتی سلطان تو اس کی تاج بخشی کے علاوہ جان بخشی بھی کر چکا تھا۔ جیسا کہ بالتفصیل مذکور ہوا پس سلطان کو اس معاملے میں بھی کون منصف مزاج ملامت کر سکتا ہے۔ وہ تو قابل تعریف ہی کہ اس نے جان بخشی اور تاج بخشی کی۔ مگر ان واقعات کے باوجود آج ہندو ملکہ انگریز اسی ظالم قرار دیتے ہیں

سلطان نے واپسی کے وقت بھیرہ پر بھی حملہ کیا۔ کیونکہ یہ شہر اس وقت بارونق اور تجارتی مرکز تھا۔ نیز مستحکم چھاؤنی۔ پس سلطان نے اسے بھی زیر کیا

حملہ دوم

لیتھبرج صاحب حملۂ دوم کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ ۱۰۰۴ء میں راجۂ بھیرہ پر ہُوا۔ اوراس کی وجہ یہ تھی کہ راجہ نے خراج ادا نہیں کیا "

لیکن یہ بیان عربی اور فارسی تاریخوں سے مختلف یعنی محتاج تنقید ہے۔

بھیرہ کی جائے وقوع دریائے چناب اور جہلم کے درمیان ہے، اوراب بھیرہ ضلع شاہ پور کے علاقہ میں شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ بھیرہ، راجہ جے پال کے دارالحکومت (لاہور) سے کچھ زیادہ دُور نہیں ہے۔ پس یہ بیان قابل قبول نہیں ہے۔ کہ بھیرہ میں کوئی دوسرا راجہ ہوگا۔ جس پر محمود نے دوسرا حملہ کیا۔ اور اگر لیتھبرج صاحب کا یہ بیان قبول کر لیا جائے۔ کہ بھیرہ میں واقعی کوئی خودمختار راجہ بیٹھا ہُوا تھا۔ اور محمود نے ضرور اس پر دوسرا حملہ کیا۔ تو ماننا پڑیگا کہ راجہ جے پال کی حکومت بہت ہی محدود تھی۔ حالانکہ راجہ جے پال کی اولوالعزمی اور فوجی طاقت کا تصور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ علاقہ پنجاب کا واحد وخودمختار راجہ وہی تھا۔ پس لیتھبرج صاحب کا بیان کہ سلطان کا دوسرا حملہ بھیرہ کے راجہ پر ہوا، پا در ہوا ہے۔ کیونکہ بھیرہ کو ایک جُدا حکومت کا مرکز تسلیم کرنے سے جے پال کا علاقہ نہایت محدود رہ جاتا ہے ؎

قدیم عربی تاریخ فتوحات اسلامیہ اور "یمینی" میں لکھا ہے کہ حملہ دوم ویہند پر ہوا۔ ثانی الذکر میں الفاظ شط الویہند آتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ ویہند۔ دریا کے کنارے۔ اور دریا سے پار واقع تھا، اور وہ غالباً دریائے اٹک کے پار تھا۔ پس حقیقت یہی ہے کہ جب سلطان پہلی یلغار سے فارغ ہوا تو بھیرہ پر لشکر کشی کی۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔

سلطان کا دوسرا حملہ درحقیقت بھٹنڈا پر ہوا۔ جیسا کہ تاریخ سیر المتاخرین کے مصنف نے لکھا ہے "سلطان بت شکن۔ راجہ جے پال کو شکست دے کر آگے بڑھا حتیٰ کہ یلغار کرتا اور درمیانی علاقہ تسخیر کرتا ہوا بھٹنڈے پر جا پڑا۔

یہ شہر اس وقت ایک مستحکم قلعہ تھا۔ اور قدامت کے لحاظ سے بھی شمالی ہند میں خاص شہرت رکھتا تھا۔ بہت سی تاریخی روایات اس سے وابستہ تھیں۔ کچھ شک نہیں کہ وہ پنجاب۔ کا ایک بارونق تجارتی شہر تھا۔

بھٹنڈا کی فتح سلطان کی افواج نے حملہ کر کے بھٹنڈا پر گھیرا ڈال لیا۔ اور محصورین دیر تک مقابلہ کرنے کے بعد مغلوب ہوئے۔

سلطان بعد فتح چند روز یہاں مقیم رہا۔ مساجد تعمیر کرائیں اور ان کے

اندر موذن نیز مبلغ لغرض اشاعت اسلام مقرر کیئے۔

ایرانی مؤرخین نے بھٹنڈا کو بترہندہ لکھا ہے۔ غالبًا یہی ویہندہ مشہور ہو گیا۔ یا متاخرین نے اسے یہی سمجھا۔ اور اسی وجہ سے ایرانی مؤرخین کو غلط فہمی ہوئی۔

حملہ سوم

لینتھبرج لکھتا ہے کہ "حملہ سوم ۱۰۰۵ء میں اس لئے ہوا کہ صوبیدار ملتان ابوالفتح نے راجہ انندپال کے ساتھ سازش کر کے سلطان محمود کی اطاعت سے انحراف کیا تھا"

مؤرخ مذکور نے اس سلسلہ میں اتنا اور لکھا ہے کہ سلطان نے اول انندپال کو پشاور کے قریب ہزیمت دی۔ اور پھر ملتان کا محاصرہ کر کے ابوالفتح کو مطیع کیا لیکن یہ بیان مجمل اور اس لئے محتاج تفصیل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سلطان نے حملہ سوم ۱۰۰۵ء میں نہیں بلکہ ۳۹۵ھ میں کیا۔ پھر حملہ ملتان پر نہیں بلکہ براہ ملتان بھٹینر پر ہوا۔

شہر بھٹینر۔ اس زمانہ میں ایک زبردست راجپوت حکومت کا مرکز تھا۔ اور بھاٹیہ راجپوتوں کی راجدھانی تھا۔ راجہ کا نام بجے راؤ تھا۔

بھٹینر پر حملہ

بجے راؤ کو اپنے سامان حرب۔ کثرت فوج۔ بے قیاس مال و دولت۔ اور ہاتھیوں پر بجا فخر و ناز تھا۔ اس کی اقبال مندی کی شہرت ہندوستان بھر میں مشہور تھی۔

بھٹینر کا قلعہ بجائے خود نہایت مستحکم اور ناقابل تسخیر مشہور تھا۔ اس کے

گردگہری اور چوڑی خندق تھی۔ جو پانی سے لبریز رہتی تھی۔

بھٹنیر کی فوج، قبل ازیں راجہ جے پال کی مدد پر جاکر سلطانی فوج سے صف آرا ہو چکی تھی۔ یعنی بھٹنیر پر حملہ آور ہونے کی معقول وجہ پیدا ہو چکی تھی بہر حال سلطانی حملہ ہوا۔ اور راجہ بھٹنیر نے قلعہ سے باہر نکل کر سلطانی افواج کا مقابلہ کیا۔ حتیٰ کہ ہنگامۂ جنگ، تین یوم تک گرم رہا۔ ہندو فوج نے خوب خوب جوہر شجاعت دکھائے۔ لیکن بالآخر ہزیمت کھائی۔ اور فرزندان اسلام غالب آئے

راجہ بجے راؤ کی شکست، فراری۔ اور خودکشی

راجہ چونکہ رزلپا ہوتا ہوا قلعہ کو واپس ہوا۔ مگر مسلم بہادر بھی اس کے ساتھ ہی ساتھ قلعہ میں داخل ہو گئے۔ اور اندر بھی فریقین نے دل کھول کر جنگی فنون، اور جوہر شجاعت دکھائے۔ راجپوتوں نے دانت بھینچ بھینچ کر دشمن پر حملہ کیا۔ تاہم وہ مسلمانوں کو قلعہ سے باہر نکالنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

جب راجہ نے یہ رنگ دیکھا تو وہ مع چند رفقا قلعہ سے نکل کر بھاگا مگر مسلمانوں کو جلد ہی اطلاع ہو گئی۔ چنانچہ فوج کا ایک دستہ تعاقب میں روانہ ہوا۔ حتیٰ کہ اس نے راجہ کو جا لیا۔ مگر غیور راجہ نے خودکشی کو گرفتاری پر ترجیح دیکر اپنے ہی خنجر سے اپنا کام تمام کر لیا۔ اور یہ واقعہ ۳۹۵ھ کا ہے۔

سلطانی افواج اس مہم سے فارغ ہو کر معہ مال غنیمت (جو اُن کا حق تھا)

ملتان کی جانب روانہ ہوئیں۔ مال غنیمت میں ۲۸۰ ہاتھی بھی ہاتھ آئے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ لیتحصبرج کا بیان خلاف واقعہ ہے۔ اور اس نے حملہ سوم کے واقعات حملہ چہارم سے مخلوط کر دئے ہیں۔ جس کی تفصیل ہم آئندہ لکھنے والے ہیں۔
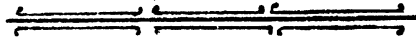
لینپھرج نے یہاں بھی مغالطہ کھایا ہے۔ چنانچہ اس نے حملۂ چہارم کو پنجم کے ساتھ مخلوط کر دیا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے خلاف یعنی حسب ذیل ہے :-

عزم ملتان حملہ چہارم ملتان پر ہوا۔ مگر سلطان اس کے واسطے غزنی سے تازہ دم فوج لے کر نہیں آیا۔ بلکہ بھٹنیر کی تسخیر کے بعد اُدھر چلا۔

اس وقت ملتان کا حکمران داؤد بن نصیر بن شیخ حمید لودی تھا۔ جو عقیدۃً ملحد یا قرامطہ تھا۔ تاریخ میں اسے رئیس ملاحدہ کا نام دیا گیا ہے۔ یہ دراصل مذہب اسماعیلیہ کا پیرو تھا۔ جس کا بانی حسن بن صباح ہوا ہے۔ جو ملتان نیز سندھ میں اپنا مذہب پھیلا رہا تھا۔

اس زمانہ میں اسمٰعیلیہ حکمران برسرِعروج تھے۔ اور اپنے مذہب کی اشاعت میں کوشاں اسماعیلی سلطان، سلطان الحاکم باللہ کا طوطی خوب بول رہا تھا۔ چنانچہ مصر۔ بربر۔ نوبہ۔ افریقہ، شام۔ مغربی۔ جنوبی اور وسطی عرب میں یہی حکومت اور یہی مذہب حکمران تھا۔ غالباً اسی سلطان نے ملتان

اور سندھ میں بھی اپنے مبلغ بھیجے اور داؤد بھی اُن کے اثر میں آگیا۔ اور اُسی نے محمود کے بجائے الحاکم بامراللہ سے سیاسی تعلقات قائم کئے اور اسے ہی زبردست تصور کیا۔

الغرض سلطان محمود نے بہ ایں وجہ ملتان پر حملہ کیا۔ کیونکہ یہاں کا فرمانروا گویا محمود کا سیاسی نیز مذہبی دشمن تھا۔ کہ سلطان خلیفہ بغداد کے ماتحت تھا۔

راجہ جے پال سے آویزش

سلطان محمود، ملتان پر یکایک جا پڑنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے راجہ انندپال (ولد راجہ جے پال) کے علاقہ سے گزر جانے کا ارادہ کیا۔ مگر راجہ مزاحم ہؤا۔ حالانکہ وہ سلطان کا خراج گزار تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ راجہ درپردہ داؤد سے ملا ہؤا یعنی اس کا ہوا خواہ تھا۔ نیز وہ سیاسی ضرورت سے بھی ملتان کی ریاست کا قیام ضروری سمجھتا تھا۔

بہ ایں وجہ مجبوراً راجہ انندپال سے معرکہ آرا ہونا پڑا بالآخر راجہ نے شکست کھائی اور کوہستان کی طرف پسپا ہؤا۔ اس کا ملک اب گویا سلطان کا تھا۔

راجہ کی شکست اور فراری

ناظرین کو یاد ہوگا۔ سلطان راجہ کو دوبار معاف کر کے اسے امان دیکر اس کی جان بخش کر اور اس کا ملک و مال اسے ہی بخش چکا تھا۔ لیکن

راجہ اس کے باوجود سازش کرنے سے باز نہیں آیا۔ اس لئے اُسے ملک و مال سے ہاتھ دہونا پڑا۔

لیکن سلطان نے یہ حملہ بالعمد نہیں کیا۔ کیونکہ اس کی منزل مقصود ملتان تھی۔ مگر راجہ نے خود اُسے مجبور کیا۔ اس بات کے ثبوت میں یہ بات بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ کہ سلطان نے راجہ کا تعاقب نہیں کیا۔ بلکہ ملتان کی طرف کوچ کیا۔
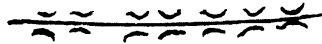
ملتان کی تسخیر

الغرض سلطانی افواج ملتان پر جا پڑیں۔ داؤد بھی اپنا لشکر لے کر میدان میں آیا۔ اور کامل سات یوم تک جدال و قتال ہوتا رہا۔ پھر محاصرہ کی نوبت آئی۔ اور اس کے بعد والئی ملتان نے سلطان کی اطاعت قبول کی

حاکم ملتان کی اطاعت

داؤد نے اپنے باطل عقیدہ سے بھی توبہ کی۔ نیز بیس ہزار درم اخراج دینے کا اقرار کیا۔ اور چونکہ سلطانی مقصد حاصل ہو چکا تھا۔ نیز موسم سرما ختم ہو گیا تھا۔ اور ملتان کی گرمی افواج سلطانی کو تکلیف دینے لگی تھی۔ لہٰذا غزنی کو کوچ کیا گیا۔

"تاریخ فتوحات اسلامیہ (عربی) کے مصنف نے لکھا ہے۔ کہ جب والی ملتان نے انندپال کی شکست کی خبر سُنی اور اپنے میں تاب مقاومت نہ دیکھی تو اپنا مال و خزانہ لے کر سرندیپ کی طرف بھاگ گیا۔"

واپسی

مگر واقعہ یہی ہے۔ کہ ابوالفتح داؤد بن نصر بن شیخ حمید لودی نے اطاعت قبول کی اور اس لئے وہ اس حملہ کے بعد بھی والی ملتان رہا۔

شاہ ترکمان سے معرکہ عظیم

سلطان محمود غزنوی نے ابھی ملتان سے حرکت نہیں کی تھی کہ گورنر ہرات۔ ارسلان جاذب نے خبر بھیجی کہ ایبک خان شاہ ترکستان غزنی پر حملہ آور ہوا ہے۔ لہٰذا سلطان مع افواج قاہرہ غزنی کی جانب روانہ ہوا اور بھٹنڈا وغیرہ علاقہ کی حکومت نومسلم راجہ (سکھ پال) کے سپرد کی۔ یہ راجہ بہ عہد سبکتگین مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔

ایبک خان! یہ ایک زبردست ترکی سردار تھا۔ جو لبعد زوال خاندان سامان بخارا وغیرہ ممالک پر قابض اور متصرف ہو گیا۔ پھر اس نے تاتار بھی فتح کر لیا۔

اب سلطان محمود نے اس سے رشتۂ اتحاد قائم کیا۔ چنانچہ ترکی سردار کی دختر سے عقد نکاح کیا۔ اور اس طرح ایبک خان کی طرف سے مطمئن ہو کر ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔

لیکن یہ تدبیر راس نہیں آئی۔ یہ عزیزداری ایبک خاں کو توسیع حکومت سے باز نہیں رکھ سکی۔ بلکہ جنوب اور مغرب کی طرف بھی بڑھنے لگا۔ یعنی محمودی علاقہ کو تصرف میں لانے کا عزم کیا۔ غزنی کی طرف بڑھا۔ اور جب سلطان کو یہ

اطلاع ملتان پہنچی تو وہ واپس ہوا۔ جیسا کہ ہم پیشتر بھی لکھ چکے ہیں۔

اگر ایبک خان دوراندیش ہوتا تو اس کے لیئے شمال میں سائبریا کے دشت و بیابان اور مشرق میں چین کا علاقہ ترک و تاز کے واسطے کافی تھا مگر نہیں اس نے تو یہ حرکت کی کہ ایک فوج مرتب کر کے اس کا سپہ سالار اپنے سردار سیاوش تگین کو بنا کر خراسان کی طرف روانہ کیا۔ علاوہ ازیں اس نے اپنے ایک اور سردار جعفر تگین کو مع فوج کثیر بلخ کی طرف روانہ کیا۔

خراسان کا سلطانی گورنر ارسلان جاذب تھا۔ مگر جب اس نے ایبک خان کو غزنی کی طرف بڑھتے دیکھا تو وہ ہرات سے غزنی چلا آیا۔ تاکہ مرکز حکومت کو دشمن سے بچا سکے۔ اور چونکہ اس طرح خراسان کا میدان خالی تھا۔ لہٰذا اس پر ایبک خان بآسانی قابض ہو گیا

اب سلطان محمود بھی کوچ کرتا ہوا غزنی جا پہنچا۔ اور پھر بلخ کی طرف روانہ ہوا۔ اور یہ دیکھکر ایبک خاں کا سپہ سالار جعفر تگین وہاں سے بے مقابلہ ہی بھاگ گیا۔

سلطان نے جرنیل ارسلان جاذب کو خراسان روانہ کیا۔ اور وہ ابھی ہرات پہنچا بھی نہیں تھا۔ کہ سیاوش تگین نے اس کی آمد ہی کی خبر سُن کر راہِ فرار اختیار کی۔

خراسان کا معرکہ

جب سلطانی لشکر خراسان جا پہنچا۔ تو ایک خان مقابلہ کے واسطے تیار ہوا۔ علاوہ ازیں اس نے اپنی مدد کے واسطے شاہ چین۔ قدر خان کو بھی طلب کر لیا۔

ہرات سے کوئی چار فرسنگ کے فاصلہ پر میدان رزم تجویز ہوا۔ سلطان محمود بہ نفس نفیس ترتیب صفوف میں مصروف ہوا۔ اس نے سب سے آگے پانسو ہاتھی کھڑے کئے۔ اور ان کے پیچھے سوار فوج۔ قلب میں اپنے چھوٹے بھائی امیر نصر نیز جرنیل عبداللہ طائی کو قائم کیا۔ اور میمنہ فوج بھی یہیں کھڑی کی۔ جیسا کہ مصنف تاریخ یمینی نے لکھا ہے:۔

اسی طرح سلطان نے میمنہ میں جرنیل التونتاش کو اور میسرہ پر ارسلان جاذب کو تعینات کیا۔ اور خود سلطان چیدہ اور جانباز بہادروں کا ایک دستہ لے کر علیحدہ جا کھڑا ہوا۔ تاکہ نازک وقت پر فوج کی امداد کر سکے۔ نیز اپنی ذاتی شجاعت کے جوہر دکھا سکے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ کہ سلطان محمود ذاتی طور پر غیر معمولی شجاع دلیر، مدبر اور اپنے زمانہ کا بے نظیر جرنیل تھا۔

دوسری جانب حریف ایبک خاں بذات خاص تہذیب و ترتیب افواج میں منہمک تھا۔ چنانچہ اس نے قلب میں اپنا دستہ کھڑا کیا۔ پھر قدر خان کو میمنہ پر اور جعفر تگین کو میسرہ پر متعین کیا۔

ہر دو حریفوں کی ترتیب افواج سے ان کی جنگی قابلیت نیز ذاتی شجاعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ایبک خان نے اپنی جگہ قلب میں منتخب کی۔ گویا وسط فوج میں پناہ لی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب وہ اور اس کی فوج حملہ کریگی تو صفوف کی ترتیب درہم برہم ہوئے بغیر نہیں رہے گی۔ پس اظہر ہے کہ یہ امر نقصان سے خالی نہیں اور اس سے ایبک خاں کی جنگی ناقابلیت ثابت ہوتی ہے

اس کے خلاف سلطان محمود اپنی فوج سے علیحدہ کھڑا ہوا۔ تاکہ اپنے بہادروں کو نازک وقت پر امداد دے سکے۔ اور اس سے دور اندیشی ٹپکتی ہے۔

آخرکار مقابلہ شروع ہوا۔ اور جنگ کا زور شور دمبدم بڑھنے لگا۔ حتیٰ کہ بہادر آنکھیں بند کر کے تلوار چلانے لگے۔ انہیں تن بدن کا ہوش نہ رہا اس میں شک نہیں کہ ترکی بہادروں کے حملے شدید تھے۔ مگر غزنوی بہادر بھی برابر کا جواب دے رہے تھے۔ بلکہ بڑھ بڑھ کے داد شجاعت دے رہے تھے۔ لیکن چند لمحہ بعد سین بدل گیا۔ گویا ترکی فوج دبنے لگی۔

یہ دیکھکر ایبک خاں نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ موت کی طرح دشمن پر آپڑا۔ اور میدان کا رنگ بھی بدل دیا۔ مگر محمود بھی میدان کی حالت سے بیخبر نہیں تھا بلکہ جنگ کا تمام رنگ دیکھ رہا تھا۔ پس جب اس نے اپنے بہادروں کے قدم اُکھڑتے ہوئے دیکھے تو فوراً گھوڑے سے کود پڑا۔ اور دو نفل پڑھ کر خدائے تعالیٰ سے خشوع وخضوع کے ساتھ فتح ونصرت کی دعا مانگی۔

اس کے بعد جنگی ہاتھی پر سوار ہوکر اور خاصہ فوج ہمرکاب لے کر دشمن کی طرف بڑھا۔ مرگ ناگہاں کی مانند ایبک خاں کے سر پر جا کھڑا ہوا۔ اور اب مقابلہ نہایت سرگرمی اور شدت سے شروع ہوا۔ خون کا دریا بہ نکلا۔ اور بہادروں کے سر تیر نکلے۔

بہادروں نے چند لمحوں کے بعد دیکھا کہ سلطانی ہاتھی نے ایبک خاں کے نشان بردار کو سونڈ میں لپیٹ کر دور پھینک دیا۔ ترکی علم گر گیا۔ اور اب جنگی ہاتھی نے دشمنوں کو بے دریغ پامال کرنا شروع کیا اور اس طرح بہت سے ترک موت کا لقمہ بنے۔

شجاعان محمودی نے یہ دیکھکر اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ جسے سُن کر دشمنوں کے دل ہل گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ محسوس کیا کہ گویا ان کا آقا مخالفین کے نرغہ میں ہے۔ پس اُنھوں نے ایک پُر جوش حملہ کیا۔ جسے ترک بہادر نہیں برداشت نہ کرسکے۔ حتیٰ کہ ایبک خان اور قدر خاں میدان چھوڑ کر فرار ہو گئے اور سلطان کو

فتح مبین نصیب ہوئی۔

مغرور ترک سرداروں نے اپنے ممالک محروسہ کا رُخ کیا۔ مگر سلطان بھی اُن کے تعاقب میں روانہ ہُوا۔ اور ایبک خاں کو گرفتار کر لینے کی جدوجہد کی۔ تین رات متواتر تعاقب کیا۔

اس وقت معرکہ نہایت سخت تھا۔ سردی غیر معمولی۔ اور برف شدت سے پڑ رہی تھی۔ اس لئے سلطانی فوج تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ اور تعاقب کے خلاف تھی۔ البتہ سلطان عزم بالجزم کر چکا تھا۔

ایک شب سلطانی فوج خیمہ زن تھی۔ سلطانی خیمہ کے اندر گرم انگیٹھیاں روشن تھیں۔ جس کی گرمی اس قدر بڑھی کہ کئی سرداروں نے اپنے پوستین اُتار دیئے۔ بعض کو پسینہ آنے لگا۔

اسی اثنا میں ایک غلام باہر سے آیا۔ سُلطان ہنس کر اس سے بولا۔ کہ جاؤ جا کر سردی سے کہ دو۔ کہ اب تمہاری جد وجہد بیکار ہے۔ ہم پر تمہارا جادو نہیں چل سکتا۔ تو ہمیں مغلوب نہیں کر سکتی۔

غلام یہ سُن کر باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر میں واپس آ کر شاہی خدمت میں عرض گزار ہُوا۔ حضور! سردی حضور کے پیغام کے جواب میں کہتی ہے۔ کہ اگرچہ آج میری رسائی حضور تک نہیں ہے۔ لیکن آج رات سائیسوں اور خدمتگاروں کی ایسی خدمت کروں گی۔ کہ کل گھوڑوں کی خدمت خود حضور اور حضور کے امراء

کو کرنی پڑے گی۔

سلطان اس امر کو فوراً سمجھ گیا۔ تاہم اس وقت سنکر خاموش ہؤا۔ مگر صبح کو واپسی کا حکم دیا۔ چنانچہ محمودی فوج غزنی کی طرف روانہ ہوئی۔ اور ایبک خاں سلطان کی زد سے محفوظ رہا۔

ترکوں کی شجاعت تاریخی اور مسلمہ ہے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ایبک خاں ترک سلطان محمود سے شکست کھا کر اور جان بچا کر بھاگا۔ پس اسی بات سے اس امر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی فوجیں (جن کی قوت کو ترکوں سے دور کی بھی نسبت نہیں) محمودی فوج کا کیسے مقابلہ کرسکتی تھیں۔
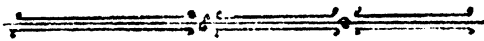
راجہ سکھپال کی سرکشی

سلطان محمود بھٹنڈا وغیرہ کی حکومت راجہ سکھپال کو سپرد کرکے ایلک خاں کی سرکوبی کے واسطے ہندوستان سے خراسان روانہ ہوکر جنگ میں معروف ہوا تھا۔ مگر جب سکھ پال نے دیکھا کہ محمود مشکلات میں پھنس گیا ہے۔ اور اب میرے لئے اچھا موقع ہے۔ تو اس کے خیالات بدل گئے۔ وہ سرکشی پر آمادہ ہوگیا۔ اس کی ہندو رعایا نے اسے غیرت دلائی۔ ہندو راجوں نے امداد کا وعدہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھپال نے علم بغاوت بلند کردیا۔ اور مرتد ہوگیا۔

سلطان کو اس حادثہ کی خبر پہنچی تو ہندوستان کی طرف روانہ ہوگیا۔ لیکن اس نے اس کے ساتھ ہی امرائے پنجاب کو راجہ کی سرکوبی کے لئے احکام بھیجے۔ چنانچہ ان لوگوں نے محمود کے ہندوستان پہنچنے سے پیشتر ہی سکھ پال کو شکست دے کر قید کرلیا۔

سکھ پال کچھ مدت بعد بحالت اسیری ہی مرگیا۔

انگریز مورخ لینھبرج نے سلطان محمود کے پانچویں حملے کو (جو راجہ اندپال پر ہوا) غلطی سے چوتھا حملہ قرار دیا۔ اور اس نے حسب معمول اس کے اسباب بھی مخفی رکھے ہیں۔ چنانچہ لکھدیا ہے کہ یہ حملہ ۱۰۰۸ء میں راجہ اندپال پر ہوا۔

مگر ہم اس کے بھی اسباب تلاش کریں گے۔

(۱) سلطان اندپال اور اس کے باپ جے پال کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا۔ یعنی جان بخشی، ملک بخشی اور تاج بخشی کی۔ مگر اندپال نے اس کے باوجود گزشتہ حملے میں سلطان کا رستہ روک کر گویا والی ملتان کی امداد کی

حاکم ملتان ابوالفتح داؤد لودی اور اس کے بزرگ (باپ نصر اور دادا شیخ حمید) مدت سے سلطان کے باجگزار چلے آتے تھے۔ مگر اب اس نے محض اندپال کے ابھارنے سے تمرد دکھایا۔ گویا اس شرارت کا بانی بھی اندپال ہی بنا۔ اور یہ بنا مخاصمت معمولی نہیں ہے۔ کیونکہ اندپال نے معاہدہ کی خلاف ورزی صریحاً اور علانیہ تھی۔

(۲) لیکن راجہ اندپال کو اس بات کی جرأت کیسے ہوئی؟ اور اس کی طبیعت

میں یہ انقلاب کیسے ہؤا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک سنگین سازش کا نتیجہ تھا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ جے پال نے سلطان کا مقابلہ پوری طاقت اور کامل طیاری سے کیا تھا اور اکثر راجاؤں نے اپنی افواج بھیجکر اس کی امداد کی تھی لیکن اب ہندوستان کے راجہ یہ باتیں تسلیم نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ بہادران ہند شکست جے پال کا سبب ہندو فوج کی کمزوری اور غزنویوں کی شجاعت نہیں قرار دیتے۔ بلکہ انند پال کے مقابلہ کو معمولی مقابلہ قرار دیتے تھے۔ حالانکہ امر واقعہ یہ نہیں تھا

اس وقت ہندو سرداروں اور تمام قوم کے خیالات ارفع اور شجاعانہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کے موجودہ تمول اور کثرت آبادی کے مقابلہ میں مفلس اور چند ہزار آبادی رکھنے والی سلطنت غزنی کی کیا ہستی ہے۔ اور ان کا یہ خیال واقعات کی بنا پر تھا۔ کیونکہ محمود گزشتہ مہمات میں چند ہزار سے زیادہ بہادر کبھی نہ لا سکا تھا۔ خواہ نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہوا ہو۔ پس اگر ہندو قوم کو (جس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے) یہ یقین تھا کہ اگر سورج بنسی اور چندر بنسی خاندانوں کے چشم و چراغ متحد ہو کر غزنویوں کے مقابل آئیں تو دشمن کے ایک ایک سپاہی کے مقابلہ کے لئے اپنے سو سو بہادر میدان میں بھیج سکیں گے۔ اور دشمن کا نام و نشان صفحہ ہستی سے مٹا دیں گے! تو کون تعجب کی بات ہے۔ یہ محض زبانی دعوے نہیں تھے۔ بلکہ اس وقت فی الحقیقت ہندو قوم کا دل جوش سے

لبریز تھا۔ راجگان ہند نے ہندو فوج کو قومی خطرہ کا تصور دلا کر ان میں روح شجاعت پھونک دی تھی۔ اور خود باوجود طوائف الملوکی کے بیرونی دشمن سے متحد و متفق ہو کر سینہ سپر ہونے کو تیار تھے۔ برہمنوں، ہندو فقرا (سادھوؤں) اور پجاریوں نے اپنے حلقۂ اثر میں پُرجوش تقاریر کر کے ہندو فوج کو خطرناک دشمن کے استیصال پر آمادہ کر دیا تھا۔ انگریز مورخ ہند لکھتا ہے کہ:۔

"اس وقت ہندوؤں کے دلوں میں عموماً ایک ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور کیا مرد کیا عورت سب کے سب جان و مال سے مدد دینے کو طیار تھے۔ چنانچہ عورتوں نے جواہرات اور زر لیور بیچ کر اس جنگ میں مدد دی۔ اور گکھڑ[1] اور پہاڑی جنگجو قوموں نے

[1] محمودی فوج کا مقابلہ قوم "گکھڑ" نے نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ قوم "کھوکر" تھی۔ لیتھبرج صاحب کو مغالطہ ہوا ہے۔ طبقات ناصری میں صاف طور پر لفظ "کھوکھر" موجود ہے۔ "طبقات" ٹائپ کے حروف میں چھپی ہوئی ہے۔ دیگر تواریخ جو پتھر کے چھاپے کی ہیں ان میں لفظ "کھوکھر" کو بلا واؤ "گھکر" لکھا ہے۔ اس وجہ سے مورخ مذکور کو مغالطہ ہوا کہ وہ اس لفظ کو "گکھڑ" سمجھے۔ مگر یہ غلطی ہے۔ اس مغالطہ کے اور بھی وجوہ ہیں۔ مثلاً اس زمانہ میں گکھڑ قوم عین اس موقع پر آباد ہے۔ جہاں کھوکر قوم نے غزنوی اور غوری فوجوں کا مقابلہ کیا ہے۔ یعنی دریائے جہلم سے پرے پہاڑ کے متوازی اضلاع جہلم و ہزارہ میں۔ قوم "گکھڑ" خود سلطانی افواج کے مقابلہ سے انکار کرتی رہی۔ چیف آف گکھڑ (راجہ جہاں داد خاں صاحب مرحوم)

متفق ہوکر محمود کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

الغرض ہندوؤں نے کامل اتحاد اور کامل جوش سے کام لیا۔ حتیٰ کہ ہندو بیوہ عورتوں نے چرخے کی کتائی سے بہادروں کی خدمت وامداد کی اور اس طرح قوم پرستی اور وطن پرستی کا ثبوت بہم پہنچایا۔ یہی باتیں قومی زندگی کا ثبوت، اور اس لئے ہر زمانہ میں قابل ستائش ہیں۔

اس قدر اسباب موجود تھے جن کے سہارے راجہ آنندپال نے سلطان محمود کے بالمقابل اظہار تمرد کیا ان وجوہ کے ہوتے ہوئے یہ کہنا صحیح نہیں کہ غزنویوں کی فتحیابی کا راز ہندوؤں کی نااتفاقی کے اندر مضمر ہے۔

الغرض بہادر راجہ آنندپال اپنا ٹڈی دل لشکر لے کر میدان میں آیا۔ اور نواح پشاور کو رزم گاہ بنایا۔[۵۲] ہندو فوج کی تعداد لاکھوں تھی۔ فوجوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا اور اس طرح تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ قریب ہی غزنوی فوج خیمہ انداز تھی۔ سلطان نے اپنے لشکر کے گرد دو طرفہ خندق کھدوائی۔ تھی اور مورچے طیار کرائے۔ تاکہ پُرجوش دشمن دفعتاً نہ آپڑیں۔

(نوٹ صفحہ ماقبل) کا بیان ہے کہ ہم نے سلطان محمود کی قوم سے مقابلہ نہیں کیا۔ لفظ گھکر کی اصل "کے گہر" (کیانی نسل) ہے۔ اور ہماری قوم خود سلطان محمود کی معیت میں ہندوستان کے اندر داخل ہوئی تھی؛　۵۲ اگلے صفحے پر ملاحظ فرمائیں۔

یہ تدبیر بالخصوص ایسی صورت میں زیادہ کارآمد ثابت ہوا کرتی ہے۔ جب دشمن کی تعداد کثیر ہو۔ سلطان کے خندق طیار کرانے سے اس کی اعلیٰ دور اندیشی کا ثبوت ملتا ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

چالیس روز گزر گئے لیکن حملہ میں تقدیم کسی جانب سے نہیں ہوئی۔ یہ قیاس تو محض غلط ہوگا کہ ہندو خائف تھے۔ اس وجہ سے پیش قدمی نہیں کرتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ گھر سے نکل کر آتے ہی کیوں؟ پھر ان کی تعداد غزنویوں سے کم از کم تین گنی تھی۔

اور سلطان محمود حملہ میں کیوں پیش قدمی نہیں کرتا تھا؟ وہ دشمنوں کی کثرت سے خائف تھا؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ وہ اس مذہب کا پیرو تھا۔ جس میں کثرت کوئی باوقعت شے نہیں۔ مگر تاخیر کی تلاش کے لئے زیادہ دقت نظری کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کا یہ عام قاعدہ رہا ہے کہ وہ جنگ میں

ؔ تاریخ یمینی (صفحہ ۲۲۴) میں میدان جنگ "شط الویہند" لکھا ہے۔ لیکن مقام "ویہند" مشکوک ہے۔ کیونکہ یہ جغرافیہ حال میں نہیں پایا جاتا۔ ممکن ہے کہ ویہند دریائے سندھ کے کنارے کوئی مشہور قلعہ یا شہر ہو۔ اگر سلطان نے دریائے سندھ عبور کرکے ہندو فوجوں کا مقابلہ کیا تو پھر میدان جنگ حضرو اور کیمل پور کا علاقہ تھا ورنہ دامن دریائے کابل (لنڈہ) میں یہ معرکہ ہوا ہوگا۔ یعنی نوشہرہ کے قریب +

سبقت نہیں کیا کرتے بلکہ دشمن کے حملے کے منتظر رہتے ہیں ؎

کرتے جوں کو وہ نہیں ہم تو سخن میں سبقت

پر سُنے گا وہی جو کچھ کہ کہے گا ہم کو

میدان میں آکر تاخیر تابکے؟ آخر سبقت سلطانی فوج ہی کو کرنی پڑی۔ سلطان
نے ایک ایک ہزار تیر اندازوں کے دستوں کو دشمنوں کے مقابلہ میں بھیجنا شروع
کیا۔ یہ بہادر اپنے شجاعانہ جوہر دکھاتے ہوئے نہایت خوبصورتی سے پسپا
ہوجاتے اور اس طرح دشمنوں کو اسلامی مورچوں کی زد پر لے آتے تھے اور
کچھ شک نہیں کہ اس طرح دشمن کا نقصان زیادہ اور مسلمانوں کا کم ہوا لیکن
بایں ہمہ ہندوؤں کا جوش دمبدم ترقی پر تھا۔ اسی اثنا میں ایک غیر معمولی ہلچل نظر
آئی۔ یعنی باوجود مسلمانوں کی مذکورہ بالا احتیاطی تدابیر کے تیس ہزار خوفناک
دشمن سر و پا برہنہ خندق عبور کرکے غزنوی لشکر میں داخل ہوگئے۔ یہ کھوکھر
لوگ تھے جنھوں نے تیغ و خنجر سے مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کیا[۱] اور دیکھتے
ہی دیکھتے تین چار ہزار مجاہدین کو خاک و خون میں ملا دیا۔ حقیقت میں دشمن کو
بدحواس کرنے کی یہ ایک چال تھی۔ اس چال بازانہ حملے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ
سلطان کا قصہ پاک کردیا جائے۔ یا کم از کم وہ فراری پر مجبور ہو۔ لیکن سلطان

[۱] کھوکھروں کے حملے کے ساتھ ہی راجہ انند پال کے ہاتھی بھاگنے کا تاریخوں
میں تذکرہ ہے۔ لیکن راجہ کھوکھروں کے حملے میں شریک نہ تھا۔

کے تیور پر ذرا میل اور بہ الفاظ مورخ ہند (لیتھبرج صاحب) محمود کی دلیری اور استقلال میں ذرا فرق نہ آیا"

غزنی کے بہادروں نے سینہ سپر ہوکر خوفناک دشمنوں کو کلہ بہ کلہ جواب دیا۔ تاہم ہندو فوج کا جوش دمبدم ترقی پر تھا۔ اور قریب تھا کہ مسلمان ہزیمت اٹھائیں کہ سلطان نے یہ رنگ دیکھکر نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ جناب باری میں دعا کی۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنے غلامان[1] خاصہ کی فوج ہمراہ لے کر مثل شیر غراں دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ اب تو باقی اسلامی مجاہدین کے بھی حوصلے چہار چند ہو گئے۔[2] انھوں نے مجاہد اعظم (محمود) کو اپنی پشت پر خوفناک دشمنوں کے مقابل دیکھا۔ الغرض میدان جنگ کا رنگ بدل گیا۔ غزنوی بہادروں نے بقیۃ السیف کھوکھروں کو اسلامی مورچوں سے نکال باہر کر دیا۔ مگر متنی صمیمین مورچوں سے باہر داد شجاعت دیتے رہے۔ جس کا سلسلہ صبح سے شام تک جاری رہا۔ کسی فریق نے میدان سے ہٹنے کا نام نہیں لیا۔ عین اس وقت مجاہدین نے ایک شدید حملہ کیا۔ راجہ انند پال قلب لشکر میں موجود تھا۔ ایک مسلمان کا نیزہ اس کے ہاتھی کی آنکھ میں لگا۔ جس پر راجہ سوار تھا۔ اور وہ میدان سے بھاگ کھڑا ہوا۔

---

[1] "فتوحات اسلامیہ" "فتوحات بنویہ"

[2] "تاریخ یمینی"

یہ نظارہ دیکھکر ہندو فوج کے پاؤں کے نیچے سے گویا زمین نکل گئی کچھ تو اس واقعہ نے رجسے ہندو فوج اپنے سپہ سالار راجہ کی فراری سمجھی) اور کچھ مسلمانوں کی بے نظیر شجاعت۔ استقلال۔ دلیری اور ثابت قدمی نے ہندو فوج پر خاص اثر ڈالا حتیٰ کہ وہ میدان سے بھاگ کھڑی ہوئی یہ ہزیمت اٹک کے قریب میدان جنگ میں ہوئی۔

بعض کتب تواریخ میں کھوکھروں کے حملے کے ساتھ ہی راجہ انندپال کے ہاتھی بھاگنے کا تذکرہ ہے۔ لیکن راجہ کھوکھروں کے حملے میں شریک نہ تھا۔ البتہ شام تک جو مقابلہ مورچوں سے باہر ہوا۔ اس میں راجہ شریک تھا۔ پھر صبح سے شام تک کی جنگ کا ذکر ہے۔ لیکن یہ جنگ مورچوں کے باہر ہوئی۔ اگر لشکر گاہ کے اندر ہوتی تو صرف چار ہزار نہیں بلکہ اس سے فریقین کے کئی گُنے جوان خاک و خون میں ملتے۔ اور مسلمان یقیناً ہزیمت کھاتے۔

جب ہندو فوج نے راہ فرار اختیار کی تو سلطان محمود نے عبداللہ طائی کو پانچ ہزار عربوں اور ارسلان جاذب کو ہزار ترکوں کی جمعیت کے ساتھ اس کے تعاقب میں روانہ کیا۔ جس نے دو شبانہ[1] روز کوچ کرکے آٹھ ہزار دشمنوں کا ستھراؤ کیا۔ اور اس کے بعد واپس آئی

[1] تاریخ فرشتہ

ہندو فوج لاکھوں تھی ۔ سات آٹھ ہزار فوج کا اس کے تعاقب میں جانا امر عجیب ہے ۔ غالباً اس کا مقصد بعض دشمنوں کو منتشر اور میدان جنگ سے دور کر دینا تھا ۔

جب میدان جنگ میں دشمنوں کا نشان تک نہ رہا ۔ تو سلطان نے راجہ انند پال کے تعاقب کا عزم کیا ۔ اور وہ بالآخر راجہ کے اثر و سراغ سے بھیم نگر (نگرکوٹ) جا پہنچا ۔ یہ مقام ہندوؤں کا مقدس مقام ہونے کے علاوہ ایک مستحکم و پختہ قلعہ تھا ۔ اور دشوار گزار تھی ۔ اس کی بہت سی توقعات نگرکوٹ کے دیوتا کے ساتھ وابستہ ہوں گی ۔ وہ انہیں امیدوں پر نگرکوٹ گیا ۔ مگر ارسلان بھی اس کے تعاقب میں وہاں جا پہنچا ۔ اگر راجہ وہاں نہ جاتا تو غالباً محمود بھی ادھر نہ جاتا ۔

نگرکوٹ کی مہم

سلطان محمود، راجہ کے تعاقب میں نگرکوٹ (حال کانگڑہ) (جو کوہ ہمالہ کے دامن میں واقع ہے) پہنچا۔ لیکن اس سے پیشتر راجہ وہاں سے نکل گیا اور اس نے اپنا سر ہمالہ کے دور دست علاقوں میں جاکر چھپایا۔ نگرکوٹ اور وہاں کے لوگوں کو بے پناہ چھوڑ گیا۔

اس میں شک نہیں کہ نگرکوٹ کا قلعہ نہایت مستحکم اور عظیم الشان تھا، اور اس کے ناقابل تسخیر ہونے کی روایات یا افسانے مدت سے مشہور چلے آتے تھے۔ لیکن یہ باتیں مجاہدین کی پسپائی کے لیے کافی نہ تھیں۔ چنانچہ خود اس کے حوصلے غزنویوں کے تار توڑ حملوں سے لوٹ گئے۔ ان کی ہمت نے جواب دیدیا۔ حتیٰ کہ انھوں نے امان لے کر قلعہ فاتحین کے سپرد کر دیا۔

سلطان مع اپنی فوجی سرداروں کے قلعے میں داخل ہوا۔ لیکن نہ کسی ایک ہندو کی جان لی۔ نہ کسی کو زبردستی مسلمان کیا۔ اور نہ کسی کو قید کیا۔ البتہ حسب قاعدہ مجاہدین۔ بت توڑے۔

انگریزی مؤرخ الفنسٹن صاحب نے مسلمان حکمرانوں خصوصاً سلطان محمود کے متعلق جو کچھ خامہ فرسائی فرمائی ہے اس کا ہم نے جابجا تذکرہ کیا ہے۔ بایں ہمہ الفنسٹن صاحب صاف صاف الفاظ میں تسلیم کرتے ہیں کہ

"محمود غزنوی نے ایک ہندو کو بھی جبراً مسلمان نہیں کیا - اور نہ اس کی برق دم تلوار وسوائے میدان جنگ کے کسی ہندو کے خون سے آلودہ ہوئی -

کہتے ہیں - کہ اس قلعہ سے بیشمار[1] مال غنیمت سلطان کے ہاتھ آیا - لیکن مال غنیمت بہرحال فاتح کا حق ہے - اور یہ حق آج بھی ساقط نہیں ہوا بلکہ قائم ہے -

مؤرخ لیتھبرج اس مہم کے متعلق لکھتا ہے کہ

" (محمود نے) اٹک کے قریب راجہ کو شکست فاش دی ...... پھر محمود نگر کوٹ یعنی کوٹ کانگڑاہ کی طرف روانہ ہوا - یہ مقام ہندوؤں کا بڑا تیرتھ ہے اور کوہ ہمالہ کے دامن میں واقع ہے - یہاں پہنچ کر محمود نے مندر کو خوب لوٹا - اور بیشمار دولت لے کر غزنی کی طرف مراجعت کی - یہ عبارت بھی مبہم اور مغالطہ دہ ہے - فاضل مؤرخ نے واقعہ تو نگر کوٹ پر محمودی حملہ آوری کا بیان کیا ہے - لیکن سبب واقعہ سے اغماض کیا ہے - یہ سچ ہے کہ محمود نگر کوٹ گیا لیکن مفرور راجہ کے تعاقب میں - اس کا مقصد براہ راست حملہ نگر کوٹ نہ تھا - اگر راجہ وہاں نہ جاتا تو یقیناً سلطان بھی اس جانب عازم نہ

---

[1] کہتے ہیں کہ ایک (۱۵×۳۰) گز کمرہ چاندی سے پُر تھا - بیس من جواہرات بھی تھے - علاوہ ازیں قیمتی مال ومتاع نفیس و نایاب اشیا - سونے چاندی کے برتن کروڑوں روپیہ کی مالیت کے تھے *

ہوتا۔ اس لئے نگرکوٹ کے نقصانات کی ذمہ داری محمود سے زیادہ راجہ پر پڑتی ہے۔ جس کی تفصیل ہم قبل ازیں لکھ چکے ہیں

"محمود نے مندر کو خوب لوٹا۔ اور بیشمار دولت لے کر مراجعت کی"

فاضل مؤرخ کے یہ فقرات خاص طور پر معنی خیز ہیں۔ راجہ کا نگرکوٹ میں پناہ گیر ہونا۔ اس کے تعاقب میں سلطان کا جانا۔ نگرکوٹ والوں کا مقابلہ کرنا۔ پھر امن طلب کرنا۔ گویا ان تمام واقعات پر پردہ ڈال کر صرف مندر کا لوٹنا بیان کر دیا ہے۔ یعنی اپنی کتاب پڑھنے والوں کے یہ ذہن نشین کیا ہے کہ محمود کا مقصد مندر کے لوٹنے سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔ اگر تھا تو بیشمار دولت حاصل کرنا۔ العجب ثم العجب۔ کیا یہ امر ایک دیانتدار مؤرخ کے شایان شان ہے!

دولت بجائے خود ناقابل توجہ شے نہیں۔ البتہ اس کے صحیح استعمال پر دنیا کا مفاد مبنی ہے۔ دولت وہی مبارک ہے۔ جس سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچے۔ ورنہ برائے نہادن چہ سنگ وچہ زر۔ یہی اشتراکیین مغرب کا مذہب ہے۔

قومی اور ملکی خزانہ خواہ وہ ارباب حکومت کی تحویل میں ہو یا پیشوایان مذہب کے زیر سیادت وہ بہرحال قوم اور ملک کا مال ہے۔ اور اس کا جائز متصرف یہی ہے کہ وہ قوم اور ملک کی بہبودی پر صرف کیا جاسکے۔ اس کے ذریعے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کی سرکوبی کی جائے۔ ہر مہذب ملک وقوم کا یہی مسلک ہے۔

اسلامی بیت المال کا بھی یہی مطلب اور مقصد تھا۔ کوئی خزانہ خواہ وہ مسجد و خانقاہ یا مندر کے صندوقوں میں بند ہو۔ یا شاہی خزانہ میں داخل ہو اس کا مالک کوئی شخص واحد نہیں ہوسکتا۔

جس زمانہ کے واقعات پر ہم خامہ فرسائی کر رہے ہیں۔ اس زمانہ میں ہندو نقطۂ خیال سے سب سے بڑی قومی ضرورت یہ تھی کہ بیرونی دشمنوں خصوصاً محمود ایسے دشمن ملک وملت کا پوری قوت کے ساتھ استیصال کیا جائے کچھ شک نہیں کہ ہندو قوم نے کامل ایثار سے کام لیا۔ بیوہ عورتوں تک نے حب الوطنی کا ثبوت دیا۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ بایں ہمہ نگرکوٹ کے مندر کے پجاریوں نے ایک پھوٹی کوڑی تک اس قومی ضرورت کے لئے نہیں نکالی۔ اور اس بخل کا نتیجہ معلوم!

اس دولت بے قیاس سے جس کا تذکرہ اوپر گزرا۔ اگر بہادران ہند کی امداد کی جاتی تو کیا بہ اسباب ظاہر ہندو قوم کے حق میں اس سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا تھا؟

پس وہ تاروانی دولت جو محض چند بت پرست بلکہ دولت پرست پجاریوں کی ذاتی آسائش اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے مقید تھی اور ہندوؤں کی فوجی ضروریات پر نہیں صرف کی گئی تھی۔ اور جو اس واسطے قومی سرمایہ نہ تھی۔ اگر وہ دولت ایک خدا پرست گروہ کے قبضہ میں آگئی تو

کیا محل تاسف ہے ؟ جس کا بیشتر حصّہ قوم اور علم و عمل پر صرف ہوا۔

سلطان اس مہم سے فارغ ہوکر واپس غزنی گیا اور وہاں ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا۔ اس کے بعد سنہ ۴۰۱ ہجری میں داؤد حملہ آور ہوا۔ ان واقعات کی تفصیل آئندہ آئیگی۔
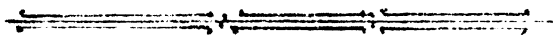
الحاقِ ملتان

معرض تحریر میں آچکا ہے۔ کہ ملتان کی نام نہاد اسلامی ریاست محض ہندو مفاد کے لئے قائم کی گئی تھی۔ پھر یہ بھی لکھا جاچکا ہے۔ کہ راجہ انندپال سے والی ملتان کے لئے کس قدر نقصان اُٹھایا۔ اور ہم یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ کہ داؤد نے سات یوم تک سلطانی فوج کے ساتھ مقابلہ کر کے بالآخر سپر ڈال دی۔ اپنے عقائد باطلہ سے توبہ کی۔ اور بیس ہزار درم خراج دینا منظور کیا۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن ابوالفتح (والئ ملتان) اور اس کے متوسلین، نہ تو سازشوں سے باز آئے اور نہ ارتداد والحاد سے (جس کی اطلاعات سلطان کو وقتاً فوقتاً ملتی رہتی تھیں) اور ظاہر ہے کہ یہ علامات اچھے نہ تھے۔ ان سے دیگر مسلمانوں کے عقائد فاسد ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ بہ ایں وجوہ اواخر ۱۰۱۰ء میں سلطان ملتان پر حملہ آور ہوا۔ اور والی ملتان کو شکست فاش دیکر اور قید کر کے اپنے ہمراہ لے گیا۔ اور قلعہ غور میں نظر بند کر دیا۔ بقیۃ السیف ملحدین کا بھی قلع قمع کیا گیا۔ اور اس طرح علاقہ ملتان کا الحاق سلطنت غزنیں میں ہوا۔ ابوالفتح حالت قید ہی میں مر گیا۔

اس مقام پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے ۔ کہ سلطان محمود نے ان ملحدین کو جیسی جیسی شدید اور المناک سزائیں دیں ۔ کسی ہندو یا غیر مسلم مفتوح کو بوجہ اختلاف مذہب ہرگز نہیں دی ۔ کیونکہ اسلام نے غیر مسلم کے متعلق حکم دیا ہے ۔ کہ

لا اکراہ فی الدین

دین میں زبردستی نہیں ہے ۔ عیسٰے بدین خود موسٰی بدین خود

اس مہم کا ذکر فاضل لینپھرج اپنی تاریخ میں بعنوان حملہ ششم یہ الفاظ ذیل کرتا ہے :-

"۱۰۱۴ء اس حملہ میں محمود نے تھانیسر کے مشہور تیرتھ کو (جو سرستی اور جمنا کے مابین واقع ہے) لوٹا اور شہر کو جلا دیا۔ اور بیشمار ہندوؤں کو قید کرکے غزنی لے گیا۔"

اس اجمالی بیان سے صرف مندر کا لوٹنا۔ شہر کا جلانا اور بیشمار ہندوؤں کا قید کر کے غزنی لے جانا معلوم ہوتا ہے۔ یعنی سلطان محمود اور ایک ڈاکو میں فرق نظر نہیں آتا۔ اس لیئے یہ اجمال محتاج تشریح و توضیح ہے۔

یہ امر کوئی پوشیدہ نہیں ہے کہ سلطان محمود پکا موحد خدا پرست اور اس لیئے بُت پرستی اور باطل پرستی کا کٹر دشمن تھا۔ اور شرک و بدعات کا استیصال وہ اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا۔ جیسا کہ اس کے سوانحعمری پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہے۔

سیاسی اسباب قدرتی طور پر کچھ ایسے پیدا ہو گئے۔ کہ سلطان کو بار بار

بت کدۂ ہند کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔ اور اس تقریب سے اسے مشرکین و
بُت پرستانِ ہند کے عجیب و غریب عقائد کا علم وقتاً فوقتاً ہوتا رہا۔ اسی سلسلے
میں اسے بتایا گیا کہ تھانیسر کا مندر ہندوؤں کے لئے اس قدر مقدس و
محترم ہے۔ جس قدر مسلم کے لئے بیت اللہ۔ اور کہ یہاں کا بت جگ سوم
(معاذ اللہ) بہ صفات الٰہیہ موصوف یعنی خالق و رازق اور قدیم ہے۔ اس کی
عمر دُنیا کے برابر ہے۔ سبحان اللہ تعالیٰ

بُت کریں آرزو خدائی کی　　　　شان ہے اس کی کبریائی کی

اسلام باطل پرستیوں کے استیصال کے واسطے دُنیا میں آیا۔ پیغمبر اسلام نے مشرکین
عرب کی شوکت و قوت سے مرعوب نہ ہو کر بُت پرستی کے خلاف آواز اُٹھائی۔
اور بالآخر اسے مٹا کر دم لیا۔

سلطان محمود غزنوی بھی ایک غیرت مند خادم اسلام تھا۔ پھر خدائے تعالیٰ
نے اسے قوت و شوکت ایسی لغنیش بھی عطا کی تھیں۔ پس وہ ہند کی بُت پرستی
اور مشرکین ہند کے باطل عقائد کو کس طرح ٹھنڈے دل سے دیکھ سکتا تھا!
اس کی رگ حمیت پھڑکی۔ اور وہ ۱۰۱۴ء ۴۰۲ھ عازم بُت کدۂ تھانیسر ہوا۔ لیکن اس
نے آئینِ اعتدال کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ کسی معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کی۔
وہ ڈاکوؤں کی طرح نہیں آیا۔ بلکہ قوی باز و مجاہد کی مانند تھانیسر پہنچنے کیلئے

راجۂ لاہور کے علاقہ سے گزرنا تھا۔ اور ان دنوں سلطان کی والیٔ لاہور (راجہ انندپال)[1] سے مصالحت تھی۔ پس سلطان نے راجہ کو لکھا کہ[2]

"مجاہدین تھانیسر کا عزم رکھتے ہیں۔ تمہارا علاقہ رستے میں پڑیگا۔ پس اپنے آدمی بھیجو کہ وہ ہمیں تمہارے علاقہ کی حدود بتاتے چلیں کہ تمہاری رعایا کو ہمارے آدمیوں سے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے۔ راجہ انندپال نے اپنے علاقہ کے بقالوں اور تاجروں کو حکم دیا کہ وہ سلطانی لشکر کے لئے ہر ایک پڑاؤ پر سامان رسد مہیا کریں تاکہ مجاہدین کو کسی قسم کی زحمت نہ ہو[3]"

علاوہ ازیں راجہ نے اپنے دو ہزار ہندو سوار اپنے بھائی کی سرکردگی میں سلطان کی معیت میں بغرض شرکت مہم تھانیسر بھیجے۔ اس کے ساتھ ہی مضمون ذیل کا مراسلہ سلطان کی خدمت میں بھیجا:۔

"اگر حضور عزم تھانیسر کو فسخ فرمائیں۔ تو آئندہ اس علاقہ کا خراج بھی سلطانی خزانہ میں حاضر کر دیا جایا کرے گا۔ بُت کدۂ تھانیسر اس ملک کے باشندوں کا

---

[1] یہ بیان فرشتہ کا ہے۔ لیکن بیہقی میں تحریر ہے کہ جنگ سوم کے بعد تاوان جنگ معاف[?] میں پچاس ہاتھی وغیرہ دینے والا شخص راجۂ سَرد ج پال تھا۔ جو تھانیسر یا دہلی کا راجہ ہو سکتا ہے۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ نگر کوٹ کی شکست کے بعد سلطان محمود اور راجہ انندپال کے تعلقات دوستانہ ہو گئے تھے۔

[2] تاریخ فرشتہ۔ [3] تاریخ فرشتہ

معبد ہے ۔ گو حضور کے دین میں بتوں کا توڑنا موجب ثواب ہے ۔ لیکن سلطان یہ ثواب نگرکوٹ سے حاصل کر چکے ہیں ۔ اگر سلطان نے میری نیازمندانہ درخواست قبول فرمائی تو علاوہ خراج تھانیسر کے یہ نیازمند ہر سال پچاس ہاتھی اور دیگر تحائف خدام سلطان کی خدمت میں حاضر کیا کرے گا

سلطان نے اس مراسلے کا جواب ویسا ہی دیا جس کی اس دشمن شرک و ضلالت سے اُمید ہو سکتی تھی ۔ چنانچہ اس نے راجہ کو لکھا :-

"جس قدر بت کدوں کو مسمار کر کے وحدانیت کی ترویج کی جائے اُسی قدر دین اسلام میں زیادہ کار ثواب ہے ہم ہندوستان سے بت پرستی کی بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ بتوں کے توڑنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے ۔ مہم تھانیسر کا بھی یہی سبب ہے ۔ اور اس خدمت الٰہی سے ہم ہرگز باز نہیں رہ سکتے " [1]

ہندوؤں کی جنگی اور قومی روح ابھی بالکل فنا نہیں ہوئی تھی کہ وہ ایسے نازک موقع پر خاموش بیٹھے رہتے ۔ راجہ دہلی [2] نے ہندوؤں میں جوش بھرنا چاہا کہ وہ محمود کا حیرت انگیز مقابلہ کریں ۔ لیکن سلطان ایسی جلدی ان کے سر پر جا پڑا کہ ہندو کچھ تہیہ نہ کر سکے ۔ ہکے بکے رہ گئے ۔ سلطان اور مجاہدین نے بت جگ سوم کے

[1] تاریخ فرشتہ

[2] فرشتہ

علاوہ اور سینکڑوں بتوں کو پاش پاش اور بت خانوں کو مسمار کر دیا۔

مال غنیمت[1] حسب معمول حق فاتح تھا۔ بت جگ سوم غزنی لے جا کر بے سر کر دیا گیا۔ اس مہم کا مقصد محض خرابی بت کدہ تھانیسر تھا جو حاصل ہو گیا۔ یعنی سلطان نے واپسی کا نقارہ بجوایا۔ دوسرے موسم گرما کا بھی آغاز ہو چلا تھا۔ اور فوجوں کو غزنیں جیسے سرد ملکوں میں آرام کی ضرورت تھی۔

اس قدر وقیع واقعات کی تفصیل معلوم ہو جانے کے بعد اب پھر لیتھبرج صاحب کے مہمل بیان کو دہراؤ کہ

"محمود نے تھانیسر کے مشہور تیرتھ کو لوٹا۔ اور شہر کو جلایا۔ اور بیشمار ہندوؤں کو قید کر کے غزنی لے گیا"۔

ان فقروں کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ محمود کا مقصد محض

(۱) مشہور تیرتھ کو لوٹنا تھا۔

اور (۲) شہر کو جلانا

اور (۳) بیشمار ہندوؤں کو قید کرنا۔

لیکن کیا یہ سچ ہے؟

ہم بالتفصیل بتا چکے ہیں کہ اس حملے کا مقصد محض استیصال بت پرستی

---

[1] کہتے ہیں کہ مندر میں سے ایک یاقوت وزنی (۴۵۰ مثقال) دستیاب ہوا تھا جو قیمت اور چمک دمک میں اپنی نظیر آپ تھا۔

تھا۔ اور اگر غارت گری ہوتا (جس کی غایت محض حصول زر ہوتی ہے) تو اس کے لیے تو راجہ جے پال، راجہ سر دیچ پال اور خود ہند و قوم موجود تھی۔ لیکن وہ شخص جس نے بُت فروش کہلانے کے مقابلہ میں بُت شکن کہلانا پسند کیا وہ اپنے خودداراً نہ عمل سے کس طرح باز رہ سکتا تھا!

رہا مالِ غنیمت کا مسئلہ، مالِ غنیمت بلاشبہ فاتح کا حق ہے۔ اور آج بھی تہذیب و تمدن کا زمانہ اس حق کو جائز رکھتا ہے۔

محمود کے شہر تھانیسر کے جلانے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ افسوس کہ ذمہ دار اشخاص کے قلم سے کس طرح ایسی باتیں نکل جاتی ہیں۔ اگر اس کی کوئی اصلیت ہے۔ تو محض توپ و تفنگ کے ذریعے گولہ باری کرنی۔ اور بس۔

ہم نے جہاں تک تحقیق کیا ہے۔ کوئی خاص تعداد نہیں۔ کہ ہم تھانیسر میں وہ قید کر کے غزنی لے جائی گئی ہو۔ لیکن اگر اس بیان کی کوئی اصلیت ہے تو محض اس قدر کہ بیشمار اسیران جنگ غزنی لائے گئے۔

اسیران جنگ کو آج بھی فاتح اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

ایک اور پہلو سے ان واقعات پر نظر ڈالو

آج ہمارے کانوں میں آوازیں گونج رہی ہیں۔ کہ ہند و مذہب بُت پرست نہیں۔ باطل پرست نہیں۔ بلکہ خدا پرست ہے۔ ویدوں میں بُت پرستی کی تعلیم نہیں۔ بلکہ خاص وحدانیت کی تعلیم ہے۔ بہت اچھا۔ مبارک چشم ما

روشن دل ماشاد!

اس سے زیادہ یہ کہ آج ہندوؤں کا ایک معقول حصّہ (جو تعلیم یافتہ اور گویا ملک کا دماغ ہے) بالکل مسلمانوں کی مانند شرک اور بُت پرستی کا دشمن ہے اس مسئلہ پر بحث کرنے کا محل نہیں ہے۔ کہ آیا قدیم سے ویدوں میں خدا پرستی کی تعلیم ہے یا بُت پرستی کی۔ اور نہ اس امر پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ کہ بُت کدۂ ہند میں توحید کے نغمے محض خدام اسلام (جس میں محمود غزنوی اور خواجہ معین الدین اجمیری جیسے دونوں قسم کے بزرگ شامل ہیں) کی بدولت آج سُننے جارہے ہیں۔ لیکن ہم اس قدر ضرور عرض کریں گے کہ حالات اور اہل ہند کے عقائد کی تبدیلی نے اس طویل فردجرم کو جو محمود پر لگائی گئی ہے۔ آج بہت مختصر کردیا ہے۔ اس لئے کہ آج ہندوؤں کے کثیر حصہ کے نزدیک بھی بُت شکنی اور مندر شکنی کوئی جرم نہیں ہے۔ بلکہ امر مستحسن ہے۔ الحمد للہ

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر مے خواست

آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر۔ پدید

نندنہ گڑھ کی فتح

ان دنوں پنجاب میں نندنہ ایک مستحکم قلعہ تھا۔ اس کا محل وقوع کوہ بال ناتھ (ٹلہ) نواح جہلم ہے۔ یہ قلعہ ہندوستان آتے ہوئے عین غزنی کے بالمقابل تھا۔ گویا غزنوی مجاہدین کا سد راہ تھا۔ راجہ سروج پال (راجہ برہمن پال) خلف راجہ جے پال نے اب اس قلعہ کی نئے سرے سے مورچہ بندی کی تھی اور اپنی دانست میں اسقدر مستحکم کرلیا تھا۔ کہ وہ بہادران غزنی کو کم از کم اس قدر وقت تک روکے رہے کہ راجہ کی فوج کیل کانٹے سے درست ہوجائے۔

ہوشیار سلطان راجہ کے عزائم سے بیخبر نہ تھا اور وہ قلعہ نندنہ کو اپنا سنگ راہ سمجھتا تھا۔ اس لئے اس نے ۴۰۴ھ میں اس قلعہ پر حملہ کردیا۔

اسوقت راجہ خود یہاں موجود تھا لیکن اپنی کامیابی کو مشکوک دیکھکر اسنے قلعہ اپنے چند معتمد اور شجاع امراء کے سپرد کیا اور خود کوہستان کشمیر کی جانب معہ چند ہمراہیوں کے کوچ کیا۔

قلعہ نندنہ پر متواتر جنگ ہوتی رہی۔ اہل قلعہ نے قوت بھر مدافعت کی۔ مگر بے سود۔ غزنویوں نے قلعہ تسخیر کرکے اس پر قبضہ کرلیا۔

اب سلطان راجہ کے تعاقب میں کشمیر گیا۔ لیکن راجہ اور آگے نکل گیا اور دشوار گذار دروں میں سر چھپایا۔ حتیٰ کہ سلطان کے ہاتھ نہ آیا۔ تاہم اس مہم سے بھی کچھ کم فائدہ نہیں ہؤا کہ کشمیر میں اسلام۱ اس طرح پھیلا جس طرح بن میں آگ

۱ پنجاب اور ہندوستان کے اندرونی صوبوں کی بہ نسبت کشمیر میں بہ سہولت اسلام پھیلنے کے اسباب پر مؤرخین نے گفتگو کی ہے۔ کوئی اہل کشمیر کی بزدلی پر محمول کرتا ہے تو کوئی اُن کی زر پرستی پر۔ فرزندان اسلام جہاں بھی پہنچے انھوں نے قبل از جنگ غیر مسلموں کے روبرو (۱) اسلام (۲) جزیہ (۳) اور تلوار پیش کی، کون کیا پسند کرتا ہے۔ اپنی اپنی پسند۔ اس کا انحصار پسند کرنے والوں کے دل و دماغ پر تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے پنجاب اور ہند میں حسب قاعدہ اسلام بالترتیب یہی تین چیزیں پیش کیں یہاں کے راجگان نے یا تلوار ہاتھ میں لی یا جزیہ دینا قبول کیا۔ اور اپنے قدیم مذہب پر قائم رہے۔ کشمیر میں جب سلطان نے یہ تینوں چیزیں پیش کیں۔ تو وہاں دوسری قسم کے واقعات پیش آئے۔ یعنی یہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اب جو شخص اسے جبری اشاعت اسلام کہے ہم اس کے دماغ کے ذمہ وار نہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم ؂

مہماتِ کشمیر

مذکورہ بالا مہم کے بعد سلطان نے ۴۰۶ھ میں کشمیر پر حملہ کیا۔ اس حملہ کو بعض مؤرخین نے دوسرا حملہ قرار دیا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں اس لئے کہ سلطان ۴۰۵ھ میں محض راجہ کے تعاقب میں گیا تھا۔ نہ کہ تسخیر کشمیر کے عزم سے

قوی حملہ آور کی زد سے محفوظ رہنے کا ایک طریقہ یہ ہے۔ کہ جب بوقت حملہ آوری اپنے میں تاب مقاومت نہ دیکھے تو کسی محفوظ مقام میں پسپا ہو جائے اور حملہ آور واپس ہو۔ تو اپنے مقام پر واپس آجائے۔ حال میں سرحدی اقوام اسی اصول سے کام لیتی رہتی ہیں۔ زمانۂ ماضی میں مرہٹہ قوم (جس کا نام ہی اس وجہ سے پڑا) بھی اسی اصول پر کاربند تھی۔

راجہ جے پال اور اس کے جانشینوں نے یہی طرز عمل اختیار کیا۔ جس کی تفصیل اوپر گزری۔ چنانچہ قلعۂ نندنہ کے حملہ کے وقت مہاراجہ کوہستان کشمیر کے دروں میں پناہ گیر ہوا۔ لہٰذا سلطان کو یہ ضروری معلوم ہوا کہ کشمیر کو تسخیر کر کے دشمن کو بے پناہ کر دے۔

سلطان محمود اور اس کا لشکر یلغار کرتا ہوا (۴۰۶ھ / ۱۰۱۵ء) کشمیر جا پہنچا قلعہ لوہ کوٹ کا محاصرہ شروع ہوا۔ یہ قلعہ استحکام اور رفعت کے لحاظ سے

اپنی نظیر آپ تھا۔ کوہ ہمالیہ کی سر بکف کشیدہ چوٹیاں قدرتی غار اور خندقیں گویا اس کے استحکامات کو چار چاند لگا رہی تھیں۔

محاصرہ کو کئی ماہ گزر گئے۔ اسی اثنا میں شدید برف باری شروع ہو گئی۔ اور سردی نے بہادران غزنی کو تنگ کرنا شروع کیا۔ لہٰذا سلطان نے بلا حصول نتائج ہی واپسی کا نقارہ بجوایا۔

یہ واپسی بھی تکالیف سے خالی نہ تھی۔ غزنوی فوج سوء اتفاق سے ایک ایسے مقام میں جا پڑی، جہاں پانی ہی پانی تھا۔ اور عبور دریا کا کوئی سامان نہ تھا غزنی جاں باز بحمد اللہ و مجریہا کہتے ہوئے دریا میں کود پڑے۔ اگرچہ ان میں سے ایک معقول تعداد دریا ہی میں شہید ہوئی۔

مؤرخین کا بیان ہے۔ کہ یہ پہلا صدمہ تھا۔ جو مہمات ہند میں غزنی بہادروں کو برداشت کرنا پڑا۔ مسٹر لیتھبرج نے زیر عنوان "ساتواں حملہ" سلطان کی مہم کا بہ الفاظ ذیل ذکر کیا ہے:-

"یہ حملہ کشمیر پر ہوا۔ مگر فوج رستہ بھول گئی۔ اور جاڑے کا موسم آگیا اس لئے نہایت زحمت اٹھائی۔ اور بہت سے آدمی ہلاک ہوئے"

قنوج کی مہم

اس وقت شہر قنوج ہندوستان کا قلب، شمالی ہند میں راجپوتوں کی قوت کا مرکز، مال و دولت کی فراوانی کے ساتھ علم و فضل اور مذہب کا بھی ملجا و ماویٰ، ہندو قوم کی جنگی اور فوجی قوت کا مرکز تھا۔ اس کی عظمت و قدامت کی روایات تمام ہندوستان میں مشہور تھیں

کہتے ہیں کہ قنوج کی فصیل پندرہ کوس سے کم نہ تھی۔ اور شہر کے اندر تیس ہزار تو صرف تنبولیوں ہی کی دکانیں تھیں۔

راجۂ قنوج کنوار (کورہ) ہند میں شہنشاہ (مہاراجہ ادہراج) مانا جاتا تھا۔ جری سپاہ اس کے پاس کافی تھی۔ تیس ہزار سوار، پانچ لاکھ پیادے اور اسّی ہزار زرہ پوش ہر وقت دار الحکومت میں موجود رہتے تھے۔ علاوہ ازیں کل راجپوت گویا سپاہی تھے۔ باقی رعایا بھی فوجی مذاق سے آشنا تھی۔ اور بوقت ضرورت ملک و قوم کی حفاظت کی اپنے میں اہلیت رکھتی تھی۔

فاضل لیتھبرج لکھتا ہے کہ

" اس زمانہ میں قنوج کمال رونق پر تھا۔ اس میں اس قدر دولت تھی، جس کا کچھ حد و حساب نہیں اور یہاں کا راجہ جو اکثر مہاراجہ ادھیراج کے لقب سے ممتاز

ہوا کرتا تھا۔ اس کا دربار نہایت تجمّل کا تھا"

سلطان جب پنجاب کو زیر کر چکا تو اس نے تسخیر قنوج کا عزم کیا۔ تاکہ اپنے مخالفین کے اس مرکز کو بھی کمزور کرے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک لاکھ بیس ہزار جانباز (جن میں علاقہ ماوراء النہر کے بیس ہزار مجاہدین فی سبیل اللہ (والنیٹر) بھی شامل تھے) لے کر غزنی سے اٹھا۔ لینپھرج صاحب لکھتے ہیں کہ یہ فوج غزنی اور سمرقند کے علاقوں سے بھرتی کی گئی تھی۔

مدبر اور دور اندیش سلطان نے مناسب سمجھا کہ پنجاب کا عام رستہ نظر انداز کر کے کوئی خاص رستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اور ایسی عجلت سے دشمن کے سر پر جا پہنچنا چاہیئے کہ وہ اپنے اوسان درست نہ کر سکے۔

مورخ لینپھرج صاحب لکھتے ہیں کہ

"محمود یہ فوج ہمراہ لے کر پشاور سے روانہ ہوا۔ اور پہاڑوں کے نیچے نیچے پنجاب کے دریاؤں کے منبعوں کے قریب ہوتا ہوا قنوج پہنچا"

دیگر مؤرخین نے بھی محمودی لشکر کے عبور دریا کا موقع منبع ہائے دریا ہی لکھا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے کہ پنجاب کے دریاؤں کے منبعے کوہ ہمالیہ میں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی عجلت کے وقت وہاں تک پہنچنا محالات سے ہے۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ فوجوں کو ایسے مواقع پر دریا سے عبور کرایا گیا ہوگا۔ جہاں ان کا عرض (پاٹ) کم سے کم تھا۔ اور اس طرح کشتی

کے عارضی پلوں کے ذریعے فوج بہ آسانی اتر گئی ہوگی۔ یہاں پر مزاحمت کا بھی اندیشہ نہ تھا۔

ایسا موقعہ کونسا ہو سکتا ہے؟ کشمیر، جموں اور چمبا کے کوہستانی مقامات یہاں پنجاب کے دریا، پہاڑ سے میدان میں گرتے ہیں۔ اس مقام پر دریاؤں کا عرض بھی کم ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اسی مقام کو مؤرخین نے منبع دریا لکھا ہو

اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے۔ کہ اس مہم میں سلطانی فوجوں کا رہنما راجہ کشمیر تھا۔ الغرض محمودی لشکر اس بار پنجاب کے اندر سے نہیں گزرا۔ بلکہ دامن کوہ ہمالیہ اور دروں سے گزر کر قنوج جا پہنچا۔

کم نہیں سوا لاکھ فوج کا مع ساز و سامان کوہستان اور دروں سے گزارنا، پھر ایسے بے آب و گیاہ غیر آباد پہاڑی مقامات میں انتظام رسد کرنا آسان بات نہیں۔ پس اسی سے سلطان کے تدبر اور جنگی قابلیت کا اندازہ کرو

محمودی فوجیں نواح قنوج میں جا پہنچیں۔ مقابلہ شروع ہوا۔ اہل قنوج اور والی قنوج کی طاقت و شوکت کے نقشے ہمارے ناظرین دیکھ چکے ہیں۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ لوگ آرام سے اپنے گھر میں تھے۔ اس کے برخلاف غزنوی رنج غربت سہتے۔ دشت نوردی اور کوہ پیمائی کرتے وطن سے دور پڑے تھے

بایں ہمہ غزنوی ہر مقام میں غالب رہے۔ حتیٰ کہ اسلامی فوجوں نے قنوج کے سات حفاظتی قلعے یکے بعد دیگرے تسخیر کر لئے۔ اور یہ دیکھکر بہ این شان و

شوکت راجۂ قنوج کی کمر ٹوٹ گئی۔ اس کی ہمت نے جواب دے دیا۔ راجہ قلعہ سے نکل کر سلطان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ سر نیاز جھکایا۔ سلطان عزت و محبت سے پیش آیا۔ امان دی۔ تاج بخشی کی۔ قنوج۔ اور اہل قنوج کو رتی برابر کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا تین روز یہاں قیام کیا۔ تمام مؤرخ متفق اللفظ ہیں۔ خاص قنوج تاخت و تاراج سے محفوظ رہا۔ کسی ہندو کو راجہ کی اعانت کے بعد تکلیف نہیں دی گئی۔

مورخ لینپھبرج لکھتے ہیں کہ

"جب محمود قنوج پر آیا تو راجہ نے اپنے تئیں اس کے حوالے کر دیا۔ اس پر محمود اس کے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آیا۔ بلکہ اس کا دوست بن گیا" سلطان نے وقت پڑے پر اس کی مدد کا وعدہ کیا۔ بعض انگریزی مورخین نے محمود کے حملوں کی غرض و غایت دستبرد مال و دولت اور بانکے راجپوتوں کو بزور شمشیر مطیع اسلام کرنا بتایا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو قنوج جیسا شہر اور راجہ قنوج جیسا بانکا راجپوت محمود کو اور کہاں مل سکتا ہے۔ پھر وہ اپنے دل کے حوصلے کیوں نکالتا بایں قوت و شوکت راجہ قنوج کے سپر ڈالنے اور باوجود عقوبت سفر و مصائب غربت برداشت کرنے کے سلطان کے اس حملہ کی کامیابی پر نظر استعجاب ڈالی گئی ہے۔ اور اس کے اسباب و علل تلاش کئے گئے ہیں۔ چنانچہ زمانۂ حال کے ایک مورخ کی رائے ہے کہ :-

"راجہ قنوج ۔ سلطان کے مقابلہ کی کافی طاقت رکھتا تھا ۔ مگر مسلمانوں کے تین سو سال کے مظفرانہ رعب اور خود سلطان محمود کی شجاعانہ فتوحات (خصوصاً فتح جنگ پشاور نے جس میں ہندوؤں نے مجموعی طاقت اور کمال مذہبی جوش و اتفاق سے مقابلہ کیا تھا) ہندوؤں کے دلوں میں محمودی رعب جما دیا تھا۔ اس رعب میں راجہ قنوج آ گیا ۔"

راجہ برن اسی مہم کے سلسلے میں سلطانی افواج راجہ ہردت والیٔ برن (مراد آباد) کے علاقہ تک پہنچیں ۔ مگر یہاں کا راجہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ اور بطوع رغبت خود داخل حلقۂ اسلام ہوا ۔ لکھا ہے کہ یہ مع افواج و اُمرائے دربار اسلام لایا تھا [1]

راجہ گل چند برن کا معاملہ طے کر کے غزنوی فوجیں یلغار کرتی ہوئی مہابن جا پہنچیں ۔ اس قلعہ کا والی ذاتی طور پر شجاع اور صاحب سپاہ جرار تھا ۔ لیکن بمقتضائے طبیعت اپنی جمعیت لے کر جنگل (بن) میں گھس گیا مگر غزنوی بہادروں نے اسے وہیں جا لیا ۔ یادگار معرکہ پڑا ۔ راجہ کی فوج کو ہزیمت ہوئی ۔ حتیٰ کہ اس غیور نے مایوس ہو کر اپنے آپ کو جوہر کر لیا ۔ قلعہ پر سلطانی پرچم لہراتا نظر آیا ۔ بیشمار مال غنیمت فاتح کے ہاتھ آیا ۔ لکھا ہے

[1] راجہ برن فرار ہو گیا ۔ رعایا نے دو لاکھ پچاس ہزار روپیہ نقد اور تیس ہاتھی دے کر امان طلب کی (تاریخ فرشتہ)

کہ اس معرکہ میں راجہ کی پچاس ہزار سے کم فوج نہ تھی۔ لہ

قلعہ منج دے واسی

کانپور کے قریب ایک قلعہ منج دے (مجھاؤں) واقع تھا۔ غزنوی بہادروں نے دیکھتے دیکھتے اس کی فصیل توڑ ڈالی۔ پھر قنوجی برہمنوں کا زور توڑتے ہوئے قلعہ آسی (اسونی) تک جا پہنچے۔ یہاں کا راجہ چندپل شجاعت میں یگانہ سمجھا جاتا تھا۔ اس قلعہ کے گرد گنجان جنگل اور اس جنگل میں سانپوں کی کثرت تھی۔ علاوہ ازیں اس کے گرد عمیق خندق۔ لیکن ان میں سے کوئی مشکل ایسی نہ تھی جو سلطان اور اُس کے رفقا کو پیچھے قدم اُٹھانے پر آمادہ کر سکتی۔ حتیٰ کہ یہ لوگ اپنے عزم بالجزم اور استقلال کی بدولت تمام مشکلات پر غالب آ گئے۔ قلعہ دار راجہ کو راہ فرار اختیار کرتے ہی بنی۔ مجاہدین نے قلعہ کو سرنگوں سے اُڑا دیا۔

قلعہ شروا

اب قلعہ شروا مجاہدین کے سدراہ تھا۔ اور یہاں کا والی راجہ چندکیل کانٹے سے درست کھلے میدان میں مقابلہ کرنے کے لئے طیار تھا۔ لیکن اسے اس کے ایک خیرخواہ دوسرے راجہ نے مشورہ دیا کہ وہ گنجان جنگلوں میں پناہ گیر ہو جائے۔ اس پر اسنے عمل کیا سلطانی فوج نے وہاں بھی اسکا پیچھا نہ چھوڑا تعاقب کرتی ہوئی اسکے سر پر جا پہنچی۔ اگرچہ جنگل اور پہاڑوں کے غاروں سے تکلیف اٹھائی تاہم کامیابی کا سہرا انہیں کے سر رہا۔ سلطان پھر اس راجہ کے پاس ایک ہاتھی تھا جسکی قیمت سلطان معقول دیتا تھا۔ لیکن یہ قبل از جنگ خود بخود سلطانی لشکر میں آ گیا اور اسکا نام خداداد رکھا گیا۔

لہ برن اور دہابن کے واقعات کا ذکر بعض مورخین نے حملہ قنوج سے قبل کیا ہے۔ لیکن بعد کے واقعات ہیں جیسا کہ ہم نے لکھا۔ تاریخ فرشتہ میں بھی بوقت واپسی ان مہمات کا ذکر آیا ہے۔

متھرا

لینتھبرج صاحب اس مہم کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ

"یہاں محمود نے اپنی فوج کو بیس روز تک شہر لوٹنے کی اجازت دی متھرا سے اس کی فوج اس قدر ہندوؤں کو پکڑ کر لے گئی ۔ کہ غزنی میں دو دو روپے کو ہندو غلام بکا"

ہم اس بیان کو واقعات کی عینک سے دیکھیں گے یا اور اس کی تنقید و تجزیہ کریں گے ۔

متھرا آج بھی ہنود کا ایک مشہور تیرتھ ہے ۔ اس لئے کہ وہ سری کرشن جی کا مولد و مسکن ہے ۔ حملۂ محمودی کے وقت متھرا کو اور بھی عظمت و تقدیس حاصل تھی ۔۔ وہ گویا ہندو قوم کی قوت کا مرکز تھا ۔ جسے مذہبی رنگ نے اور بھی عظمت بخشی تھی ۔ اور ہزاروں برس سے اس کی یہی کیفیت چلی آتی تھی ۔

متھرا کی فصیل شہر سنگین تھی ۔ ایک پہلو میں دریائے جمن موجیں مار رہا اور اس طرف کے دروازوں کو بوسہ دیتا تھا ۔ مگر اُسے کسی قسم کا نقصان پہنچانے پر قادر نہ تھا ۔ خود سلطان نے تعمیر متھرا کی لاگت کا اندازہ ایک لاکھ دینار لگایا تھا ۔ اور ان عمارات کو بہ نظر استعجاب دیکھا تھا ۔

شہر کی دونوں جانب ہزار قصر تھے۔ یہ تمام عمارات چونہ گچ کی بنی ہوئی تعیر ان کے اندر بُت رکھے ہوئے تھے۔ وسط شہر میں ایک نہایت عظیم الشان معابد کردوار تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ عجائبات سے تھا۔

اس کے اندر سونے کے پانچ بُت ہوا میں معلق تھے۔ جن میں سے ایک کی آنکھوں میں یاقوت[1] جڑے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے بُت کی آنکھیں صاف چمکدار پلکیں[2] یاقوت کی تھیں۔ ایک بُت کے دونوں پاؤں خالص سونے کے تھے[3]

چاندی کے بُت ان کے علاوہ تھے جن کی تعداد دو سو[4] سے کم نہ تھی

"بُت شکن" کہلانے پر فخر کرنے والا سلطان اور اس کے موحد رفقا اپنے گرز گراں لے کر باطل معبودوں کے سروں پر جا پہنچے۔ اور ان کو پاش پاش کر دیا۔ بعضوں کو جلایا۔ گلایا۔

معلوم یہ ہوتا ہے۔ کہ متھرا اور اس کے نواح میں غزنوی بہادروں کی مزاحمت اور مدافعت بالکل نہیں کی گئی۔ اور یہ عجیب بات تھی۔ کیونکہ پیشتر کے واقعات میں اہل ہند نے تقریباً تمام شمالی ہند میں تیغ ہندی کے جوہر اہل غزنی

---

[1] ہر ایک کی قیمت پچاس ہزار دینار

[2] وزن ۴ ۱/۲ سو مثقال

[3] وزن (۲۴۰۰) مثقال۔ کل تینوں کے سونے کا وزن (۹۸۳۰۰) مثقال

[4] بار کیصد اشتر

کو دکھائے تھے۔

دہلی متھرا سے نہایت قریب ہے۔ سلطان نے نواح متھرا کے سات قلعے تسخیر کر لئے۔ لیکن کوئی ہندو سردار اس کے مقابل نہ آیا۔ راجہ دہلی بھی میدان میں نہ نکلا۔ ان واقعات پر غور کرنے سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

اس وقت ہندو قوم کی فوجی روح بالکل فنا ہو گئی تھی۔ سری کرشن جی کی زندگی کے دو متضاد پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مہابھارت کے میدان[۵۱] میں جہاد کی فلاسفی سمجھاتے نظر آتے ہیں۔ دوسرا وہ جب کہ یہ بانکا برج کی نازنینوں کے ساتھ مصروف ہو کر عشق مجازی کا سبق دیتے نظر آتے ہیں[۵۲]۔ معلوم ہوتا ہے کہ حملہ محمودی کے وقت بالعموم تمام ہندو اور بالخصوص متھرا کے ہندو کرشن جی کے دوسرے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ کیونکہ سامان تعیش سونے چاندی کی فراوانی تھی۔ لتعجب تو یہ ہے کہ آج بھی متھرا کے ہندوؤں کی زندگی میں یہی رنگ موجود ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت دہلی اور راجہ دہلی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ دہلی محض چھوٹی سی ریاست ہوگی۔ ورنہ وہ ضرور متھرا کی حفاظت میں تلوار اٹھاتا۔ خواہ نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہوتا۔

اگر دہلی، اس وقت کچھ بھی عظمت رکھتی۔ تو سلطان اس پر ضرور حملہ آور ہوتا

---

[۵۱] گیتا

[۵۲] دیکھو بھاگوت پران

"اِن مہمات سے فارغ ہو کر جب سلطان اور غزنوی کے مجاہدین غزنی کو واپس چلے ہیں تو بیشمار مال غنیمت ان کے قبضہ میں تھا۔ جس میں طلا و نقرہ سب کے علاوہ بیش قیمت جواہرات۔ دیگر قیمتی اشیا اور تین سو ہاتھی بھی تھے۔ اسیران جنگ کی تعداد پچاس ہزار بتائی گئی ہے۔ لیکن یہ مال غنیمت صرف متھرا کا نہ تھا بلکہ قنوج۔ برن۔ مہابن۔ منج دسے۔ آستی۔ سشروا۔ متھرا اور نواح متھرا کے سات قلعہ جات سے حاصل ہوا تھا۔ ان معرکوں کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

اسیران جنگ کی پچاس ہزار تعداد بادی النظر میں حیرت انگیز ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ وہ صرف متھرا سے حاصل نہیں ہوئی۔ بلکہ قنوج وغیرہ پندرہ بیس مقامات سے۔ ظاہر ہے کہ ان علاقوں کی آبادی کروڑوں تھی۔ اور اسیران جنگ محض سپاہی پیشہ تھے جنھوں نے آخر دم تک ہتھیار نہ ڈالے۔ نہ کہ غیر مصافی تھے۔ پس لینپھبرج صاحب کا یہ اجتہاد مغالطہ دہ ہے کہ "تمام متھرا سے سلطان کی فوج اس قدر پکڑ کر لے گئی۔ کہ ہندو غزنی میں دو دو روپے کو فروخت ہو گیا"

ممکن ہے کہ بقول لینپھبرج صاحب غزنی میں اسیر جنگ دو دو روپے کو فروخت ہو گیا ہو (اگرچہ قدیم تاریخوں میں اس کا ذکر نہیں) غزنی کی آبادی کروڑوں نہیں ہزاروں تھی پس پچاس ہزار غلاموں کو کون خریدتا؟ مگر یہ جملہ اسیران جنگ فوجی تھے غیر فوجی نہ تھے۔ لینپھبرج صاحب نے مبہم الفاظ استعمال کئے ہیں۔ کہ سلطان اس قدر ہندوؤں کو پکڑ کر لے گیا۔ ان الفاظ کے عام معنی یہ ہیں کہ سلطان غیر مصافی

ہندوؤں کو خواہ مخواہ اسیر کر کے لے گیا۔ حالانکہ یہ محض غلط ہے۔ کسی معرکہ میں ایسا نہیں ہوا۔ غیر مصافی رعایا ہر جگہ محفوظ و مامون رہی۔

دوسرا مغالطہ یہ ہے۔ کہ "اس قدر ہندو" (پچاس ہزار) صرف متھرا سے لے گیا۔ متھرا والوں نے تو مقابلہ ہی نہیں کیا۔ پھر اسیران جنگ کیسے؟ درحقیقت اس قدر اسیران جنگ قنوج۔ برن وغیرہ دیگر علاقوں سے حاصل ہوئے تھے۔ نہ کہ متھرا سے

"سلطان نے اپنی فوج کو بیس روز تک متھرا کو لوٹنے کی اجازت دی"۔ یہ حضرت لیتھبرج کا ارشاد بالاجتہاد ہے۔ لیکن اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہمیں تو اس بات کے قبول کرنے میں بھی تامل ہے۔ کہ محمودی فوجیں یہاں بیس یوم ٹھہری تھیں!

تم بہت سے واقعات کی تفصیل پڑھ چکے ہو۔ سلطان کے بہت سے معرکوں کی تفصیل آئندہ آئے گی۔ اور تم دیکھو گے کہ سلطان کو نہ ہندوؤں سے کوئی خاص دشمنی تھی۔ نہ شہروں کے تباہ کرنے کا شوق۔ نہ عمارات کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا ولولہ۔ بقول لیتھبرج صاحب سلطان متھرا کی اعلیٰ عمارات کو دیکھ کر دنگ رہ گیا، اور اس وقت اس نے بھی غزنی میں عظیم الشان عمارات بنانے کا عزم کیا۔ پس اس کی لشکرکشیاں یا یہ فتوحات ملکی غرض سے تھیں، یا استیصال کفر و ضلالت کی غرض سے۔ وہ خداپرست اور بت شکن پیغمبر عربی کا خادم اور اس لئے

بُت پرستی۔ عناصر پرستی اور تمام قسم کی باطل پرستیوں کا دشمن تھا۔ وہ کفر و ضلالت کا استیصال کرنا، بُت و بُت خانوں کو خراب کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا۔ تاکہ باطل پرستوں کے دلوں سے بے جان و باطل معبودوں کی عظمت اُٹھائے۔ اور واحد خالق خدا کی عظمت کا سکہ بٹھائے یہ باتیں لازم و ملزوم تھیں۔ مثلاً اگر سلطان بُتوں کو توڑ کر ان کو بے جان ثابت نہ کرتا تو کون کہہ سکتا ہے۔ کہ آج بھی ہندوؤں کے دل بُتوں کے غلام نہ ہوتے۔

مسلمان غلاموں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے تھے؟ اسلامی غلامی کے کیا معنی ہیں؟ اسیران جنگ سے کیا سلوک کیا جاتا ہے؟ یہ مستقل مباحث ہیں اور جداگانہ عنوان چاہتے ہیں

مہم تھانیسر کے سلسلے میں ہم نے لکھا کہ ہندوؤں کے عقائد میں حیرت انگیز انقلاب آچکا ہے۔ آج وہ مسلمان سے کم بُت پرستی کے دشمن نہیں۔ اور واحد خدا کی عبودیت کا دم بھرتے ہیں۔ الحمد واللہ اعلیٰ احسانہ

ایک روز　　میں مولانا عبداللہ العمادی (سابق رئیس التحریر وکیل و زمیندار) کے مکان پر بیٹھا ہوا تھا۔ تصنیف و تالیف کے متعلق گفتگو تھی۔ اس سلسلہ میں سُلطان محمود اور اس کی بُت شکنی کا تذکرہ آگیا۔ مولانا فرمانے لگے کہ موحدین ہند نے بیشمار بُت خانے خراب کئے ہیں۔ اگر ان واقعات کی حامل کوئی کتاب لکھی جائے تو بیحد دلچسپ ہو۔

میں یہ سن کر انگشت بدنداں رہ گیا۔

سُلطان محمود غزنوی قنوج و متھرا وغیرہ کی مہمات سے فارغ ہوکر غزنی واپس چلا گیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد کالنجر کے راجہ نندا نے قنوج پر چڑھائی کی۔ دیگر راجہ بھی اس کے ہمرکاب تھے۔ راجہ قنوج ان سے عہدہ برآ نہ ہوسکا۔ اور سر میدان کام آیا۔ سُلطان کو اس حادثہ کی اطلاع پہنچی تو وہ اپنے دوست کا جس سے اس نے امداد کا وعدہ کیا تھا، انتقام لینے کی غرض سے کالنجر پر حملہ آور ہوا۔ ۴۱۲ھ ۱۰۲۲ء

یہ امر مشکوک ہے۔ کہ راجۂ کالنجر نے راجۂ قنوج پر کیوں لشکر کشی کی؟ کاش کوئی مستند و معتبر ہند و تاریخ موجود ہوتی۔ اور وہ اس بارہ میں ہماری رہنمائی کرسکتی۔ عام مورخین نے اس کی وجہ "اطاعت سُلطان" بتائی ہے۔ لینپول صاحب کا بھی یہی خیال ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تاریخ ہند کے صفحہ (۴۷) پر لکھتے ہیں کہ

"سلطان محمود" کا نواں حملہ۔ راجۂ کالنجر پر اس وجہ سے ہوا کہ اس نے راجۂ قنوج پر محمود کی اطاعت قبول کر لینے کے باعث فوج .... کشی کرکے اس کو قتل کر ڈالا تھا"

لیکن اس سبب کو عقل سلیم معقول و اہم نہیں سمجھتی۔ راجۂ قنوج نے سُلطان کے سامنے سرِ نیاز جھکایا۔ یا اس سے دوستانہ تعلقات قائم کئے۔ یہ ایسے

سنگین جرائم نہ تھے۔ کہ وہ سوختنی اور گردن زدنی قرار دیا جا سکتا اور راجۂ کالنجر و دیگر راجگان ہند اس کے خون کے پیاسے ہو جاتے۔ اگر یہ واقعی جرم تھا تو اس سے پیشتر کئی راجہ اس جرم کا ارتکاب کر چکے تھے۔ مگر کسی ہندو راجہ نے محض اس وجہ سے اس پر لشکرکشی نہیں کی ہے نہ ہندو قوم نے اس بارہ میں کبھی اس کو ملامت کی! اس قسم کے واقعات کی تفاصیل اس کتاب میں جا بجا مذکور ہے۔ ہمارے نزدیک اس جنگ کے اسباب حسب ذیل ہیں

(۱) راجۂ کالنجر اور راجۂ قنوج کے درمیان کوئی ذاتی یا ملکی مناقشہ ہوگا۔ اور ان میں سے ہر ایک، ایک دوسرے کے درپے ہوگا۔ اب راجۂ کالنجر نے دیکھا کہ اس کے حریف نے سلطان سے اتحاد قائم کر کے نئی قوت حاصل کی ہے۔ اور اب وہ مجھے ضرور نیچا دکھائیگا۔ پس وہ اس سے پیشتر ہی کہ وہ سلطان سے امداد لے سکے اپنے دوستوں کی مدد سے راجۂ قنوج کو مٹانے پر آمادہ ہوگیا۔ اور اسے مٹا کر چھوڑا۔

اگر یہ بات نہ تھی تو یہ ہوگا کہ راجۂ کالنجر اور دیگر راجاؤں نے اس اتحاد کو اپنے حق میں خطرناک سمجھا ہوگا۔ انھوں نے خیال کیا ہوگا۔ کہ سلطان محمود غزنوی قنوج کی حکومت کو مدد دے کر ایک زبردست طاقت وسط ہند میں قائم کرنا چاہتا ہے تاکہ اپنی آئندہ مہمات میں بوقت ضرورت اس سے رسد رسانی وغیرہ ہر قسم کی امداد حاصل کرے۔ اور ہند کے باقی راجاؤں کا زور توڑ دے۔

ظاہر ہے کہ یہ خیال ہندو قوم اور ہندو دھرم کے لئے کس قدر خطرناک تھا

پس اگر اس کی تلافی اور اپنے ملک وملت کی بقا کے لئے راجۂ کالنجر اور دیگر راجگان نے والی قنوج کا استیصال ضروری سمجھا ہو تو کچھ عجب نہیں۔

اس کی تائید واقعات آئندہ سے بھی ہوتی ہے۔ محمود کوچ ومقام کرتا ہوا دریائے جمنا تک آ پہنچا۔ لیکن ہندو فوجیں عبور دریا میں مانع ہوئیں۔ یہ فوج راجہ سروجے پال (نبیرہ جے پال) والی پنجاب کی تھی[1]۔ جو گویا راجۂ کالنجر کی امداد اور اُسے تباہی سے بچانے کی غرض سے بھیجی گئی تھی۔ حالانکہ والی لاہور محمود کا خراج گزار تھا۔ اور اس لئے اس کا افواج سلطانی کے لئے سہولت و امداد بہم پہنچانا فرض تھا لیکن فوجی اور ملکی حفاظت کے فرض نے اُسے فسخ معاہدہ کی جرأت دلائی۔ راجہ کالنجر اور وسط ہند کے دیگر راجاؤں نے اُسے لکھا ہوگا۔ کہ محمود کو وہیں روکو۔ لیکن صرف اتنی بات مجاہدین غزنی کے عزائم میں التوا نہیں ڈال سکتی تھی۔ کشتیاں دریا پر موجود تھیں لیکن ہندو فوج کے قبضہ میں۔ دوسرے کنارہ پر ہندو فوج کیل کانٹے سے لیس رکاوٹ کرنے کے لئے مستعد کھڑی تھی۔ اور بادی النظر میں مجاہدین کی کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ لیکن ہمت، استقلال، اور جرأت ناممکن کو ممکن کر دیا کرتی ہے آٹھ سرفروش اور جاں باز مجاہدین نے اپنے گھوڑے بسم اللہ مجریہا کہہ کر دریائے جمنا میں ڈال دئے۔ دیگر بہادروں نے بھی ان کی تقلید کی اور بہت سے بہادر دوسرے کنارہ پر آ پہنچے۔ دشمن سے مقابلہ ہوا تو ایسی استقامت دکھائی کہ اس کے

---

[1] جے پال دوم والی لاہور (پنجاب) تاریخ فیروز اردو صفحہ (۷۲)

پاؤں اکھڑ گئے۔ ۔۔۔۔۔ مقابلہ کی تاب نہ لاکر بدحواس اُلٹے پاؤں بھاگا۔ گویا اقبال سلطانی نے اُسے مرعوب کردیا۔ اب تمام اسلامی سپاہ دریائے جمنا کے ورلے کنارے پر تھی۔ اس نے پنجاب کے اکثر شہروں پر قبضہ اور اس علاقہ کے بُت خانوں کو مسمار کیا

غزنوی مجاہدین جمنا سے آگے بڑھے تو راجہ کالنجر نے ان کا راستہ روکا۔ اس ہندو فوج کی تعداد اسی ہزار سے اوپر بتائی جاتی ہے۔ (سوار چھتیس ہزار پیادے پینتالیس ہزار) ۶۴۰ ہاتھی تھے۔ سلطان نے ایک بلند ٹیلہ پر پہنچکر اس ٹڈی دل پر نظر ڈالی تو اُسے حیرت ہوئی۔ فوراً مصلا بچھا کر درگاہ رب العزت میں فتح و نصرت کے لئے دعا مانگی۔ رات بھر اسلامی فوج میں جوش و خروش رہا اور علی الصباح مقابلہ کا منصوبہ کیا گیا۔ لیکن جب وہ نور کے تڑکے نماز فجر کی ادائیگی کے لئے بیدار ہوئے تو میدان صاف نظر آیا۔ یہاں ایک بھی ہندو سپاہی موجود نہ تھا۔ رات ہی کو راجہ کالنجر چلا گیا۔ اور تمام سامان وہیں چھوڑ گیا تھا۔

باوجود اسی ہزار فوج رکھنے اور باوصف راجۂ قنوج جیسے والی ملک کو تباہ کردینے کے راجہ کالنجر کا ایسی خاموشی سے میدان چھوڑنا اور کامیابی سے مایوس ہوجانا نہایت حیرت انگیز امر ہے۔ اب اس کا سبب اسلامی نقطۂ خیال سے خواہ سلطانی دعا قرار دو یا اس کی اقبال مندی جو ایسے مواقع پر دشمن کو مرعوب کردیا کرتی ہے اس کا ایک سبب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ راجۂ کالنجر ہنوز سلطان سے مقابلہ کے لئے طیار نہ تھا۔ اُسے یہ امید نہ تھی کہ غزنوی بہادر اس قدر جلد اس کے سر پر آ پہنچیں گے

اسے یہ بھی خیال ہوگا۔ کہ راجہ جے پال کی فوجیں مسلمانوں کو کالنجر تک پہنچنے ہی نہ دیں گی۔ اسے ہمسایہ راجگان سے امداد کی توقع ہوگی۔ لیکن عین وقت پر وہ اسے میسر نہ آسکی ہوگی۔ الغرض اس قسم کے اسباب نے راجہ کالنجر کو بغیر مقابلہ ہی پسپا ہوجانے پر مجبور کیا۔ مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کی صورت میں اسے اپنی جان اور ملک کی خیر نظر نہ آتی ہوگی۔ فاتح کی اقبال مندی کے ایسے نظارے عالم تاریخ میں آپ کو بیشمار نظر آئیں گے!

صبح کو مجاہدین اسلام نے اپنے سوار ہر طرف دوڑائے کہ دشمن کمین میں پوشیدہ نہ ہو۔ لیکن وہاں کوئی متنفس نہ تھا۔ آخر مجاہدین نے اس تمام سامان کو فتوح غیبی سمجھ کر اپنے قبضے میں کیا جو راجہ چھوڑ گیا تھا۔ اس مال غنیمت میں ۵۸۰ تو ہاتھی ہی تھے۔

سلطان نے خدا تعالیٰ کی درگاہ میں نفل شکرانہ ادا کئے۔ کہ وہ بہ تائید ایزدی ایسی آسانی سے سخت جان دشمن پر غالب آیا اور واپسی کا طبل بجوایا۔

یہ فتح اتفاقی تھی جو بے مقابلہ حاصل ہوئی تھی۔ لیکن سلطان پنجاب[۱] کی جانب سے مطمئن نہ تھا۔ اسے والی لاہور کی جانب سے اندیشہ تھا۔ جس نے باوجود اقرار اعانت کے بار بار تمرد دکھایا۔ اور اس مرتبہ بھی آنکھیں دکھائی تھیں۔ لہذا اس نے بہ عجلت واپسی کا ارادہ کیا

[۱] تاریخ فرشتہ۔

مہمات قیرات - ناردین واپسی کے وقت غزنوی فوجیں یلغار کرتی ہوئی قیرات پہنچیں - لیکن اس زمانہ میں اس قطعہ ملک کا نام مردہ اور اس کا محل وقوع مشتبہ و تحقیق طلب ہے۔ لفظ قیرات غالباً معرب ہے۔

قیرات کا محل وقوع سرحدی علاقوں باجور - کافرستان - سوات - کوہستان ہزارہ میں سے ایک ہے[51]۔ مصنف تاریخ فرشتہ کا بیان ہے "کہ قیرات[52] ایک سرد سیر ملک تھا - وہاں میوہ جات بکثرت پیدا ہوتے تھے - ہند و ترکستان کے درمیان واقع تھا - یہاں کے باشندے شیر پرست تھے[53]"

فرشتہ یہ بھی کہتا ہے کہ "اس مہم میں کئی ہزار لوہار اور سنگ تراش سلطان کے ہمراہ تھے۔

اول الذکر بیان سے صاف طور پر ہمارے قیاس کی تائید ہوتی ہے - اور آخر الذکر فقرات سے اس علاقہ کا کوہستان ہونا ثابت ہوتا ہے - ورنہ سنگ تراشوں اور لوہاروں کی کیا حاجت تھی - الغرض قیرات کا محل وقوع ہزارہ - باجور وغیرہ مذکورہ بالا علاقوں میں سے کوئی ایک ہے - واللہ اعلم بالصواب۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ کے کفار نے آتے وقت مجاہدین کو تکلیف پہنچانے کا ارادہ کیا تھا - لہذا واپسی کے وقت ان کی گوشمالی واجب معلوم ہوئی - لیکن ان میں

---

[51] طبقات ناصری تو اس بیان کی تائید ہوتی ہے۔ [52] نواح ایبٹ آباد۔ [53] مخدوپا ید ھ

جان کہاں تھی؟ سلطانی لشکر کے خیمہ انداز ہوتے ہی وہاں کا راجہ نیازمندانہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اور بطوع و رغبت حلقہ بگوش اسلام ہوا۔ اس کی رعایا نے بھی اس کی تقلید میں دولت اسلام کو قبول کیا۔

سلطان نے یہاں اپنا عامل مقرر کیا۔ اور نار دین کی جانب ایک سپہ سالار کو بھیجا۔ نار دین کا محل وقوع بھی مشکوک ہے۔ غالباً اس سرحدی علاقہ میں قریب ہی چھوٹی سی ریاست ہوگی۔ اس علاقہ میں تبلیغ اسلام کی گئی۔ اور یہاں کے لوگ اسلام لے آئے۔

اس مقام پر ایک نہایت قدیم بت خانہ تھا۔ اُسے مسمار کیا گیا۔ یہاں سے ایک سنگین کتبہ دستیاب ہوا۔ جس کی عمر ہندو پنڈتوں نے چالیس ہزار سال بتائی تھی۔ غالباً یہ کتبہ تاریخی نہ تھا۔ بلکہ مذہبی تھا۔ اس لئے کہ ہنود میں تاریخی مذاق نہ تھا۔ اسلامی تاریخیں اس کے مزید حالات بتانے سے خاموش ہیں۔ غالباً سلطان نے اسے کسی معزز ہندو کو دیدیا ہوگا۔

مہم کشمیر ان مہمات کے بعد سلطان نے ۱۰۲۳ء میں دوبارہ تسخیر کشمیر کا عزم کیا۔ غزنی بہادر لوہ کوٹ تک جا پہنچے۔ لیکن کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ اور لاہور واپس لوٹ آئے۔

الحاق لاہور والی پنجاب سلطان کا خراج گذار تھا۔ لاہور اس کی راجدھانی تھی۔ شمال سرحدی علاقہ سے قطع نظر کر کے درحقیقت سلطنت

غزنی کا صوبہ تھا) باقی تمام پنجاب اس کے تصرف میں تھا۔ اس خاندان کے حکمرانوں کا بار بار تمرد دکھانا اور سلطان کا باوجود کالنجر اور فاتح ہونیکے بار بار تاج بخشیاں کر کے انہیں اپنا ممنون احسان بنانا جا بجا بالتفصیل مذکور ہو چکا ہے۔ لیکن بایں ہمہ مہم کالنجر میں بھی والی پنجاب سلطان کا سد راہ ہوا۔ اور قبل ازیں نت پڑے پر سلطان کیخلاف سازشوں میں شریک ہوتا رہا۔ اس کتاب کے ناظر سے مخفی نہیں کہ سلطان کسی مہم کو ناتمام نہیں چھوڑتا تھا بلکہ دشمن کا آخر تک تعاقب کرتا تھا مورخ فرشتہ کہتا ہے کہ "سلطان پنجاب کی شورش کے خیال سے راجہ کالنجر کو کافی سزا نہ دلسیکا۔ اور بغیر فیصلہ کن جنگ کے عادت کے خلاف واپس چلا آیا"

بایں وجوہ سلطان کو ضروری معلوم ہوا کہ اس دست نما دشمن کا استیصال کیا جائے۔ اور اس کے معنے یہ تھے کہ لاہور کو مستقل طور پر قبض و تصرف میں لایا جائے۔ چنانچہ اس مہم کی طیاریاں ہونے لگیں لیکن والی پنجاب مقابلہ سے پیشتر ہی اجمیر چلا گیا۔ اس کے اغراض سے سلطان کے بغیر اہم اور معمولی مقابلے ہوئے جسمیں بھونے نیچا دیکھا۔ دارالسلطنت لاہور پر سلطان کا قبضہ ہو گیا بیشمار مال غنیمت دستیاب ہوا۔ سلطان نے لاہور میں اپنا ایک عامل مقرر کیا چھاؤنی ڈالی ۴۱۲ھ پنجاب سلطنت غزنی کا صوبہ قرار پایا جسمیں سلطان کے نام کا سکہ و خطبہ جاری ہوا۔ لاہور ہی ہند مہمات کے لئے مسلمانوں کا فوجی مرکز قرار پایا۔ مورخ لیتھبرج صاحب حملہ کالنجر کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تاریخ کے صفحہ ۸۲ پر لکھتے ہیں: "اس لڑائی میں جے پال دوم والی لاہور راجہ کالنجر کی مدد پر تھا اسلئے محمود نے اس کو شکست فاش دیکر لاہور پر دخل کر لیا۔ اور وہاں اپنا نائب مقرر کر دیا جس سے ہند میں سلطنت اسلامیہ کی بنیاد پڑگئی ان مہمات سے فارغ ہو کر سلطان مع اپنے جاں باز مجاہدین کے غزنی واپس ہو گیا کیونکہ موسم بہار آگیا تھا۔"

گوالیار اور کالنجر کی مہمات

یہ مذکور ہو چکا ہے کہ حملہ سنہ ۴۱۲ھ میں مہم کالنجر ناتمام رہ گئی تھی۔ کیونکہ وہاں کا راجہ بے مقابلہ پسپا ہو گیا تھا۔ اور سلطان کو زیادہ قیام کی مہلت نہ تھی۔ لہٰذا اس مہم کی تکمیل کے لئے سلطان سنہ ۴۱۳ھ / ۱۰۲۲ء غزنی سے چلا۔ اور لاہور سے گزر کر بعجلت گوالیار جا پہنچا۔ اور اس کی تسخیر کا ارادہ کیا۔

قلعہ گوالیار ایک مستحکم قلعہ تھا۔ یہاں کا راجہ اپنے میں تاب مقابلہ نہ دیکھکر قلعہ میں محصور ہو گیا۔ بہادران غزنی نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ کو ابھی چار ہی روز گزرے تھے۔ کہ محصورین کے دل ٹوٹ گئے۔ ہمت و استقلال نے جواب دیدیا۔ قلعہ کا پھاٹک کھول دیا گیا۔ راجہ سر نیاز جھکائے سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پینتیس۳۵ ہاتھی بطور نذرانہ پیش کئے۔ سلطان نے اس کا ملک و مال اُسے بخش دیا۔ اور چندے آرام کے بعد کالنجر کے رخ کوچ کیا۔

بہادران غزنی سرزمین ہند کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندتے کالنجر تک جا پہنچے۔ لیکن راجہ نندا نے مقابلہ کا ارادہ نہیں کیا۔ نہ مثل سابق فرار ہو جانا مناسب سمجھا بلکہ طالب امان و خواہان حفاظت ہوا۔ چنانچہ اس نے تین سو ہاتھیوں کا نذرانہ خدمت سلطانی میں پیش کیا۔ مگر عجیب طریق سے :-

اس نے تین سو کے تین سو ہاتھی قلعہ کے دروازے سے باہر ہانک دئے
یہ دیکھکر سُلطان نے ترکوں کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً جست کر کے ہاتھیوں کی پشت پر آبیٹھے
یہ عجیب وغریب نظارہ دیکھکر راجہ اور اہل قلعہ دنگ رہ گئے۔ ایک جانب غازیوں کی جانبازی
اور جرأت کا نقش ان کے دل پر پڑا تو دوسری طرف ان کی شیرانہ قوت نے انہیں
مرعوب کیا۔ کہ یہ لوگ آدمی ہیں یا کوئی بلا کہ ہاتھیوں سے بھی نہیں ڈرتے۔

راجہ نندا سنسکرت زبان کا ممتاز شاعر تھا۔ اس لئے ایک مدحیہ قصیدہ لکھکر سُلطان
کی خدمت میں پیش کیا۔ سُلطان نے اپنی فوج کے پنڈتوں سے اس کا ترجمہ سُنا۔ اشعار
آبدار اور مضمون برجستہ تھا۔ مگر افسوس کہ ہماری رسائی ان اشعار آبدار تک نہیں کاش
ہند و تاریخ ان جواہرات کو محفوظ رکھتی اور ہم سب اہل ہند اس پر فخر کرتے۔ سُلطان نے
اشعار سُن کر حیرت کا اظہار کیا اور اس کے صلے میں راجہ کالنجر کے علاقہ کے علاوہ پندرہ[15] اور
قلعے راجہ کو عطا کئے۔ راجہ نے بھی زر وجواہر کی نذر خدمت سُلطانی میں پیش کی۔

جانتے ہو۔ یہ کون سلطان ہے؟ یہ وہی سلطان محمود ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ

"وہ ہند کے بانکے ترچھے راجپوتوں کو شمشیر کی نوک سے مسلمان
کرنا چاہتا تھا"

ہاں ہاں یہی وہ سلطان ہے جس کے متعلق ہمیں بتایا گیا ہے کہ

"اس کا ہند کی دولت پر دانت تھا" العجب ثم العجب

اس مہم کی تکمیل کے بعد سلطان غزنی کو واپس ہؤا ؛

اب تک غزنویوں کی جولانگاہ پنجاب اور شمالی ہند بنا رہا۔ اور انہیں علاقوں میں واقع ہونے والے بُت خانوں کو شکست کیا گیا۔ باقی حصص ہند محفوظ رہے۔ مغربی ہند کا صوبہ گجرات جس میں سومنات کا عظیم الشان بُت خانہ واقع تھا۔ منجملہ محفوظ مقامات کے تھا۔

سومنات یہ بُت خانہ مہادیوجی (آدم) کے نام سے موسوم اور ہندوستان بھر میں مشہور تھا۔ اس کے در و دیوار میں اس قدر زر و جواہر جڑے ہوئے تھے کہ مندر اس کی ضو سے شب تاریک میں بھی روز روشن سے چشمک زنی کرتا تھا۔ گویا چراغ وغیرہ کی روشنی سے مستغنی تھا۔

اس میں چھپن ستون تھے اور سب کے سب مرصع بہ جواہرات۔ ان میں طلائی زنجیریں آویزاں تھیں جنکا وزن دو سو من سے کم نہ تھا۔ ان میں پوجا کے لئے گھنٹے اور گھڑیال لٹکے ہوئے تھے۔ دو ہزار پجاری بھنڈاری۔ پانسو گانے والی عورتیں تین سو ماہر موسیقی مرد ہر وقت موجود رہتے تھے۔ ہزاروں جاتریوں اور پوجا کرنے والوں کا ہر وقت میلا لگا رہتا تھا۔ خصوصاً گرہن کے دن لاکھوں ہندو یہاں آتے تھے۔ ان زائرین کی تعداد کا کسی قدر اندازہ یہ معلوم کرنے سے ہوتا ہے۔ کہ مندر میں

تین سو حجام ان کی حجامت کے لئے ملازم تھے۔

مندر کے مصارف کی غرض سے دو ہزار گانوں معاف تھے۔ اسی سے اس کے اخراجات اور شان و شوکت کا اندازہ کرو۔

بُت سومنات کا طول پانچ گز تھا۔ تین گز اوپر نمایاں۔ دو گز زمین کے اندر ہر روز آب گنگا چھ سو کوس کے فاصلہ سے منگوایا جاتا اور اس سے سومنات کے دیوتا کو نہلایا جاتا تھا۔ لہ

اہل ہنود کا اعتقاد تھا۔ کہ روحیں جسموں سے جدا ہونے کے بعد سومنات دیوتا کی خدمت میں حاضر ہوتی ہیں اور وہ انہیں دوسرے جسم عطا کر کے پھر زندہ کرتا ہے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا۔ کہ سمندر میں مدوجزر محض سومنات دیوتا کی خوشنودی اور پوجا کے لئے ہوتا ہے۔

ہندو اس بُت کو دیگر بتوں کا بادشاہ سمجھتے تھے۔ اور مشہور تھا۔ کہ سومنات کا

لہ سلطان نے اس سفر میں ایک بُت خانے کے بُت کو ہوا میں معلق دیکھا۔ بظاہر اس کا در و دیوار سے تعلق نہ تھا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ بُت لوہے کا ہے اور دیواریں سنگ مقناطیس کی۔ دیواروں کے توڑنے پر بُت اوندھے منہ جا پڑا۔ اور دیوتا کی کرامات کا راز طشت از بام ہو گیا

(تاریخ فرشتہ)
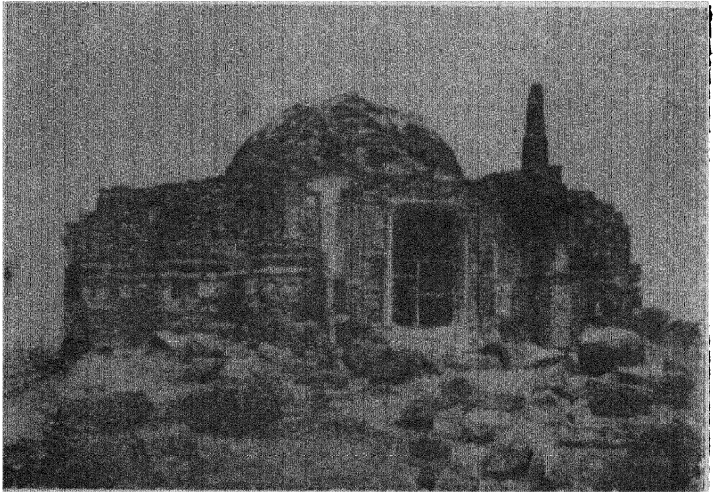
سومنات

دیوتا۔ ان بتوں سے ناراض تھا۔ جن کو سلطان، محمود نے شکست کیا۔ ورنہ اس
کی کیا مجال تھی کہ ان میں سے کسی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا۔ سومنات جی چشم زدن میں
محمود کو تباہ کر سکتے تھے۔ چونکہ یہ بت خانہ بوجہ اس کے کہ مغربی ہند میں واقع تھا۔
اور اب تک وہاں کوئی مسلمان حملہ آور نہ پہنچ سکا تھا۔ ہنوز محفوظ رہا تھا۔ اس لئے اس
امر کو ہندو سومنات جی کی کرامات جانتے اور اسے ہمیشہ کے لئے مامون و
مصئون سمجھتے تھے۔

یہ حالات بت شکن موحد سلطان محمود کے گوش گزار کئے گئے تو بے
اختیار اس کے منہ سے لاحول ولاقوت نکلا۔ وہ گجراتی مہم کے لئے طیار
ہو گیا اور اس نے فوراً اعلان جہاد کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علاوہ باقاعدہ سپاہ
ترکستان، افغانستان اور خراسان کے تیس ہزار مجاہد اس کے زیر علم آ جمع ہوئے
اور بسم اللہ کہ کر غزنی سے کوچ بول دیا گیا۔ (۴۱۵ھ ۱۰۲۶ء) حتیٰ کہ لشکر براہ ڈیرہ
اسمٰعیل خان ملتان تک آ پہنچا۔

سہل اور سیدھا رستہ پنجاب ہو کر دہلی کی سمت سے تھا۔ لیکن حملہ
سومنات کی اطلاع پاکر ہندو راجگان کا قدم قدم پر مجاہدین کی مخالفت کرنا اپنے
دھرم کی حمایت میں قدرتی امر تھا۔ جس سے اور نہیں تو کم از کم وقت ہی کا نقصان
تھا۔ ممکن تھا کہ انہیں فضول اور بے نتیجہ مقابلوں میں قیام ہند کا زمانہ ختم ہو جاتا اور بغیر انجام
مہم گجرات ہی کے بہادران غزنی کو واپس لوٹ جانا پڑتا۔

اس خیال سے دور اندیش سلطان نے عام رستہ چھوڑ کر غیر آباد اور دشوار گزار رستہ اختیار کیا۔ یعنی ملتان سے چل کر بہاول پور کی جانب کوچ کیا، اور وہاں سے اپنے آپ کو صحرائے بیکانیر کے حوالے کیا۔ یہ رستہ لق ودق بے آب گیاہ تھا۔ نہ آدمی نہ آدمی زاد۔ اشیائے خوردنی اور رسد کا تو ذکر ہی کیا؟

مؤرخ لیتھبرج لکھتا ہے کہ "اس مہم میں محمود کو ایک بڑا دور دراز، اور دشوار گزار سفر پیش آیا، اول وہ ملتان میں داخل ہوا۔ پھر تمام ریگستان کو کھوندتا ہوا گجرات چلا"

سلطان نے ایسے دشوار گزار سفر کو طے کرنے کا جو تہیہ کیا۔ اس سے اس کی اعلیٰ دور اندیشی اور انتظامی قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے مجاہدین کو حکم دیا کہ ہر فرد چند یوم کی اپنی خوراک، پانی نیز اپنے گھوڑے کے لئے گھاس وغیرہ خود لے۔ اس کے ساتھ یہ بھی انتظام کیا۔ کہ تیس تیس ہزار اونٹوں پر پانی لاد کر فوج کے ساتھ رکھا۔ اونٹوں کو چند روز پیاسا رکھ کر پانی پلایا۔ ابتدائی منزلوں میں فوج کی خود لائی ہوئی رسد کام میں آئی۔ بعد ازاں ہر منزل پر حسب ضرورت اونٹ ذبح ہوتے رہتے۔ یہ مجاہدین کی خوراک تھی۔ اونٹوں کے پیٹ سے جو پانی نکلتا وہ صاف کر کے گھوڑوں کو پلا دیا جاتا تھا۔ اونٹوں پر لدا ہوا صاف پانی فوج کے کام آتا تھا۔

الغرض اس تدبیر سے خدا خدا کر کے کئی سو میل طویل ریگستانی سفر ختم ہوا۔ غزنوی بہادر اجمیر جا پہنچے۔ مگر راجہ اجمیر اس طوفان کی آمد سے پیشتر ہی وہاں سے نکل گیا۔

اب مجاہدین کے سامنے قلعہ نار اگڈھ تھا۔ تضیع اوقات کے خیال سے اہل قلعہ سے مزاحمت نہیں کی گئی۔ اسی طرح راہ کے دیگر قلعہ جات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ کیونکہ منزل مقصود گجرات تھی۔ بایں ہمہ اثنائے راہ میں اکثر راجگان ہند سے اقبال مند سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر سر نیاز جھکایا۔ اور نذرانہ و تحفہ تحائف پیش کئے۔ اور اس طرح تمام راجپوتانہ سلطان کے زیر قدم تھا۔

الغرض سلطان بزور شمشیر راجپوتانہ کا قلب چیرتا ہوا ' انہلواڑہ (صدر مقام گجرات) جا پہنچا۔ یہاں کا راجہ پرم دیو[1] ڈر کے مارے شہر چھوڑ کر بھاگ گیا"[2]

وجہ اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ غزنی بہادر بلائے ناگہانی کی طرح جا پڑے تھے۔ یہ دیکھکر راجہ گھبرا گیا۔ اور تنہا اپنے میں قوت مقابلہ نہ دیکھا۔ اس کی مہلت نہ تھی کہ دیگر راجگان ہند کو اپنی امداد کے لئے بلاتا۔

اب سپاہ نے سومنات کے رُخ کوچ کیا۔ اور حفاظتی چوکیوں کے سپاہیوں کو زیر کر کے منزل مقصد تک جا پہنچے۔ آنکھوں کے سامنے بُت خانہ تھا۔

تخویف بُت خانہ کے پجاریوں نے یہ دیکھا تو ان میں سے چند فصیل پر چڑھ گئے۔ اور لشکر اسلام کو خطاب کر کے کہا " تم لوگ سمجھتے ہو کہ مندر کو لوٹ لے جاؤ گے؛ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ سومنات کے دیوتا نے

---

[1] و [2] تاریخ ہند اردو ذکاء اللہ صاحب صـ۷۵ میں پرم دیو کی بجائے "بھیم" لکھا ہے۔

تمہیں تباہ کرنے کے لئے یہاں کھینچ بلایا ہے۔ اس لئے کہ تم نے ہندوستان کے بیشمار ٹھاکر دواروں کی بے عزتی کی ہے۔ تمہاری تمام فوج ہلاک کردی جائیگی تمہارا ایک آدمی بھی باقی نہیں رہے گا۔ اور تم بالکل برباد ہو جاؤ گے۔ لیکن اب بھی کچھ نہیں گیا۔ اگر خیر چاہتے ہو تو اُلٹے پاؤں پھر جاؤ۔ سومنات جی تمہاری خطا معاف کردیں گے! سومنات جی تمام بتوں کے بادشاہ تمام معبودوں کے معبود (معاذاللہ) اور روحوں کو جسموں میں داخل کرنے والے ہیں۔ پس ان کی بےادبی کرنیوالا کب قہر و غضب سے محفوظ رہ سکتا ہے!؟!

اس تقریر کو سنکر مجاہدین نے قہقہہ لگایا۔ اور سُلطان نے بت خانے پر تیراندازی کا حکم دیا۔

مقابلہ یہ دیکھکر پجاری فصیل چھوڑکر کمروں کے اندر گھس گئے۔ اور دیوتا کے قدموں میں پناہ لی۔ مجاہدین میدان خالی پاکر فصیل پر جا چڑھے۔ یہ دیکھکر ہندوؤں کو بھی جوش آگیا اور وہ بھی مسلح ہوکر مقابلہ کے لئے آگے بڑھے۔ حتیٰ کہ بلہ کرکے دم کے دم میں دشمنوں کو کاٹ کر فصیل سے نیچے پھینک دیا۔ اور اس طرح مسلمانوں کے اس حملہ پر پانی پھیر دیا۔

دوسرے تیسرے روز بھی حملہ آور نقصان کثیر اٹھاکر پسپا ہوئے۔

ایک مورخ کی رائے ہے کہ:۔

"سلطان نے قلعہ شکنی کے آلات سے کام نہیں لیا۔ یا تو قلعہ سومنات

اس قابل ہی نہ تھا کہ اس کی تسخیر کے لیئے کوئی اور جنگی تدبیر کی جاتی۔ یا مجاہدین اسلام اسقدر جوشش غزا میں بھرے ہوئے تھے۔ کہ وہ برہمنوں کے معبود کی بےکسی اور کمزوری جتانے کے لیئے عام ہلہ سے بزور شمشیر قلعہ سومنات فتح کرنا چاہتے تھے۔ ورنہ سلطان محمود جیسا ماہر جنگ اور قابل جرنیل ایسے ناکام حملوں سے فوج نہ کٹواتا۔"

محاصرہ جاری تھا۔ اور ارادہ تھا کہ عام ہلہ کیا جائے۔ کہ اسی اثنا میں کئی راجگان ہند کی مشترکہ فوج دہرم کی حمایت اور سومنات کی حفاظت کے لیئے وہاں آموجود ہوئی۔ بینتھرج صاحب لکھتے ہیں کہ چونکہ یہ (سومنات) بڑا مشہور تیرتھ تھا۔ اس لیئے اس کی حفاظت کو راجپوت راجہ ہرطرف سے آکر جمع ہوئے۔ مگر محمود کے سپاہیوں کے آگے ان کی کچھ پیش نہ چلی۔ ان راجگان میں پرم دیو (راجہ انہلواڑہ) اور دابشلم زیادہ مشہور تھے۔ سلطان نے یہ دیکھا تو تھوڑی سی فوج محاصرہ میں چھوڑ کر باقی فوج لے کر ٹڈی دل دشمنوں کے مقابل آیا۔

چوٹ برابر کی تھی۔ طرفین کے بہادر کامل جوش کا اظہار کر رہے تھے۔ اگر مسلمان حمایت توحید کے لیئے جاں بازی دکھا رہے تھے تو ہندو اپنے دہرم اور دیوتاؤں کی حفاظت کی غرض سے۔ غرض کہ دونوں فریق نے مذہب کی حمایت میں تلوار بلند کی تھی۔

مقابلہ نہایت گرم جوشی سے جاری تھا کہ اسی اثنا میں ایک جانب گرد اڑتی نظر

آئی۔ کوئی نئی فوج آ رہی تھی۔ غزنی سوار جا کر خبر لائے تو معلوم ہوا کہ راجہ انہلواڑہ نہر والہ ٹڈی دل فوج لے کر غزنویوں کے قلع قمع کو آیا ہے۔

یہ موقع غزنویوں کے لئے نازک تھا۔ دو طرفہ مقابلہ۔ محاصرہ مزید برآں۔ سلطان کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو اس کی ہمت جواب دیدیتی۔ کمر ٹوٹ جاتی۔ مگر غزنوی شیر کے پائے استقلال کو ذرا لغزش نہیں ہوئی۔ اُس کے تیور پر ذرا میل نہ آیا۔

اس موقع پر اس نے اپنا وہی اسلحہ سنبھالا جس کے ذریعے اکثر نازک موقعوں پر زبردست دشمنوں پر فتح پا چکا تھا۔ یعنی دعا۔ چنانچہ سلطان گھوڑے سے اترا۔ وضو کیا اور شیخ المشائخ حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ کا خرقہ (جو شیخ موصوف نے ایسی ہی مہمات کیلئے عطا کیا تھا) زیب کرکے نفل پڑھے۔ اور بسجدہ ہوکر بنہایت خضوع و خشوع کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی جناب میں دعائے نصرت مانگی۔ نیاز مانی۔ اور اس سے فارغ ہوکر فوراً راجہ انہلواڑہ کے مقابل ہوا۔

جنگ پورے جوش کے ساتھ شروع ہوئی۔ راجہ کی فوج نے دشمنوں کو نیچا دکھانے کی کوشش میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔ لیکن قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ قدرت نے خدا پرستوں کی مدد کی۔ طوفان باد و برق آیا۔ اور اس نے زیادہ ہندوؤں ہی کو ستایا۔ ان کے ہزاروں سپاہی برسر میدان کھیت رہے۔ بقیۃ السیف فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ میدان چھوڑنے پر مجبور ہوئی۔ انہیں میں خود راجہ انہلواڑہ بھی تھا۔ اس وقت سلطان نے اپنے عقیدہ کے بموجب مال غنیمت میں سے ایک حصہ نکال کر غربا و مساکین میں تقسیم کیا۔

سلطان دہر فارغ ہوکر باقی فوج کے ساتھ جا ملا جو راجاؤں کی فوج سے مقابلہ کر رہی تھی۔

کئی گھنٹے تک ہنگامۂ کارزار گرم رہا۔ لیکن ہندوؤں کے حق میں کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔ بلکہ وہی حشر ہوا جو راجہ انہلواڑہ کی فوج کا ہوا تھا۔ بقیہ السیف فوج نے میدان چھوڑ دیا۔ اور ایسی بدحواس بھاگی کہ اپنا قیمتی مال و اسباب بھی اپنے ساتھ نہ لے جا سکی۔

اب غزنوی فوج پوری قوت اور کامل توجہ سے محاصرہ میں مصروف ہوئی۔ کچھ ہندو (جو جوہر شجاعت سے متصف تھے) دست بہ قبضہ مقابل آ کر داد مردانگی دی۔ لیکن بالآخر مجاہدین سیڑھیاں لگا لگا کر فصیل پر چڑھ گئے۔ اور پھر اندر اتر کر ٹھاکر دوارہ تک جا پہنچے۔ بقیۃ السیف ہندوؤں نے چارہ کار نہ دیکھا تو کشتیوں میں سوار ہو کر فراری کا ارادہ کیا۔ ان کی تعداد چار ہزار سے کم نہ تھی۔ سلطان نے ان کے تعاقب میں کشتیاں روانہ کرا کے اکثر کو گرفتار کرایا۔ بعض غرق ہوئے۔ لیتھبرج صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"تین روز تک لڑائی کا بازار خوب گرم رہا۔ آخر محمود نے فتح پائی۔ اور بیشمار دولت اس کے ہاتھ آئی۔ ہندوؤں کا اس لڑائی میں بڑا نقصان ہوا۔ ان کے پانچ ہزار بہادر سوار لڑائی میں کام آئے۔ باقی کشتیوں میں بیٹھکر چلتے بنے"

اب مجاہدین باطل معبودوں کے سر پر جا پہنچے تھے۔ سلطان کے گرز کی زد سے سومنات جی کی ناک اڑ گئی۔ سلطان نے بت پارہ پارہ کرنے کا حکم دیا اس وقت پجاریوں نے گریہ وزاری شروع کی۔ سلطان کے قدموں

میں گر پڑے۔ اور ناک رگڑ رگڑ کر التجا کی۔ کہ ہم سے زر سرخ و سفید اور جواہرات لے لیں۔ اور دیوتا جی کو معاف کر دیں

سلطان نے اس بارہ میں اپنے مشیروں سے مشورت کی۔ انھوں نے کہا کہ کیا مضائقہ ہے۔ یہ رقم دیگر مہمات ملکی اور دینی خدمت میں کام آئے گی۔ لیکن سلطان نے چند لمحہ تامل کر کے کہا۔

"میں قیامت کے دن بُت فروش کہلانے کے بجائے بُت شکن کہلانا پسند کرتا ہوں"

یہ کہکر اس نے اپنا گرز بُت میں مارا کہ وہ پاش پاش ہو گیا۔ اور اس کے اندر سے ہیرے[1]، جواہرات، اور قیمتی اشیا برآمد ہوئیں جو اس معاوضہ سے کئی گنی زیادہ تھیں جو پجاری پیش کرتے تھے۔ اور اس طرح سلطان کو اپنی بے ریا دینداری کا صلہ مل گیا۔

[1] مورخین کا یہ بیان متفقہ ہے۔ لیکن بایں ہمہ بعض کو اس کی قبولیت میں تامل ہے اور وہ بُت کو ٹھوس خیال کرتے ہیں۔ لیکن یہ محض خیال ہی خیال ہے۔ اگر مورخین کے بیان میں اختلاف ہوتا تب بھی شک کیا جا سکتا تھا۔ پھر شیخ سعدی نے ایک حکایت لکھی ہے جس میں سومنات کے مندر میں جا کر رہنے کا واقعہ لکھا ہے۔ اس سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔ کہ وہ ٹھوس نہ تھا۔ بلکہ اندر سے خالی تھا۔ اور پوشیدہ اسی کے ذریعے سے اس کو حرکت دی جاتی تھی ÷

معلوم ہوتا ہے کہ بتوں کے بچانے کے لئے پجاریوں کی التجائیں عقیدتمندی کی وجہ سے نہ تھیں بلکہ اس دولت سے محفوظ رکھنے کی غرض سے تھیں گویا وہ سونے چاندی کے بتوں کے پجاری تھے۔ مجاہدین کو جو مال غنیمت ہاتھ آیا اس کی تعداد دس کروڑ کے قریب بتائی جاتی ہے۔

بُت سومنات کے دو ٹکڑے سے مدینہ منورہ اور دو غزنی گئے۔ ایک ٹکڑا جامع مسجد کی سیڑھیوں میں، اور ایک دیوان عام کے دروازہ پر ڈال کر پامال کیا گیا۔

بُت کے دو ٹکڑے جو غزنی گئے۔ ان کو ان کے پرستار پجاری جنگلوں اور ریگستانوں میں گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ اور اس طرح ان کو اور ہزاروں لاکھوں ہندوؤں کو معلوم ہو گیا کہ جس شے کو وہ خالق اور خدا سمجھتے تھے وہ کس قدر بے حقیقت شے ہے

فتح گجرات

مذکور ہو چکا ہے۔ کہ راجہ پرم دیو والی (انہلواڑہ) جو سلطان کے اس کے علاقہ سے گزرتے وقت وہاں سے ٹل گیا تھا۔ لیکن جنگ سومنات کے سین میں یکایک نمایاں ہو کر اس نے اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے۔ مگر قسمت کو یاور نہ دیکھکر میدان سے واپس چلا گیا۔ اور قلعہ کاٹھیاواڑ میں پناہ گیر ہوا۔ یہ قلعہ سومنات سے چالیس فرسنگ کے فاصلے پر ساحل جزیرہ میں واقع تھا۔ پس سلطان نے تکمیل فتح گجرات کی غرض سے راجہ انہلواڑہ کا قطعی فیصلہ کرنا چاہا۔

سلطان نے قلعہ کاٹھیاواڑ کی جانب کوچ کیا۔ لیکن وہاں تک پہنچنا آسان نہ تھا

غزنی افواج اور قلعہ کے درمیان سمندر حائل تھا۔ اسی خیال سے راجہ وہاں پناہ گیر ہوا ہوگا۔ کہ بہادران غزنیں وہاں تک نہ پہنچ سکیں گے۔ لیکن یہ صرف خیال ہی خیال تھا۔
سلطان نے اپنے غوطہ خوروں کو پانی کی گہرائی اور موقعۂ عبور کے دریافت کرنے کا حکم دیا۔ عمق زیادہ تھا۔ مقامی غوطہ خوروں سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے عبور آب کا ایک خاص موقع بتایا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہ دیا کہ "اگر اس وقت سمندر میں تموج اور چڑھاؤ ہو جائیگا تو ایک سپاہی بھی جانبر نہ ہوگا۔" ان کی مراد غالبًا سمندری حلے سے تھی۔ جس کا وقت بوجہ لاعلمی انہیں معلوم نہیں تھا۔

سلطان نے قرآن حکیم سے استخارہ کیا اور بسم اللہ کہ کر سمندر میں گھوڑا ڈال دیا۔ غزنوی بہادروں نے تقلید کی۔ اور بفضل ایزدی خفیف سے نقصان کے بغیر تمام فوج سمندر عبور کر کے قلعۂ کاٹھیاواڑ جا پہنچی۔ لیکن راجہ پرم دیو چپکے سے نکل گیا اور قلعہ پر حملہ آوروں نے تصرف کر لیا۔

اس میں شک نہیں کہ سمندر کو عبور کرنے کا مسئلہ نازک اور اہم تھا۔ اور سلطان کا دلیرانہ سمندر میں گھوڑا ڈال دینا معمولی بات نہ تھی۔ لیکن ان لوگوں کی تاریخ میں جو موت سے نہیں ڈرتے اور جو خوشنودیٔ خدا کے حصول میں اپنی جانیں کھپانے کے لئے طیار رہتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ بہادران اسلام کو اکثر اسی قسم کے واقعات پیش آئے۔ اور انھوں نے اس وقت جرأت کی غیر فانی نظیریں قائم کیں۔

تاج بخشی راجہ گجرات (پرم دیو) ملک چھوڑ کر بھاگ گیا۔ سلطان نے اس کی بجائے قدیم[1] خاندان کے ایک شخص کو (جو گمنام اور فقیرانہ زندگی بسر کرتا تھا) گدی نشین کیا۔ گجرات کے خاص و عوام نے اس کی حکومت کو قبول کیا۔ سلطان کا یہ طرز عمل قابل غور ہے۔ تاریخ عالم ایسی فیاضانہ اور مثال پیش کرنے سے معذور ہے۔ پھر کس قدر عجیب بات ہے کہ یہی سلطان ہندوکش بتایا جاتا ہے

اس راجہ نے اپنے ایک حریف راجہ کو اسیر کر کے حوالہ سلطان کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اپنے تخت کے نیچے ایک قید خانہ طیار کرایا۔ تاکہ اس میں دشمن کو قید کرے۔ لیکن ارادہ کو عمل میں لانے سے پیشتر ہی خود اندھا ہو گیا۔ اور اُسے قید خانہ میں ڈالا گیا کیونکہ رواج ملک کے مطابق نابینا شخص راجہ نہیں رہ سکتا تھا۔ تاریخ فرشتہ میں ان واقعات کی تفاصیل موجود ہیں۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ سلطان بجائے غزنی کے گجرات کو اپنا دارالسلطنت بنانا اور لنکا وغیرہ جنوبی علاقے تسخیر کرنا چاہتا تھا۔

پہلا خیال، خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

(۱) اگر سلطان کا یہ ارادہ ہوتا تو کوئی امر اس کا مانع نہ تھا۔ گجرات کا میدان دشمنوں سے صاف تھا۔ راجہ بھاگ گیا تھا۔ خود سلطان نے ایک ایسے گمنام شخص کو جو خفیف سے خفیف بھی پولیٹکل اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ گجرات کی حکومت دیدی؛

---

[1] یہ شخص رائے دریشلم (دھیرو) آف افسانہ انوار سہیلی کی نسل سے تھا۔

اگر وہ خود وہاں رہنا چاہتا تو ہندو راجہ کو حکومت کیوں دیتا! ؟

(۲) اگر سلطان ہندوستان میں اپنی مستقل حکومت چاہتا تھا اور اس مقصد کے سے گجرات کو اپنا صدر مقام بنانا چاہتا تھا۔ تو یہ سبب صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ گجرات مرکز میں نہیں۔ بلکہ مغربی کنارے پر علیحدہ مقام ہے۔

(۳) گجرات کی آب وہوا غزنی سے بہتر نہیں تھی۔ سلطان ہر موسم بہار میں واپس غزنی پہنچ جایا کرتا تھا۔ پس یہ بھی صحیح نہیں کہ وہ آب وہوا کے لحاظ سے گجرات کو پسند کرتا تھا۔

(۴) غزنی اور گجرات کے درمیان کا رستہ اور فاصلہ دشواریوں سے مملو تھا۔

پس یہ صحیح نہیں کہ وہ غزنی کے بجائے گجرات (انہلواڑہ) کو اپنا دارالحکومت بنانا چاہتا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ سلطان نے جزیرہ لنکا وغیرہ کے فتح کرنے کا ارادہ کیا ہو۔ مگر اس کے لئے بحری فوج کی ضرورت تھی اور سلطان کے پاس صرف بری فوج تھی۔ اس زمانہ میں مصر، شام اور سپین وغیرہ کے مسلمان جہازران دور دراز سمندروں کے اندر گشت لگاتے پائے جاتے تھے۔ مغربی سواحل پر بھی یہ موجود تھے۔ پس قرین قیاس ہو سکتا ہے کہ سلطان نے اس قسم کی بری فوج بھرتی کر کے جہازی بیڑا مرتب کر لینے اور اس کے ذریعے لنکا پر چڑھائی کرنے کا عزم کیا ہو۔ لیکن تاریخ سے ثابت نہیں کہ اس تجویز نے عملی جامہ پہنا۔

واپسی غزنی مہمات گجرات سے فارغ ہو کر سلطان نے غزنی کا عزم کیا۔ مگر انہیں مصالح سے جو سفر آمد میں مدنظر تھے راجپوتانہ اور پنجاب کا عام اور سہل راستہ چھوڑ کر سندھ کی راہ جانے کا قصد کیا۔ مقامی ہندو رہبری کی خدمت انجام دیتے تھے۔ یہ لوگ غزنوی فوج کو ایک بے آب و گیاہ صحرا میں لے پہنچے۔ چنانچہ بہادر شدت تشنگی سے مثل ماہیٔ بے آب تڑپنے لگے۔ یہ راہبر سومنات جی کے پجاری اور خادم تھے۔ اور انہیں انتقام کی ترکیب واقعی خوب سوجھی۔ آخر انہیں سلطان نے قتل کرایا۔

دعا ایسے نازک موقعوں کے لئے سلطان کے پاس ایک ہتھیار تھا۔ یعنی دعا۔ چنانچہ فوراً وضو کیا۔ دو نفل پڑھے۔ اور نہایت خضوع و خشوع سے جناب باری میں دعا مانگی۔ جو فوراً قبول ہوئی۔ سلطان نے سجدہ سے سر اٹھایا ہی تھا کہ شمال کی جانب سے روشنی نمودار ہوئی۔ اسی جانب فوج کو کوچ کا حکم دیا گیا۔ علی الصباح ایک چشمہ پر پہنچے۔ آدمی اور گھوڑے سیر ہوئے اور ورطۂ ہلاکت سے نجات پائی۔

"لینفھرج صاحب لکھتے ہیں کہ" رستے میں اُس کے (سلطان کے) لشکر کے بہت سے آدمی تباہ ہوئے" اس کے قبول کرنے میں ہمیں تامل ہے۔ تاہم کچھ شک نہیں کہ اس سفر میں خود سلطان اور مجاہدین نے غیر معمولی تکالیف برداشت کیں۔

جاٹ

اثنائے راہ میں جاٹ سدّ راہ ہوئے۔ مقصد ان کا غارت گری سے زیادہ نہ تھا۔ سلطان نے ان کی سزادہی اگلے وقت کیلئے اٹھا رکھی اور فی الحال اس قدر مقابلہ کیا کہ فوج اس علاقہ سے نکل جائے۔ سندھ میں غزنوی فوج کی بالکل مزاحمت نہیں ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ سندھ میں اس وقت کوئی ہندو طاقتور حکومت یا ریاست موجود نہ تھی۔ غزنوی ان کو کمزور کر چکے تھے۔ اس طرح یہاں کی اسلامی حکومت بھی برائے نام رہ گئی تھی۔ لے دے کے قرامطہ یا ملاحدہ تھے۔ مگر وہ محمودی بہادروں کے ہاتھ پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔

جاٹوں کو سزادہی

گجرات سے واپسی کے وقت جاٹ سدّ راہ ہوئے تھے سلطان نے غزنی پہنچ کر کچھ بہادر ہمراہ لیکر ان غارت گر جاٹوں کو سزا دینے کے عزم سے کوچ کیا اور دریائے اٹک کے کنارہ تک آپہنچا۔ جاٹوں میں رُو در رُو مقابلہ کی قوت نہ تھی۔ وہ اٹک کے جزیروں[1] میں پناہ گیر ہو گئے۔ اپنے عیال و اطفال کو بھی وہیں بھیجدیا لیکن ان کی اس طرز عمل سے سلطان انہیں چھوڑ کر واپسی کا عزم نہیں کیا بلکہ ان کے مقابلہ کے لئے چودہ سو خاص کشتیاں روانہ کیں۔ ان میں سامنے اور دائیں بائیں ایک تیز نوکدار لوہے کی سلاخ لگی ہوئی تھی۔ ان کشتیوں میں ہر ایک میں بیس تیر انداز سپاہی بٹھائے گئے۔ اب[2] جاٹوں کو بھی آسانی سے جان بچتی نہ دکھائی دی۔ مقابلہ کی ٹھہرائی چنانچہ وہ ہزار ہا کشتیاں لیکر مقابل آئے۔ جنگ شروع ہوئی سلطانی کشتیوں کے سامنے جاٹوں کی کشتیاں آکر پاش پاش ہو جاتی تھیں جس کی وجہ سے غزنویوں کو کامیابی حاصل ہوئی جاٹ یا مارے گئے یا مع اہل و عیال اسیر ہو گئے۔

---

[1] یہ جزائر غالباً نصف کوٹ سے نیچے ہونگے جہاں پنجاب کے پانچوں دریا ایک میں شامل ہوتے ہیں۔ دریا کے اندر کے وقت درمیان میں عارضی طور پر چن جاتے ہوں گے۔ [2] الفنسٹن صاحب کو اس تعداد کی سچائی میں شک ہے۔

سلطان محمود اور خلافتِ بغداد

مسئلہ خلافت، ہمارا ایک خالص مذہبی مسئلہ ہے۔ اسلامی دارالخلافہ دنیا بھر کے مسلمانوں کا دینی مرکز اور ملجا وماویٰ ہے۔ اسلامی دنیا کا عقیدہ ہے کہ خلیفہ دنیا میں ایک ہی ہو سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آغاز اسلام سے نہ صرف جمہور مسلمانوں کے قلوب دارالخلافہ اور خلیفۂ وقت سے وابستہ رہے ہیں۔ بلکہ دنیا بھر کے ذی اختیار، صاحب قوت وشوکت سلاطین اسلام نے بھی بارگاہ خلافت میں سرنیاز جھکایا ہے۔ اور خلیفہ کا یہ احترام اس صورت میں بھی قائم رکھا ہے۔ جب اس کے ممالک محروسہ کی حدود شہر بغداد سے باہر نہ تھی۔ اور پولٹیکل نقطۂ خیال سے اس جسم میں بالکل جان نہ تھی۔ اس وقت بھی دنیا بھر کی مساجد میں خطبہ اسی خلیفہ کے نام سے پڑھا جاتا رہا ہے۔ اور اس کے ہوتے ہوئے کوئی قوی سے قوی حکمران "خلیفۃ المسلمین" کہلانے کا حق نہیں رکھتا تھا۔

پروفیسر آزاد "سخندان پارس" میں لکھتے ہیں:۔

"دوسری صدی ہجری سے عباسیہ دور دورہ تھا۔ کہ عیاشی نے خلافت کو سلطنت بنایا۔ اور غفلت نے سلطنت کو ضعیف کرنا شروع کیا۔ دربار میں رنگ رنگ کے مصاحب۔ محلوں میں قوم قوم کی عورتیں بھر گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہر مملکت

میں ایک ایک ہمت والا خود سری کی تلوار باندھ کر بادشاہ بن بیٹھا۔ خلفا فقط دارالسلام بغداد میں تبرک بن کر رہ گئے۔ لیکن قرابت نبوی کا نام درمیان تھا۔ اس لئے حالت مذکورہ نے طول کھینچا"

برخلاف اس کے جن چند مسلمان حکمرانوں نے اس اسلامی اصول کو نظرانداز کیا انہیں بچانوے فیصدی حکومت میں ناکامی ہوئی اور عالم اسلامی میں انہیں ہردلعزیزی حاصل نہیں ہوئی۔ مثلاً مصر کے سلاطین بنی فاطمہ۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ اتحاد قومی کے لئے ایک قومی مرکز اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے ایک دینی پیشوا کی ضرورت ہے۔ اسی ضرورت کو پورا کرنیوالا ہے خلیفہ اور خلافت کا وجود۔ کاش منکرین خلافت اس رمز کو سمجھتے!

دنیا کے عظیم الشان اور پرجبروت مسلم سلاطین نے تخت خلافت کے سامنے سر جھکایا۔ اور خلیفہ کی اطاعت کو اپنے لئے مایہ فخر سمجھا ہے۔ چنانچہ سلاطین سامانی۔ سلجوقی۔ اتابکہ۔ ایوبیہ۔ اور غزنویہ باوجود خودمختار اور با اقتدار ہونے کے خلیفہ وقت کا احترام مدنظر رکھتے اور اسی سے سند سلطنت حاصل کرتے تھے۔ اور اس میں انہیں کا فائدہ تھا۔ خلیفہ کی سند سے وہ جائز سلاطین سمجھے جاتے تھے۔ ان کی حکومت عام مسلمانوں میں ہردلعزیز ہوتی تھی۔ مجاہدین گروہ در گروہ ان کے زیر علم جمع ہوتے اور اپنے اس دینی فرض کو ادا کرتے۔ اور اس طرح اس حکمران کا اقتدار بڑھاتے تھے۔ جہادی تحریک کرتے رہنا فرائض خلافت میں [illegible] ہے۔ اور خلفاء

وقت ایسی تحریکات اس زمانے میں بھی کرتے رہے۔ جب کہ خود ان میں قوت نہ تھی

اس وقت مسند خلافت پر خلیفہ[1] القادر باللہ ابو العباس۔ احمد بن اسحٰق بن مقتدر جلوہ آرا تھا اور کوئی پولیٹیکل اہمیت نہ رکھتا تھا۔ تاہم اسلامی دنیا میں اس کا احترام قائم۔ بالخصوص ایشیا میں اس کی سند حکومت کا سکّہ رائج تھا۔ وہ خود بہاء الدولہ دیلمی کی امداد سے خلیفہ بنا تھا۔ اور بغداد سے باہر قطعہ قطعہ پر خود مختار حکمران حکومت کرتے تھے مگر بایں ہمہ کم از کم تمام مشرقی دنیا میں سکہ و خطبہ القادر باللہ ہی کا جاری تھا۔ زبردست سے زبردست حکمران کو سند حکومت اور خطاب یہی عطا کرتا تھا۔

---

[1] بعد خلع "الطائع اللہ" شوال ۳۸۱ھ میں صاحب خلافت ہوا۔ صاحب دیانت فقیہ۔ فاضل صاحب تصنیف و تالیف دیندار خلیفہ تھا۔ خیرات بہت کرتا تھا۔ نماز تہجد کبھی قضا نہ کی۔ ایک کتاب فضائل صحابہ، تکفیر معتزلہ اور رد خلق قرآن میں لکھی۔ یہ کتاب جامع مسجد مہدی میں ہر جمعہ کے دن حلقہ ہائے حدیث میں پڑھی جاتی تھی۔" یہ بیان مؤلف تاریخ الخلفا کا ہے۔ افسوس کہ انھوں نے اس کتاب کا نام نہیں لکھا۔ اگرچہ اس کا پولیٹیکل اقتدار بغداد کی فصیل سے باہر نہ تھا۔ لیکن اس کے اثر کا قدرے اندازہ اس واقعہ کے معلوم کرنے سے ہوتا ہے کہ ۳۹۴ھ میں بہاء الدولہ نے شریف ابو احمد الحسین بن موسیٰ الموسوی کو قاضی القضاۃ منتخب کیا لیکن خلیفہ نے اس کی منظوری نہ دی۔ اس لئے قاضی القضاۃ کی خدمت ان کے سپرد نہیں کی گئی۔ ۴۰۴ھ میں اس نے مستورات کے خواہ دن ہو یا رات گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت کی اور اس کی تاحیات اس پر عمل ہوتا رہا۔ اس کے دربار میں علما و فضلاء دینی کا بڑا مجمع رہتا تھا۔ آخر ۴۱ سال تین ماہ خلافت کر کے شب دوشنبہ ۱۱ ذی الحجہ ۴۲۲ھ کو وفات پائی۔ انا للہ۔ الخ

سلطان محمود (جو ایک دیندار۔ اور ایشیا بھر میں طاقتور حکمران تھا) خلافت کا احترام واجب۔ اور خلیفہ وقت کی اطاعت کو شعار دینی سمجھتا تھا۔ محمود اپنے باپ کی حکومت کا بہ طریق جائز وارث ہوا۔ پھر اس نے اپنی قوت بازو سے ایشیا میں فتوحات نمایاں حاصل کیں۔ ہندوستان کی جانب بڑھا۔ خلیفہ بغداد (القادر باللہ) نے اُسے "امین الملت و یمین الدولہ" کا خطاب بھیجا۔ اور اُسے مشرقی ممالک کا سلطان تسلیم کیا۔ سلطان نے ان ہدایا کو بہ احترام قبول کیا۔ اور خلیفہ کا شکریہ ادا کیا۔

کچھ عرصہ بعد ایک نیا واقعہ پیش آیا۔ جس سے خلافت اور سلطان کے درمیان یک گونہ شکر رنجی سی ہوگئی۔ اس وقت خراسان خاندان بنی لیث اور امرائے دیلمی کے قبضہ میں تھا۔ سلطان نے بنی لیث کو زیر کرکے خراسان اس کے قبضہ سے نکال لیا۔ لیکن دوسرے حصے کے لئے خلیفہ کو لکھا۔ اس امر کا ہم نے پیشتر اشارہ کیا ہے کہ یہ خلیفہ امرائے دیلمی کے اثر سے خلیفہ بنا تھا۔ پس اب دربار خلافت سے سلطان کو خشک جواب ملا۔ اور اس کے ساتھ اسے تحکم کے لہجے میں یہ بھی لکھا کہ

"اگر بزور شمشیر سمرقند (خراسان) پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا تو یاد رکھو کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو ہمراہ لے کر تمہارے ملک پر چڑھائی کروں گا۔"

ان الفاظ کو پولیٹیکل قوت اور سپاہ خلافت سے جس قدر تعلق تھا۔ سلطان اس سے واقف تھا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ خلیفہ کے مذہبی اقتدار اور دینی احترام سے

بھی بیخبر نہ تھا۔ بایں ہمہ وہ خود مختار اور طاقت ور سلطان تھا۔ جوش میں آگیا اور خلیفہ کو حسب ذیل مضمون کا مراسلہ بھیجا:۔

"میں جانتا ہوں۔ کہ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اور تمہیں تو اگر ایک ہزار ہاتھی ہی روانہ کر دوں تو وہ بغداد کی خاک تک غزنی لے آئیں۔"

اس کے جواب میں دربار خلافت کا ایک سربمہر خریطہ سلطان کے پاس پہنچا جو امرائے دربار کے روبرو کھولا گیا تو اس میں صرف حسب ذیل مختصر الفاظ مرقوم تھے:۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ا۔ ل۔ م

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ اَجْمَعِیْنَ ہ

بس اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔

اس تحریر کا مطلب کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ خود سلطان اور تمام درباری امراء وزراء سر در گریبان تھے۔ مگر آخر کار اس معمہ کو ابوبکر قہستانی نے حل کیا۔ آپ نے فرمایا کہ "ا۔ ل۔ م" سے اشارہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سورہ

الم تر کیف سے کی جانب ۔یعنی خلیفہ کا کنایہ ہے کہ اگر سلطان کو اپنے ہاتھیوں کی قوت پر ناز ہے اور وہ دارالخلافہ کا عزم رکھتا ہے تو اس کا حشر وہی ہوگا جو اصحاب فیل کا ہوا تھا۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحَابِ الْفِيْلِ	کیا تو نے نہیں دیکھا؟ کہ خدا تعالیٰ نے
اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۙ وَّاَرْسَلَ	اصحاب فیل کیا تھ کیا کیا؟ کیا ان کے مکر کو مردود
عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۙ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ	نہیں کر دیا۔ اور ان کے اوپر بھیجے پرند جانور
مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ	جماعت جماعت جو پھینکتے تھے کنکر تو
	پس ان کو مثل بھس کھائے ہوئے کے کر دیا؛

ولادت رسول کریم کے سال یمن کا بادشاہ ابرہتہ الاشرم (مسیحی) اپنے ہاتھی لیکر خانہ کعبہ پر چڑھ آیا کہ (معاذاللہ) اسے مسمار کردے کیونکہ اس نے بھی ایک عبادت خانہ بنایا تھا۔ اور اس کی کوشش تھی۔ کہ لوگ خانہ کعبہ کو چھوڑ کر اس کے معبد میں حج وطواف کے لئے آیا کریں۔ جب سے اپنے منصوبہ میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے خانہ کعبہ کو ڈھا لے کا ارادہ کیا۔ فوج کثیر اور ہاتھی لے کر آ موجود ہوا۔ شاہ عبدالقادر صاحب موضح القرآن لکھتے ہیں کہ "اقوام عرب اس کی مزاحم ہوئیں مگر ابواب نے ان کے ہاتھ سے زک اٹھائی جب وہ حرم کی حد میں بیٹھے تو آسمان سے سبز پوش پرندے آئے۔ ہر ایک کے منہ میں ایک ایک اور پنجوں میں دو دو سنگریزے تھے۔ ان کی تعداد لاکھوں تھی۔ یہ کنکریاں دشمن کے مثل گولی کے لگتی تھیں اگر اوپر کی پشت پر لگی تو پیٹ سے جا نکلی۔ آدمی کی تو کیا حقیقت؟ غرضکہ اس فوج میں سے ایک فرد بشر بھی نہ بچا۔" ذالملخصی اسرسید نے اس فوج کا ہلاک ہونا مرض چیچک سے لکھا ہے۔

دیندار سلطان یہ سُنکر لرزہ اندام ہوا جتی کہ اس پر غشی طاری ہوگئی۔ جب
ہوش میں آیا تو استغفار کی۔ اور سفیر خلافت سے معذرت خواہ ہوا۔ اور اسے
بیش قیمت نقری تحائف دیکر بہ احترام تمام رخصت کیا۔ اور خلیفہ کو معذرت نامہ لکھا۔
اس سلسلہ میں ابوبکر کو شاہانہ خلعت اور منصب امارت عطا ہوا۔

اس واقعہ سے ثابت ہے۔ کہ سلطان محمود کے دل میں خوف خداوندی اور
عظمت قرآن حد سے زیادہ تھی۔ اور یہی علامت اتقا و دینداری ہے۔

جب فتح گجرات کے واقعات دربار خلافت میں گوش گزار کئے گئے۔ تو
خلیفہ نے مسرور ہوکر سلطان اور اس کے اعزا کے لئے حسب ذیل محترم خطابات
تجویز کر کے بھیجے (۴۱۷ھ)

(۱) سلطان کے لئے :۔ "کہف الدولہ والاسلام"

(۲) مسعود ابن محمود کے لئے :۔ "شہاب الدولہ"

(۳) محمد ابن محمود کے لئے :۔ "جلال الدولہ"

(۴) برادر سلطان یوسف کے لئے :۔ "عضد الدولہ"

اسی وقت خراسان نیمروز اور ہندوستان کی حکومتوں کے فرمان خلیفہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور ان کے نزدیک اس سورۃ کی تفسیر یہی ہے۔ بہرحال
اس میں شک نہیں کہ کفار سے خانہ کعبہ کی حفاظت خود خدائے تعالیٰ نے فرمائی۔ خانہ
کعبہ کو ایسے کئی مواقع پیشتر بھی آئے ۔

سے نے سلطان محمود کو عطا کئے ۔

سلطان محمود غزنوی کی فتوحات ۔ خلفا راشدین کی فتوحات سے بہت کچھ مشابہ ہیں ۔ ان کا مقصد حصول رضائے الٰہی ۔ خدمت اسلام ۔ استیصال کفر و شرک ۔ اشاعت اسلام و ترویج شعائر اسلام وغیرہ مبارک نتائج تھے ۔ علاوہ ازیں سلطان نے بیشمار مساجد و خانقاہ اور درس گاہیں تعمیر کرائیں ۔ اور پیشوایان دین کی خدمات کیں ۔ سلطان کی خدمات سندھ اور ہند میں نمایاں تھیں ۔ اس لئے خلیفہ اسلام اور جمہور اسلام کا اس سے متاثر ہونا، قدرتی امر تھا ۔

جب یہ اخبار دار الخلافہ بغداد پہنچے تو خاص و عام کے دل جوش و جذبات سے مملو ہو گئے ۔ خود خلیفہ نے سلطان محمود کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے تعریف و توصیف کی اور عوام نے جشن اور جلسے منعقد کر کے مسرت کا اظہار کیا ۔

سلطانی تحائف قنوج کی فتح کے بعد سلطان محمود نے فتح نامہ کے ساتھ دو عجیب وغریب تحفے دربار خلافت میں روانہ کئے ۔ اس تقریب سے بغداد میں مسلمانوں نے ایک عظیم الشان جشن کیا ۔ اور چراغاں وغیرہ کے ذریعے اظہار مسرت کیا ۔

مرسلہ من تحائف میں سے ایک پرندہ، قمری کی شکل کا تھا ۔ اس میں عجیب و غریب یہ خاصہ تھا ۔ کہ جب اسے زہر آلودہ طعام کے قریب لایا جاتا تھا تو وہ چیخ اُٹھتا

ہو جانا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے[1]۔ غالباً یہ ہندوستانی صنعت کا نمونہ اور ہندوستانی ایجاد تھا۔

دوسرا تحفہ ایک نادر پتھر تھا۔ اسے گھس کر لگانے سے ہر قسم کا زخم مندمل ہو جاتا تھا۔ یہ کسی راجہ نے سلطان کو پیش کیا تھا۔ سلطان نے خلیفہ کو بھیجدیا۔ یہ پتھر قدرتی چیز تھی۔ اور قدرت کے خزانہ میں سے منجملہ ان چیزوں کے تھی۔ جو قدرت نے ہندوستان کو عطا کی÷

[1] قمری کی آنکھ میں ایسی دوا لگائی گئی جس کا اثر زہر پر فوراً یہ ہو کہ وہ پانی ہو کر بہنے لگے۔ پرند کے اندر ایسی ادویہ رکھی گئی ہوں گی کہ وہ ان کے قرب سے مثل پارہ بیقرار ہو۔ خواص ادویہ کی واقفیت تامہ سے ایسی اشیا بنائی جاسکتی ہیں مگر دلیل کمال فن ہے۔ اس آلہ کے بنانے والے کو خواص ادویہ کا ماہر ماننا پڑتا ہے۔ اور اگر یہ شے درحقیقت ہندوستان ہی میں طیار ہوئی تھی تو ہندوستانی اطبا کے کمال کی دلیل ہے۔ جس پر ہندوستان کی موجودہ نسلیں بھی بجا فخر کرسکتی ہیں÷

لفظ "سلجوق" کی اصل ترکی زبان کا لفظ "سلجک" ہے۔ جسے معرب کر کے سلجوق بنا لیا گیا۔ مورخین کا اس امر میں اتفاق ہے۔ کہ ان کا سلسلۂ نسب افراسیاب سے ملتا ہے۔ "سلجک" یا "سلجوق" ایک سردار قبیلہ کا نام ہے۔ اسی کے نام سے تمام قوم مشہور ہوئی۔ اور بالآخر وارث حکومت ہوئی۔

سلجوق کا باپ دقاق، جو اپنی دلیری اور شہ زوری کی وجہ سے تمر بالیق (کڑی کمان) مشہور ہے۔ امرائے ترکمان بیغو کا کارگزار تھا۔ لیکن سلجوق نے غیر معمولی قوت حاصل کی رکھتی کہ اپنے آقا سے تمرد اختیار کیا۔ اسی کی اولاد کثیر سلجوق کہلائی سلجوق نے جب آقا کے تیور بگڑے ہوئے دیکھے تو چپکے سے وہاں سے کوچ بول دیا۔ ایک سو سوار، ڈیڑھ ہزار شتر اور پچاس ہزار گوسفند اس کے قبضے میں تھیں۔

سلجوق نے جند میں قیام کیا۔ بہت سے ترکمان اس سے آملے۔ اور اس طرح اس گروہ نے کافی قوت حاصل کر لی۔

قوم سجوق داخل اسلام ہو کر اور غیر مسلم ترکوں سے الگ ہو کر ماوراء النہر میں ایک خانہ بدوش قوم کی حیثیت سے رہنے سہنے لگی۔ جہاں سبزہ اور ضروریات زندگی کی افراط دیکھتی نقل مکان کر جاتی۔ تاہم سادہ معاشرت اور جفاکشی کی بدولت اس کی

جمعیت وقوت اور تمول روز بروز بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ یہ لوگ ماوراءالنہر کے امن پسند شہریوں پر دست درازیاں کرنے لگے۔ اس علاقہ کو تاخت وتاراج کیا۔ اس طرح ان کی دلیری اور شہ زوری کے افسانے دور ونزدیک مشہور ہوگئے۔ اور امن پسند آرام طلب شہری ان کے نام سے کانپنے لگے۔

اب سلجوقیوں نے دلیر ہوکر ایک قدم اور آگے رکھا۔ جند سے نقل مکان کرکے بخارا کے قریب طرح اقامت ڈالی۔ شاہ ترکستان (   ) کے عمال کو تنگ کرنا اور اس کے علاقہ کو دبانا اور تاخت وتاراج کرنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ شاہ ترکستان کی ماتحتی سے اپنے آپ کو آزاد کرلیا۔

سلجوق کے چار فرزند میکائیل۔ اسرائیل۔ موسیٰ اور بیغو تھے۔ آخرالذکر ارسلان کے نام سے مشہور ہے۔ میکائیل کے دو فرزندوں (طغرل بیگ اور چغر بیگ) کی پرورش سلجوق نے کی۔ یہ دونوں بھائی برادرانہ اتفاق واتحاد کی اعلیٰ نظیر تھے۔

عہد سلطان محمود

سلطانی عمال سلجوقیوں سے نرمی وگرمی کا برتاؤ کرتے رہے۔ اور اسی پالیسی سے کام نکالتے رہے۔ چنانچہ انہیں ان کی درخواست پر معافیاں بھی دی گئیں اور سزائیں بھی۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ سلطانی عمال ان لوگوں کو خانہ بدوش قزاقوں سے زیادہ وقعت نہ دیتے تھے۔ اور اس لئے ان کے استیصال پر آمادہ نہ ہوسکتے تھے۔ بلکہ ذرا دھمکا دیتے تھے۔ لیکن یہ غلطی تھی۔

خود سلطان محمود بھی ان کو زیادہ اہمیت نہ دیتا بلکہ صحرانشین بے حیثیت قبیلہ سمجھتا تھا مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلجوقیوں نے زیادہ ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کئے۔ ان کے حوصلے بڑھ گئے آپس میں تو جائیں کہاں، رہ رہ کر سلطانی رعایا کو ستانا اور تاخت و تاراج کرنا شروع کیا حتیٰ کہ ان کا جان و مال معرض خطر میں نظر آنے لگا۔ بالآخر جب سلطان وہاں سے غیر حاضر اور مہمات گجرات میں مصروف تھا تو سلجوقیوں نے زیادہ آفت برپا کی۔ آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سلطان کو اس امر کی اطلاع پہنچی تو اس نے امیر الحرب ارسلان طوس کو ان کی سرکوبی پر مامور کیا۔ امیر طوس نے ابتداً سلجوقیوں کو چند زکیں دیں لیکن بالآخر وہ ان سے تنگ آ گیا اور اس نے سلطان کو صاف الفاظ میں لکھ بھیجا کہ جب تک حضور خود بنفس نفیس تشریف نہیں لائیں گے۔ یہ فتنہ فرو ہوتا نظر نہیں آتا۔"

اب سلطان سلجوقیوں کو کسی قدر سمجھا۔ گویا وہ چونک پڑا۔ اور بذات خاص ان پر حملہ آور ہوا۔ سلجوقی دلیرانہ مقابل آئے جان توڑ مقابلہ کیا۔ مگر عہدہ برآ نہ ہوئے۔ چنانچہ سلطان کے مقابلے میں شکست کھائی جس میں سلجوقی کھیت رہے۔ ان کا سردار میکائیل اسیر کر کے قلعہ گوالیار میں نظر بند کیا گیا۔ بقیۃ السیف سلجوقی طالب امان ہوئے۔ سلطان نے ان کا قصور معاف کیا اور بدستور اپنے علاقہ میں انہیں رہنے دیا۔ چنانچہ خراسان کی طرف انہیں بھیجدیا گیا لیکن یہ خطرناک غلطی تھی۔ خراسان کے آرام طلب اور کمزور باشندے ان شہرہ پشتوں سے کب عہدہ برآ ہو سکتے تھے۔ بہرحال اس وقت اس سلجوقی کی بغاوت بہ کامیابی تمام فرو ہو گئی۔

چند روز کے بعد پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ رعایائے خراسان تنگ آ گئی۔ حکومت سے طالب امداد ہوئی۔ سلطانی فوجیں آئیں اور ان قزاقوں کو مار کر وہاں سے نکالتی رہیں۔

خاندان غزنی کے عروج سے قبل آل بویہ (دیلمیان) کا ستارہ بلندی پر چمکتا تھا۔ اور اسی خاندان کے حکمرانوں کا بغداد پر اثر تھا۔ ایران (رے) پر انہیں کا قبضہ تھا۔ سلطان محمود کے ابتدائی زمانے میں فخر الدولہ برسر حکومت تھا۔ اس وقت سلطان کی توجہ ادہر مبذول نہ ہوئی، اس لئے کہ ہنوز خلیفہ بغداد نے حکومت خراسان کی سند سلطان کو عطا نہیں کی تھی۔ بہاء الدولہ کی وفات کے بعد صغیر سن مجدالدولہ وارث حکومت رہا۔ اس کی ماں نہایت دانشمند اور تجربہ کار عورت تھی۔ اس کی کوشش کا یہ نتیجہ ہؤا۔ کہ امراء نے دولت مجد الدولہ کی تخت نشینی پر رضامند ہو گئے۔ الغرض اس نے ماں کی سرپرستی میں حکمرانی شروع کی۔ حتیٰ کہ مجدالدولہ سن رشد کو پہنچ گیا۔

اب اس نے اپنی ماں کو کار سلطنت سے بے دخل کرنے کا ارادہ کیا۔ اور بالآخر وہ اپنے منصوبہ میں کامیاب ہوا۔ مجد الدولہ کا یہ طرز عمل ماں کو شاق گذرا۔ چنانچہ وہ دل گرفتہ ہوکر کردستان چلی گئی۔ اور وہاں پہنچ کر لشکر آرائی شروع کی۔ چند روز بعد اس عورت نے رے پر مردانہ وار حملہ کیا۔ اور کامیابی حاصل کی۔ سلطنت پر اس کا قبضہ ہوگیا۔ اور اس نے نہایت عمدگی سے حکومت

شروع کی۔

اس وقت سلطان محمود غزنوی کا زمانہ تھا۔ اُس کی کشور کشایانہ آرزوؤں کی انتہا نہ تھی۔ ہر جانب نظریں دوڑا رہا تھا۔ ایران (رے) کی جانب بھی اس کی توجہ مبذول ہوئی۔ جانتا تھا کہ دیلمیوں کا آفتاب اقبال لب بام ہے۔ اور فوجی روح ان کی مُردہ ہوچکی ہے۔ پھر یہ بھی معلوم تھا کہ اس وقت ایک عورت حکمران ہے۔ الغرض سلطان نے تسخیر ایران کا ارادہ کیا۔ مگر لشکرکشی سے قبل حسب قاعدہ نامہ و پیام کی سلسلہ جنبانی کی۔ چنانچہ اس نے والیۂ رے کو حسب ذیل پیغام بھیجا۔

"زر را بہ نام من کُن۔ اگر جز ایں کُنی آمادۂ پیکار باش!"

جب محمودی قاصد رے پہنچا۔ اور اس نے سلطان کا پیغام ملکہ کو پہنچایا۔ تو اس عقل مجسم عورت نے جواباً کہا:۔

"جب تک میرا شوہر زندہ رہا اس وقت تک مجھے جنگ وجدال سے خوف آتا تھا۔ لیکن اب مجھے مطلق اندیشہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ جنگ کا انجام کار پردۂ غیب میں مخفی ہے۔ سلطان ایک طاقتور حکمران ہے۔ اگر وہ ایک بیوہ عورت کے مقابلہ میں کامیاب ہو تو شاید اس کے لئے کوئی مقام فخر ومباہات نہ ہوگا۔ لیکن اگر اس کے مقابلہ میں میں کامیاب ہوجاؤں تو یہ کلنک کا ٹیکہ قیامت تک سلطان

---

۱ نامۂ خسروان۔

کی پیشانی سے مٹائے نہ مٹے گا۔ ع

"چہ مردے بود کز زنے کم بود؟"

اس جواب نے سلطان کو ساکت کر دیا چنانچہ فی الحال اس نے ایرانی مہم کو ملتوی کر دیا۔ اور اس طرح ایک عورت[1] نے اپنے فہم وفراست کی بدولت اپنے ملک کو زبردست دشمن سے بچا لیا۔

بعد فتح گجرات سلطان توجہ پھر ایرانی معاملات کی طرف منعطف ہوئی۔ اسی زمانہ میں خلیفہ بغداد نے سند حکومت خراسان سلطان کو بھیجی۔ سلطانی حدود ملک بھی ایران تک جا پہنچی۔ اس وقت مجد الدولہ برسر حکومت تھا۔ اور اس کی دانشمند ماں وفات پا چکی تھی۔ سلطنت کا اندرونی نظام قابل اطمینان نہ تھا۔ کیونکہ اس میں نہ انتظامی قابلیت تھی نہ جوہر شجاعت۔

---

[1] چند روز بعد ملکہ نے اپنے بیٹے کا قصور معاف کر کے حکومت اس کے سپرد کی مگر کاروبار سلطنت میں وہ اس کی معاون ومددگار رہی۔ وہ جب تک زندہ رہی نظام حکومت بہ احسن وجوہ قائم رہا۔ لیکن اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی شیزارہ درہم برہم ہوگیا۔ اس سے ملکہ کی اعلیٰ انتظامی قابلیت کا ثبوت ملتا ہے۔ مجدُ الدولہ علم دوست، اور مطالعہ پسند مزاج رکھتا تھا۔ اس کی وسیع لائبریری اس کی سیرگاہ تھی۔ مرد میدان نہ تھا۔ اس کی پچاس بیگمات تھیں۔ تعداد اولاد نہیں۔ سلطان نے اس سے سوال کیا کہ تم نے اس قدر بیویاں کس شریعت کے رو سے کیں۔ اس نے جواب میں کہا۔ کہ ہمارے بزرگوں کا یہی طریقہ تھا۔

الغرض سلطان تسخیر ایران کے عزم سے غزنی چلا۔ مازندران میں شمس المعالی قابوس بھی اس سے آملا۔ اور رے کی جانب کوچ کیا۔ لیکن منزل مقصود پر پہنچنے سے قبل ہی مجد الدولہ سلطان کے پاس آگیا۔ اور اس نے اپنے آپ کو سلطان کے حوالے کر دیا۔ اسے مع اس کے ایک فرزند کے غزنی بھیجدیا گیا۔ ملک پر سلطانی عمل ہوگیا۔ سلطان کے اس سلوک کا مقابلہ کرو جو سلطان ہند راجاؤں سے معافی تقصیر اور تاج بخشی کی صورت میں کرتا رہا۔

مجد الدولہ کے دربار میں چند باطنی فرقہ کے امرا موجود تھے۔ ان کو سولی دی گئی۔ یہاں کے کل معتزلہ کو خراسان بھیجدیا گیا۔ اُن کی اور ملحدین کی کتابیں آتش سوزاں کے حوالے کی گئیں۔ باقی کتب خانہ غزنی گیا۔

سلطان نے ایران وعراق کی حکومت اپنے فرزند شہزادہ مسعود کے حوالے کی۔ اور ان تمام انتظامی امور کے بعد غزنی واپس ہوا۔
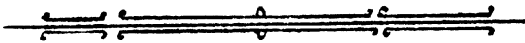
وفات

علالت بعد فتح ایران، سلطان کو سوء القینہ (سل) کی شکایت لاحق ہوئی۔ معالجہ شروع ہوا۔ شاہی اطبا نے ہزار نسخے بدلے لیکن مرض کی کیفیت میں کمی نہ آئی۔ بلکہ علامات بدرو نما ہوتے گئے۔ لیکن اولوالعزم سلطان بایں ہمہ مہمات ملکی اور انصرام کارہائے مملکت میں مصروف رہا چنانچہ اس نے حالت مرض ہی میں بلخ کا سفر کیا۔

موسم سرما بلخ میں بسر کیا۔ اور بہار کے ساتھ سلطان بھی غزنی واپس آیا۔ مگر مرض ترقی کر رہا تھا۔ کوئی دوا راس نہ آتی تھی۔ اطبا مایوس ہو چکے تھے۔

بیت المال کا جائزہ اسی عالم میں سلطان نے حاضرات کا ارادہ کیا۔ اس نے حکم دیا کہ تمام شاہی مال ومنال خزائن اور سامان سلطنت میرے سامنے لایا جائے۔ چنانچہ ایک وسیع میدان میں زروجواہر، ہاتھی گھوڑے اور دیگر ساز و سامان سلطنت آراستہ کر دیا گیا۔ خزانہ بیشمار تھا۔ صرف سات سو رطل تو جواہرات بیش بہا ہی تھے۔

ڈھائی ہزار کوہ پیکر ہاتھی اور کئی ہزار بادپا گھوڑے ایک جانب کھڑے

تھے اور دوسری جانب چار ہزار غلامان خاصہ۔

دو ہزار غلام زرین کمر دوگوشہ کلاہان کج پہنے اور طلائی گرز ہاتھوں میں لئے ہوئے تھے۔ یہ سلطان کی دربار واری کے وقت دہنی جانب کھڑے ہوتے تھے۔ علیٰ ہذا دو ہزار غلام دوگوشہ ٹوپیاں پہنے اور چاندی کے گرز لئے حاضر تھے۔ یہ دربار میں بائیں ہاتھ پر کھڑے ہوتے تھے۔

سلطان نے ان سب پر ایک نگاہ غلط ڈالی۔ اور آبدیدہ ہوگیا۔ فرشتہ لکھتا ہے۔ کہ "سلطان محمود ان تمام خزائن وغیرہ کو دیکھکر زار زار روتا رہا "ایک لمحہ بعد اس میں سے تھوڑا بہت لوگوں میں تقسیم کیا۔ جن سے وہ رخصت ہونے والا تھا" منہاج سراج نے بھی اس موقع پر سلطان کی داد و دہش کا ذکر کیا۔

اس کے بعد سلطان نے سب سامان کے واپس کئے جانے کا حکم دیا۔

یہ واقعات سب کے کم و کاست ہیں۔ ان سے ہر شخص نتائج اخذ کرسکتا ہے! حیف ہے۔ ان نادانوں کے دماغ پر جو اس جیسے سلطان کو زر پرست اور لالچی ثابت کرنے کی سعی بے حاصل کرتے اور سلطان کے رونے کو مال و منال کی محبت پر محمول کرتے ہیں!!

تم نے اسی کتاب میں پڑھا۔ کہ سلطان نے بہت سے ملک فتح کئے

لہ اردو تاریخ الفنسٹن صاحب صفحہ ۵۵۰

مقبرہ سلطان محمود غزنوی
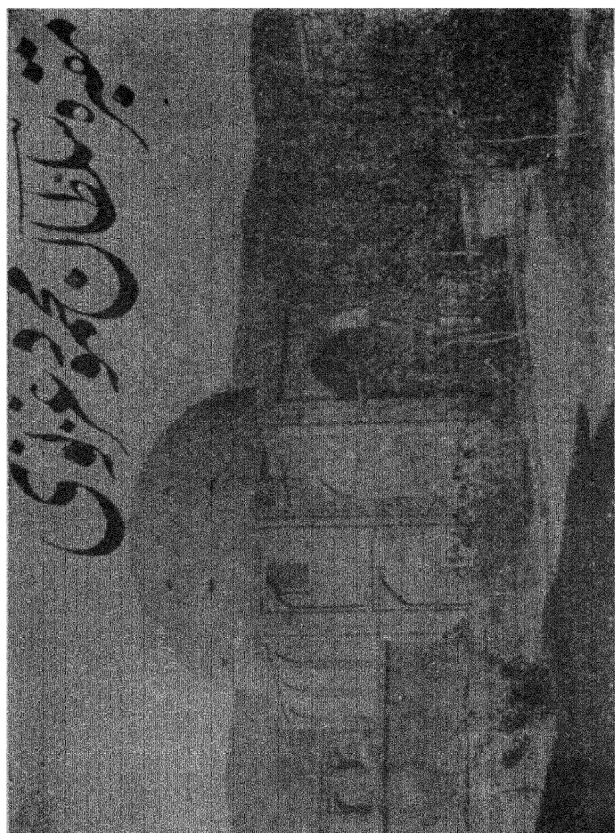
بیشمار مال و دولت اس کے قبضے میں آئی۔ جسے اس نے مختلف صیغوں میں خرچ کیا۔ فوج اور مجاہدین پر۔ عمارات پر۔ تعمیر جامع مسجد و دارالعلوم پر تعلیم عامہ پر۔ کارہائے رفاہ عام اور سلطنت کے ہر جائز شعبہ میں۔ علماء و فضلا اور شعرا اس کے شاندار دربار کی زینت تھے اور ہر موقع پر انعام و اکرام سے مالامال ہوتے رہتے۔

ان بیشمار جائز اخراجات کے بعد جو کچھ بچ رہا۔ وہ بیت المال میں بطور امانت تھا۔ استحکام حکومت اور اہل ملک کی بہبودی کے لئے بیت المال یا شاہی خزانہ حکمران کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا۔ وہ مال جمہور کا ہے۔

بعض نادان کہتے ہیں کہ سلطان کا مال و متاع خزانہ کو واپس لوٹا دینا قابل اعتراض تھا۔ گویا اُسے وہیں لٹا دینا چاہیئے تھا۔ ان باتوں کا وزن ظاہر ہے۔ اور جن ملغوں سے ایسی باتیں نکلتی ہیں۔ ان کے فہم و فراست کا اندازہ یہ جذبات خود ہیں۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ لیکن ہم سرسری طور پر ان سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا خزانہ کو لٹا دینا۔ اور سلطنت کو مفلس کر دینا کوئی دانشمندی کی بات ہو سکتی تھی۔ اور کیا تاریخ میں کوئی اس کی نظیر موجود ہے۔ کسی بادشاہ نے ایسا کیا۔

آج کہ تہذیب و روشنی کا زمانہ ہے کیا بادشاہ مرتے وقت خزانہ لٹا دیتا ہے۔ نہیں۔ بلکہ ہوتا یہ ہے۔ کہ گورنمنٹ شاہی دستاویزوں۔ کرنسی نوٹوں اور بنکوں کے ذریعے عوام کے روپے پر بھی خود قابض ہو جاتی ہے۔

سلطان کا آبدیدہ ہونا بھی کوئی امر عجیب نہیں - اس لئے اس کا زر پرست ہونا ثابت نہیں ہوتا! ہر انسان ذرا سے تامل سے سمجھ سکتا تھا کہ آخری وقت ہر شخص رقت انگیز ہوتا ہے - خصوصاً مسلمان - کیونکہ وہ دار العمل اور فانی دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر کے ایک ایسے سفر پر کمر باندھتا ہے - جسے یہ اپنی اصطلاح میں دار الجزا کہتا ہے - جہاں دربار رب العالمین میں اسے اپنے اعمال کی جواب دہی اور ذرہ ذرہ کا حساب دینا ہوگا -

یہ خیالات جن کا ہجوم دماغ پر آخری وقت ضروری ہے، ہر مسلمان کو لرزہ براندام اور رقیق القلب کر دیتے ہیں - پھر سلطان جیسے فاضل و بیدار مجاہد عروج زوال کے بیشمار نقشے دیکھنے اور سننے والے مسلمان کو اس وقت کیوں نہ رقت ہوتی جبکہ وہ احکم الحاکمین کے دربار میں جانے کو طیار تھا - اور اس کے اعمال کی باز پرس کا وقت قریب تھا -

بس یہ وجوہ تھے سلطان کے آخری وقت گریہ وزاری کے - یہ لغو ہے کہ زر و جواہر کو چھوڑتے ہوئے اس کا دل ٹوٹتا تھا - اتنی بات معمولی آدمی بھی جانتا ہے کہ موت ہر جاندار کے لئے ضروری ہے - اور سب کو بالآخر خالی ہاتھ جانا ہے - پھر کسی نامان سے نادان شخص کا بھی اس کے خلاف قیاس کرنا دیوانگی سے کم نہیں ہے!

آخر ۲۳ ربیع الاول ۴۲۱ھ (۱۹ اپریل ۱۰۳۰ء) کو چھتیس سال حکومت کرتے ۶۱ سال کی عمر میں اس دار فانی سے ملک جاودانی کی جانب رحلت کی -

انا للہ و انا الیہ راجعون

غزنی کے قصر فیروز میں دفن ہوا۔ اللہ باقی من کل فانی

ہزار قلعہ کشادم بہ یک اشارت دست — بسے مصاف شکستم بہ یک اشارت پائے

چو مرگ تاختن آورد ہیچ سود نداشت — بقا بقائے خدا است و ملک ملک خدائے

(سلطان محمود غزنوی رح)

اسلام اور اسیران جنگ

اسلام نے ابھی دنیا میں قدم رکھا ہی تھا کہ اسے اپنی حفاظت کے لئے تلوار ہاتھ میں لینی پڑی۔ پھر جب جہادی معرکوں کا آغاز ہوا تو اسیران جنگ کا مسئلہ پیش آیا۔ پہلے پہل غزوہ بدر میں ستر قیدی بارگاہ نبوت میں پیش ہوئے۔ حضورؐ نے حضرت ابوبکر سے رائے دریافت کی۔ آپ نے فرمایا۔ کہ کفار کو زرِ فدیہ لے کر چھوڑ دینا چاہیئے۔ پھر جب حضرت عمر سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ "کفار کو زندہ چھوڑنا کیسا؟ ہم کو چاہیئے کہ ہم خود اپنے اپنے ہاتھ سے اپنے عزیز کفار کو تہ تیغ کریں"

حضرت رسول کریمؐ نے اول الذکر رائے کو پسند فرمایا۔ چنانچہ ان اسیران جنگ کو زرِ فدیہ لے کر آزاد کر دیا۔ زمانہ مابعد میں بھی حضرت رسول کریمؐ اور ان کے وصال کے بعد خلفاء راشدین اور دیگر سلطان صاحبان نقش نگیں کا یہی طرزِ عمل رہا سلطان محمود ایک دیندار، پابند شریعت اور پرجوش مجاہد تھا۔ اس کا بھی یہی طرز عمل رہا۔ وہ کفار کو زرِ فدیہ لے کر برابر آزاد کرتا رہا۔ ہندوستان کے بڑی بڑی راجاؤں کو بھی اس نے آزادی بخشی جس کی تفصیل اکثر مواقع پر اس کتاب میں مذکور ہے۔

فدیہ کا مقصد

اسلام فدیہ کا موجد نہیں۔ اس سے پہلے بھی اقوام میں اس کا رواج تھا۔ لیکن اسلام اصولاً اس مسئلہ میں منفرد ہے۔ اعمال کے نتائج کا اثر خود عمل سے نہیں۔ بلکہ نیت سے ظاہر ہوا کرتا ہے۔ اختلاف نیت سے ایک ہی قسم کے اعمال کا نتیجہ مختلف صورتوں میں برآمد ہوسکتا ہے۔ اقوام سابقہ نے فدیہ کو تحصیل زر کے طور پر پسند کیا۔ لیکن اسلام نے محض بطور احسان۔ ایک بار رسول کریمؐ سے کفار نے اپنے ایک سردار کی نعش طلب کی اور فدیہ پیش کیا۔ لیکن آپ نے انکار کردیا۔ اگر فدیہ سے مقصد طلب منفعت ہوتا نہ کہ احسان تو یہ سودا زیادہ فائدہ کا اور بے ضرر تھا۔

حضرت رسول کریمؐ اکثر مرتبہ بغیر زر فدیہ ہی اسیران جنگ کو آزاد کردیا کرتے تھے چنانچہ قبیلہ بنی مصطلق کے بعض لوگوں کو آپ نے بلا فدیہ ہی بطور احسان رہا فرمایا۔ شہزادی جویریہ بنت حارث سردار یہود کو بھی بلا زرفدیہ آزاد کیا گیا۔ حالانکہ وہ ایک مجاہد کے حصے میں آچکی تھی۔ خود حضورؐ نے اپنے پاس سے زر فدیہ دے کر اسے رہا کرایا۔

اہل یمامہ کا سردار ثمامہ بن آثال جو نہایت امیر کبیر آدمی تھا، جب گرفتار ہوکر رسول کریمؐ کے پاس پیش ہوا تو آپ نے اس سے دریافت کیا۔ کہ تمہارے پاس کیا ہے؟ اس نے کہا کہ "اگر آپ قتل کرنا چاہتے ہیں۔ تو میری گردن میں خون موجود ہے۔ اگر آپ احسان کرنا چاہتے ہیں تو زبان شکر گزار۔ اور اگر زر فدیہ

کی ضرورت ہے۔ تو بہت سا مال بہ سہولت دے سکتا ہوں" حضور نے اُسے کسی معاوضہ کے بغیر آزاد کر دیا۔ اگر جلب منفعت مطلوب ہوتا تو اس سے خاطرخواہ زر فدیہ لیا جا سکتا تھا۔ اور یہ خود اس کی ادائیگی کے لیئے مستعد تھا۔ لیکن احسان کو ترجیح دی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ثمامہ فوراً ایمان لے آیا۔

عورتیں اور بچے

غزوۂ دومۃ الجندل میں ایک سو عورتیں اور بچے بطور اسیران جنگ لائے گئے۔ حضرت رسول کریم نے انہیں بغیر کسی خفیف سے خفیف معاوضہ کے بغیر آزاد کر دیا۔ غزوہ بنی تمیم و ہوازن میں گیارہ عورتیں اور تیس بچے گرفتار ہو کر آئے۔ حضرت نے ان کی آزادی کا حکم دیا۔

مال غنیمت اور قیدیوں کی واپسی

غزوہ ہوازن میں مال غنیمت کے علاوہ چھ ہزار اسیران جنگ مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ ان لوگوں نے اسلام قبول کیا اور مال غنیمت کی واپسی کی درخواست کی۔ تو جناب رسالت مآب نے فرمایا کہ مال غنیمت اور قیدی دونوں واپس نہیں کیئے جا سکتے (اس میں مجاہدین کی حق تلفی تھی) ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرو" ان لوگوں نے قیدیوں کی آزادی کو پسند کیا۔ لیکن مشکل یہ پڑی کہ قیدی مجاہدین میں تقسیم کیئے جا چکے تھے۔ رسول کریمؐ نے اس وقت ایک خطبہ پڑھا۔ اور ضمناً فرمایا کہ جو لوگ قیدیوں کو بہ طیب خاطر بلا معاوضہ واپس کرنا چاہیں۔ وہ یونہی واپس

کردیں۔ اور جو لوگ مالی معاوضہ کی خواہش کریں وہ ذرا صبر سے کام لیں۔ میں اپنے حصے کے مال غنیمت میں سے فی قیدی سو، سو، اونٹ تم لوگوں کو دیدوں گا۔ لیکن صحابہ کرام نے تمام قیدیوں کو بلا معاوضہ ہی آزاد کردیا۔

قاتلوں کے ساتھ سلوک

(۱) بعض بزدل کفار نے حضرت رسول کریمؐ پر کمین گاہوں سے بزدلانہ حملے کئے۔ مگر جب وہ گرفتار ہوکر آئے تو انہیں معاف و آزاد کردیا گیا (۲) کفار مکہ کے ۸۰ آدمیوں کی ایک جماعت نے نماز فجر میں حضور پر قاتلہ حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن صحابہ نے انہیں گرفتار کر کے حضور میں پیش کیا۔ مگر آپ نے کسی شرائط اور معاوضہ کے بغیر چھوڑ دیا۔ (۳) عہد نبوت میں متعدد قبائل کے غارت گروں نے ایک جتھہ قائم کرلیا تھا۔ یہ لوگ کھلے بندوں غارتگری کرتے تھے۔ آخر کار یہ لوگ مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوکر دربار رسالت میں پیش ہوئے۔ حضرت رسول کریمؐ نے ان کی رہائی کا حکم دیا۔ (۴) کفار قریش نے حضرت رسول کریمؐ اور جماعت مومنین پر جو جو مظالم کئے انہیں سنکر آج بھی بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ فتح مکہ کے وقت مسلمانوں کو کامل اقتدار حاصل تھا۔ تمام قریش کی جانیں ان کے رحم پر تھیں۔ قریش کے مظالم ان کی آنکھوں کے سامنے خوفناک انتقام کے نظارے پیش کررہے تھے۔ اور یہ سہمے ہوئے تھے کہ ہمارا قتل عام کیا جانا ضروری یا ہم سب کو پھانسی

دی جائے گی ۔ لیکن اس تمام قوم کو معاف کر دیا گیا۔ ان میں سے بعض لوگوں نے ایسے خطرناک جرائم کئے تھے کہ انصاف ان کی ہرگز جان بخشی نہیں کر سکتا تھا

ہبار اس کم بخت نے حضرت زینب (بنت رسولؐ) کے نیزہ مارا تھا ۔ اسی صدمہ سے آپ کا حمل ساقط ہوا اور بالآخر وفات پائی تھی ۔ قریش کا خیال تھا کہ وہ بے مواخذہ نہیں چھوڑا جائے گا ۔ لیکن حضرت رسول کریمؐ نے اسے معاف کر دیا ۔

عبداللہ بن ابی سرح کہتا تھا ۔ کہ وحی میرے پاس آتی ہے ۔ اور محمدؐ مجھ سے سن کر لکھواتے ہیں ۔ کس قدر سنگین جرم ۔ کتنا بڑا اتہام ؟ لیکن رسولؐ خدا نے اس کی بھی جان بخشی کی ۔

عکرمہ بن ابوجہل خود اس نے اور اس کے باپ نے مسلمانوں کے تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا ۔ بہت سے نقصانات اور مصائب کے یہی بانی تھے ۔ خود عکرمہ کو اپنے جرائم کا اندازہ کرتے ہوئے خلاصی کی امید نہ تھی ۔ اسی خیال سے وہ فرار ہو گیا تھا ۔ اس کی بیوی خدمت پیغمبر صلعم میں حاضر ہو کر طالب معافی ہوئی ۔ آپ نے اس کی جان بخشی فرمائی ۔

وحشی قاتل عم رسولؐ (حضرت حمزہ) کو بھی جس نے دھوکے سے آپ کو شہید کیا تھا ۔ رسول کریمؐ نے معاف کر دیا ۔

ہندہ اس سنگ دل عورت نے حضرت حمزہ کی نعش چیر کر کلیجہ نکالا اور دانتوں سے

چبایا تھا۔ شوہر کے مسلمان ہونے کی خبر سن کر اس کی ڈاڑھی نوچی تھی۔ فتح مکہ کے موقع پر اسی نے قریش کو مسلمانوں کے مقابلہ پر آمادہ کیا تھا۔ بایں ہمہ جب وہ شرمندہ و سرفگندہ ہوکر دربار نبوی میں حاضر ہوئی۔ تو رسول کریمؐ نے اس کے تمام قصور معاف فرمائے۔ اور اس کی جان بخشی کی۔

قیدیوں کی ضروریات کا مہیا کرنا

اس زمانہ کا ایک قانون ہے کہ اسیران جنگ کا زیور یا کپڑا انہیں اتارا جاتا۔ لیکن مسلمانوں نے قیدیوں کو اپنے پاس سے کپڑے پہنائے ہیں۔ اور حالت ناداری میں۔ غزوۂ بدر میں عباس برہنہ تھے۔ آپ نے عبداللہ بن سلول کی قمیص لے کر انہیں پہنائی۔

قبیلہ بنی ہوازن کے چھ ہزار قیدیوں کو رسول کریمؐ نے کپڑے پہنا کر واپس کیا تھا

اسیران جنگ کی خدمات کا لحاظ

حالت اسیری میں جسمانی عقوبت سے زیادہ تکلیف دہ چیز جذبات کو صدمہ پہنچانا ہے۔ لیکن غالبًا کسی قوم نے قیدیوں کے جذبات کا لحاظ نہیں رکھا۔ صرف ایک اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس نے بدن کے ساتھ اسیران جنگ کی روح کو بھی آرام دیا۔

حالت قید کا وہ منظر نہایت دردانگیز ہوتا ہے۔ جب بیٹے کو باپ سے

بھائی کو بھائی سے۔ اور شوہر کو بیوی سے جدا کیا جاتا ہے۔ اسلام نے ہمیشہ قیدیوں کو ان کے اعزہ کے ساتھ رکھنے کا انتظام کیا۔ اور اس طرح ان کے اطمینان و تسکین کا سامان مہیا کیا۔ حضرت علیؓ نے ایک لونڈی کی لڑکی کو اس سے علحدہ کرنا چاہا لیکن حضرت رسول کریمؐ نے منع کر دیا۔

اسلام نے قیدیوں کے مذہبی جذبات اور عقائد سے تعرض نہیں کیا۔ مدینہ میں یہود کے مذہبی اثر نے اس قدر ترقی کی تھی۔ کہ اگر کسی عورت کے بچے زندہ نہیں رہتے تھے تو وہ یہ نذر مانتی تھی کہ اگر اس کا بچہ زندہ رہے گا تو وہ اسے یہود بنائے گی۔

جب آنحضرت نے یہودی قبیلہ بنی نضیر کو جلا وطن کیا تو ان میں اس کے بھی بہت سے بچے تھے۔ پس انصار نے ان کو روکنا چاہا۔ لیکن رسول کریم نے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔ قرآن کریم نے حکم دیا۔ لا اکراہ فی الدین دین میں زبردستی نہیں ہے۔

اسیران جنگ کا مبادلہ

حضرت رسول کریم نے قیدیوں کے ساتھ قیدیوں کا مبادلہ کیا۔ قبیلہ بنو فزارہ کی ایک نوعمر لڑکی گرفتار ہو کر ایک صحابی کے حصے میں آئی۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ اسے مجھے ہبہ کردو صحابی نے عرض کی کہ خدا کی قسم میں نے آجتک اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ کہکر رسولؐ کے حوالے کیا۔ آپ نے اس لڑکی کو اہل مکہ کے پاس واپس بھیجدیا۔ اور کفار مکہ نے اس کے مبادلہ میں کئی مسلمانوں کو آزاد کر دیا۔

سلطان کی معدلت گستری

سلطان کا درِ عدالت ہر امیر و غریب ادنیٰ و اعلیٰ کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ میزان عدالت میں شہزادہ اور رعایا کے عام افراد کا پلہ برابر رکھتا تھا۔ بیشمار روایات اس کی معدلت گستری کی کتب تواریخ میں منقول ہیں۔ جن میں سے ایک حسب ذیل ہے :۔

ایک غریب فریادی سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور تخلیہ کی درخواست کی۔ تخلیہ ہوا تو اس نے عرض کیا کہ حضور کے بھانجے[1] نے میرے ننگ و ناموس کو تاخت و تاراج کر دیا۔ اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ ہر چند میں نے حکام سے فریاد کی لیکن دادرسی سے محروم رہا۔ اب سلطان سے داد چاہتا ہوں۔ مظلوموں کی دادرسی آپ کا فرض ہے۔ ورنہ احکم الحاکمین کے دربار میں آپ کو

[1] یہ واقعہ تاریخ فرشتہ میں اس طرح مذکور ہے۔ دیگر مورخین نے بھی لکھا ہے انگریزی مورخ سرجان ملکم صاحب مولف تاریخ ایران نے بھی اسے نقل کیا ہے لیکن اس قدر اختلاف کے ساتھ۔ ان کا خیال ہے کہ سلطان کو زانی کے قتل سے قبل صرف اسقدر معلوم تھا کہ وہ شاہی خاندان کا کوئی فرد تو ضرور ہے۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اس کا خواہرزادہ ہے پھر بھی یہ واقعہ سلطان کی اعلیٰ معدلت گستری کی دلیل ہے ؂

جواب دہی کرنی پڑیگی۔

سلطان کو اس واقعہ کا نہایت افسوس ہوا۔ مظلوم کی تسلی وتشفی کی۔ اور کہا کہ اب تم اپنے گھر چلے جاؤ۔ اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ اور جب وہ چور تمہارے گھر پھر آسئے تو فوراً آکر مجھے اطلاع دینا!

مظلوم نے کہا کہ یہ بجا ارشاد ہوا لیکن اب پھر میرا حضور تک پہنچنا دشوار ہے چنانچہ برسوں کی تگ و دو کے بعد دربانوں اور پاسبانوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر خدا خدا کر کے آج حضور تک پہنچا ہوں۔ لیکن یہ سنکر سلطان نے اپنے تمام دربانوں اور پاسبانوں کو حکم دیا کہ یہ شخص جس وقت یہاں آئے آنے دو ہرگز نہ روکو۔ پھر اس مظلوم کو علیحدہ لے جاکر کہا کہ اگر تم آؤ اور درباری تمہارے سدراہ ہوں تو فلاں مکان پر آکر دستک دینا۔ یہ سن کر اور مطمئن ہوکر فریادی چلا گیا۔

دو تین روز بعد چور پھر آیا۔ مظلوم اطلاع دہی کے لئے چلا۔ دربان سدراہ ہوئے تو موعودہ مکان پر جاکر دستک دی۔ سلطان فوراً مسلح برآمد ہوا۔ اور مظلوم کے ہمراہ اس کے مکان پر پہنچا۔ چور موجود تھا۔ سلطان نے اندر جاکر سب سے پہلا کام یہ کیا۔ کہ شمع کو ٹھنڈا کردیا پھر تلوار کے ایک ہاتھ سے زانی کا سرتن سے جدا کر دیا۔ اور مظلوم سے پانی طلب کر کے پیا۔

غریب مظلوم سلطان کے قدموں پر گر پڑا۔ کہ آپ نے حق عدالت ادا

کیا۔ پھر اس نے شمع گل کرنے اور پانی پینے کا سبب دریافت کیا۔ سلطان نے کہا کہ:۔

"میں نے شمع اس لئے گل کی۔ کہ مبادا ظالم شہزادہ کی صورت دیکھکر تعلق عزیز داری میرا ہاتھ روکے۔ اور اس طرح استیصال ظلم میں رکاوٹ ہو۔ رہی پانی پینے کی وجہ۔ بات یہ ہے کہ جس روز سے مجھے اس واقعہ کا علم ہوا تھا۔ اس روز سے میں نے کھانا پینا اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ اور قسم کھائی تھی۔ کہ تمہاری فریادرسی کر کے ہی کچھ کھاؤں پیوں گا۔ اب الحمدللہ کہ میری آرزو پوری ہوئی۔ اور مجھے پیاس بھی شدت کی لگی ہوئی تھی، پس تم سے پانی طلب کر کے پیا"

سلطانی دعائیں اور اسکے نتائج

ہر آں کاریکہ گردد از دعائے محو جانا نے
نہ شمشیرے کند آں کار نے بازوئے لے یارانے

درگاہ خدائے مجیب الدعوات میں دعا کرنا اور اجابت کا یقین رکھنا اسلامی عقائد میں داخل ہے۔ قبولیت دعا کے بے شمار واقعات تاریخ اسلام میں مذکور ہیں۔ جن کی معقول تاویل مشکل ہے۔ لیکن اسلامی دعا اور غیر مسلم[1] لوگوں کی دعا میں فرق ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے مشکلات و مہمات سخت کے اکثر مواقع

[1] مسلمانوں کی دعا کا تعلق "ترک عمل" سے نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض نادان خیال کرتے ہیں۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ عمل کرو اور کامیابی کی دعا خدا سے مانگو، اس لئے کہ نتائج اسی کے قبضۂ اختیار میں ہیں، سلطان محمود یا اور کسی اسلامی مجاہد نے محض مسجد میں بیٹھکر دعا نہیں کی کہ اس کا نتیجہ نصرت تھی۔ بلکہ میدان میں نکل کر تلوار چلائی اور نصرت کی خدائے تعالیٰ سے توفیق چاہی۔ خود پیغمبر عربی اور صحابہ کرام کا یہی طرز عمل رہا۔ پھر اگر مسلمان اس کے خلاف عقائد رکھیں اور اپنی دعاؤں کو نامقبول ہونے کا الزام لگائیں تو یہ ان کا اپنا قصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے عقائد نے عالم اسلامی کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اسی کے قریب مسئلہ تقدیر ہے جسے اس صدی کے

پر دعائے نصرت کی۔ یہ ایسے نازک مواقع تھے کہ اسباب ظاہری نے گویا جواب دیدیا تھا۔ بظاہر کامیابی کی کوئی توقع نہیں رہی تھی لیکن بالآخر سلطان کی کامیابی ہوئی اور یہ تھا نتیجہ دعا۔ جس کی کوئی تاویل ممکن نہیں۔ بہر حال اس نے بیشمار نازک موقعوں پر دعا کی اور وہ مقبول ہوئی۔ ان میں سے چند واقعات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مہم ملتان (۱۰۰۵ء) کے سلسلے میں راجگان بھاتنہ اور اوچ سے محمودی فوج کا سخت مقابلہ ہوا۔ تین روز برابر جنگ قائم رہی۔ چوتھے روز محمودی لشکر میں آثار ہزیمت نظر آرہے تھے۔ سلطان نے دعا کی۔ فوراً رنگ بدل گیا۔ سلطان نے سجدہ سے سر اٹھایا تو دیکھا کہ بہادران غزنی دشمنوں کا تعاقب کر رہے ہیں۔ اوچ کا مضبوط قلعہ قبضہ میں آگیا۔ اور یہ محض دعا کا اثر تھا۔

(۲) ایبک خاں شاہ ترکستان نے بمعیت خاقان چین۔ لشکر جرار کے کر سلطانی علاقہ پر حملہ کیا۔ اس وقت سلطان ہندوستان میں تھا۔ فوراً واپس ہو کر دشمن سے سینہ سپر

(بقیہ صفحہ گزشتہ) مسلمانوں خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں نے غلط سمجھا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ عمل کرو اور نتائج کے لئے خدا تعالیٰ کی جناب میں دعا کرو۔ کہ اھدنا الصراط المستقیم الخ۔ غیر مسلموں کی دعائیں اور قسم کی ہیں اور اور معنی رکھتی ہیں مثلاً مسیحی دعا مانگتے ہیں کہ "اے خدا ہمیں آج شام کی روٹی۔ صبح ہی دے دے!" یہ عقائد مسلمانوں کے نہیں ہیں۔ جو مسلمان ایسا اعتقاد رکھیں۔ وہ خوفناک غلطی کرتے ہیں:۔

ہوا۔ طویل جنگ ہوئی۔ آخری مقابلے میں جب اُس نے اپنی فوج کو دبتے دیکھا اور اسے اندیشہ ہوا کہ خدانخواستہ کہیں شکست نہ ہوجائے تو فوراً دعا میں مصروف ہوا۔ بعد ازاں ہاتھی پر سوار ہوکر دشمن پر حملہ آور ہوا۔ سلطان کے ہاتھی کا پہلا کام یہ تھا کہ وہ ایبک خاں کے علمبردار پر جھپٹا۔ اور اسے سونڈ میں پکڑ کر اس زور سے پھینکا کہ علمبردار ایک طرف، اور علم دوسری طرف۔ بہت دور فاصلے پر جاکر پڑے دیکھتے ہی دیکھتے میدان کا رنگ بدل گیا۔ خوفناک دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ یہ صرف دعا کا اثر تھا۔

(۳) راجہ انندپال (پسر جے پال) بہ سلسلہ حملہ پنجم محمودی۔ اور غزنویوں کا مقابلہ نہایت مشہور معرکہ ہے۔ اس وقت اہل ہند نے کامل قوم پرستی اور حب الوطنی کا ثبوت دیا تھا۔ عورت مرد سب کے دل جوش سے پُر تھے۔ عورتوں نے اپنے زیور سے، اپنی پسائی کتائی کی مزدوری سے جنگ میں چندہ دیا تھا۔ اور اپنے جوان عزیزوں کو شمولیت جنگ کے لئے بھیجا تھا۔ ہندوستان کے بہت سے راجہ انندپال کی پشت پر موجود تھے۔ ہندوستانی فوجوں کی کثیر تعداد کے مقابلہ میں غزنوی فوج کی تعداد کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ مقابلہ شروع ہوا تو تھوڑی دیر بعد تیس ہزار دشمن دفعتاً پیچھے سے سلطانی لشکرگاہ میں گھس آئے اور ایک قیامت برپا کردی اس وقت بظاہر کوئی انسانی طاقت اور کوئی مادی تدبیر کارآمد نہیں ہوسکتی تھی۔ سلطان نے اسلحہ دعا استعمال کیا۔ ابھی وہ دعا سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ دفعتاً راجہ انندپال

کا ہاتھی بگڑ کر کھڑا ہوا اور پیچھے کو بھاگا۔ ہندو اسے اپنے سپہ سالار کی فراری سمجھے اور وہ بھی بھاگ نکلے۔ اس طرح میدان کا رنگ بدل گیا۔ لشکر اسلام کی یقینی شکست "فتح مبین" سے بدل گئی۔

(۴) سلطان نے اپنے دوست راجہ قنوج کا انتقام لینے کے لئے جب کالنجر پر چڑھائی کی تو وہاں کا راجہ نندا اسی ہزار سے اوپر فوج اور ساڑھے چھ سو ہاتھی لے کر مقابلہ کو نکلا۔ سلطان کو ایسے سخت مقابلہ کی امید نہ تھی۔ سلطان غازی نے درگاہ رب العزت میں دعا کی کہ "الٰہی عزت دولت تیرے ہی ہاتھ ہے۔" صبح کو مقابلہ ہونے والا تھا۔ لیکن صبح کو غزنوی بہادروں نے اٹھ کر دیکھا تو دشمنوں کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ وہ خائف ہو کر بھاگ گئے تھے۔ اور ایسے بے حواس ہو کر بھاگے تھے کہ اپنا تمام سامان بھی چھوڑ گئے تھے۔ یہ سب سلطان کے ہاتھ آیا۔ ان میں سے چھ سو کے قریب تو ہاتھی تھے۔ الغرض دعا کے زور سے یہ ہزیمت بھی نصرت سے بدل گئی۔ واللہ علیٰ کل شئ قدیر
یہ بھی دعا کا ایک کرشمہ تھا۔

(۵) مہم گجرات (سومنات) نے طول کھینچا۔ ہندو راجا چاروں طرف سے آپڑے محمودی بہادروں کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ اس وقت سلطان نے گھوڑے سے اتر کر زمین پر سجدہ کیا اور جناب الٰہی میں دعائے نصرت کی۔ پھر جانبازانہ حملہ کیا۔ فوراً خدا کی مدد طوفان باد و برق کی صورت میں نمودار ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دشمنوں

کی ٹڈی دل فوج میں بھاگڑ مچ گئی۔ غزنویوں نے تعاقب کیا۔ پھر پلٹ کر قلعہ پر حملہ کیا چشم زدن میں اُسے تسخیر کر لیا۔ اور سومنات جی کے مندر تک جا پہنچے۔ یہ بھی دعا کا اثر تھا۔

(۶) بوقت واپسی سومنات سلطان نے ایک مقامی ہندو رہبر ساتھ لیا کہ وہ قریب اور سہل رستے سے ریگستان سندھ سے گزار دے۔ لیکن وہ لشکر محمود کو ایک بے آب وگیاہ بیابان میں لے گیا۔ لشکر میں حشر برپا ہو گیا۔ آدمی اونٹ گھوڑے شدت پیاس سے تڑپنے اور بکثرت نذر اجل ہونے لگے۔ سلطان نے رہبر سے پوچھا کہ اچھی رہبری کی؟ اس نے کہا کہ میں مہاراج سومنات جی کا ایک غلام اور فدائی ہوں۔ میں تم لوگوں کو دانستہ ایسی جگہ لایا ہوں کہ سب لشکر ہلاک ہو جائیگا۔ اور ایک متنفس بھی باقی نہ رہے گا۔ پانی کا یہاں کوسوں نشان نہیں۔ کئی روز تک نہ ملیگا"

سلطان نے لشکر گاہ سے علیحدہ جا کر نہایت گریہ وزاری اور خضوع و خشوع کے ساتھ دعا مانگی۔ متواتر ایک پہر تک زمین بوس رہا۔ حتیٰ کہ شمال کی جانب سے ایک روشنی نمودار ہوئی۔ سلطان نے اسی جانب لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔ صبح سے پیشتر ہی چشمۂ آب مل گیا۔ تمام لشکر سیراب ہوا۔ اور دعائے سلطانی نے ہزاروں لاکھوں جانداروں کو موت کے مُنہ سے بچا لیا۔

دینی اور علمی خدمات

سلطان محمود غزنوی ہی وہ پہلا سلطان ہے کہ جس نے ہندوستان میں اشاعت اسلام کے لئے زمین طیار کی۔ اس میں شک نہیں کہ قبل ازیں عراب سندھ تک آئے۔ لیکن زمانہ مابعد میں ان کا اثر زائل ہوگیا۔ بقول الفنسٹن صاحب سلطان نے "کسی ہندو کو مذہب کے لئے قتل نہیں کیا"۔ لیکن اشاعت اسلام کے لئے کوشش بلیغ کی۔ اس نے حسب اصول اسلام ہندوستان ہو یا کوئی اور ملک غیر مسلموں کے سامنے اسلام، جزیہ اور پھر تلوار پیش کی۔ ہندوستان میں بالعموم آخری چیز کو قبول کیا گیا۔ اس کے بعد جزیہ کا نمبر تھا۔ صرف اہل کشمیر نے اسلام کو قبول کیا۔ باقی متفرق طریق پر جا بجا اہل ہند زیر سایہ اسلام آئے۔ لیکن یہ فوجی حیثیت نہ تھی۔ داخل اسلام ہونے والے غیر مسلموں سے تالیف قلوب کا سلوک کیا گیا اور یہ آج بھی جرم نہیں ہے۔ خواہ اسے مذہب کہو یا سیاست۔

سلطان نے جا بجا مفتوحہ علاقوں میں مساجد تعمیر کرائیں اور نومسلموں کی تعلیم دین اور استقامت کی غرض سے واعظ، مناد، معلم، مشنری، مبلغ اور موذن مقرر کئے۔

صوفیائے کرام کے ذریعے سے بھی ہندوستان میں اشاعت اسلام ہوئی لیکن

عہدِ محمودی کے قبل یہ لوگ بُت کدۂ ہند میں قدم نہیں رکھ سکتے اور تبلیغ دین نہیں کر سکتے تھے۔ اب اقبال محمودی نے راستہ صاف کر دیا تھا۔ یہ طبقہ اپنے اخلاقی و روحانی اثرات سے نہایت خاموش طریق پر اشاعت اسلام میں مصروف تھا۔ اور اب اہل ہندان کے کام میں رُکاوٹ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

آج ہندوستان کے چپّے چپّے پر عظیم الشان مساجد شوکت اسلام کا سکہ دلوں پر بٹھا رہی ہیں۔ لو کروڑ مسلمان بُت کدۂ ہند میں موجود ہیں۔ کیا یہ سلطان محمود کی مجاہدانہ پیش قدمی کے نشانات نہیں ہیں؟"

امداد حجاج

بدو عرب ابتدا ہی سے حجاج کو ستاتے رہے ہیں۔ چوتھی صدی ہجری میں توان لوگوں نیز قرامطہ نے الیسا زور پکڑا کہ راستہ ہی بند کر دیا۔ اور سب مسلمان ان کے قتل و غارت کے خوف سے فضیلت حج سے محروم ہو گئے۔ ۴۱۲ھ میں علماء و فضلا کی ایک جماعت سلطان محمود کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور صورت واقعہ بیان کر کے طالب امداد ہوئی۔ علما نے کہا۔ کہ حجاج کی امداد کرنا سلطان کا مذہبی فرض ہے۔ اس لئے کہ خلیفہ بغداد اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ حجاج کی امداد کر سکے۔

سلطان نے فوراً اپنے قاضی القضاۃ ابو محمد ناصحی کو حکم دیا کہ وہ حج کو جائیں اور چیدہ فوج اپنے ہمراہ لے جائیں۔ لوگ کئی سال سے حج کو نہ جا سکے تھے اس لئے ہر خاص و عام نے کمر باندھی۔ عظیم الشان قافلہ طیار ہو گیا۔ قاضی القضاۃ

امیر حاج مقرر ہوئے سلطان نے تیس ہزار دینار سرخ انہیں عطا کئے۔

یہ قافلہ منزل بمنزل عرب جا پہنچا۔ مقام فید پہنچنے پر بدوؤں کو مزاحم ہوئے۔ امیر قافلہ ان کو پانچہزار دینار دینے لگا۔ لیکن وہ راضی نہ ہوئے اور حجاج پر حملہ آور ہوئے۔

حاجی بیسویں صدی کے حاجی نہ تھے۔ بلکہ محمودی زمانے کے حاجی تھے وہ لوگ اکثر معرکوں میں امتحان شجاعت دے چکے تھے۔ سلطانی قدر انداز بطور محافظ قافلہ کے ہمراہ تھے۔

مقابلہ شروع ہوا۔ دونوں جانب سے بہادری کا اظہار کیا گیا۔ اسی اثنا میں ایک ترکی غلام نے جو مشہور رفادر انداز تھا چلہ میں ایک تیر چڑھایا۔ اور تاک کر امیر درفال کے لگایا جس کے لگتے ہی وہ پشت زین سے فرش زمین پر آرہا۔ یہ حال دیکھکر اس کے رفقاء ڈر کر سر پر پاؤں رکھکر جان بچی لاکھوں پائے کہتے ہوتے بھاگے

الغرض اس سال بڑی آرزوؤں کے بعد مسلمانوں نے حج کیا اور خانۂ کعبہ میں سلطان محمود کی ترقی اقبال اور عزت اسلام کے لئے دعا کی ؛

بزرگوں سے عقیدتمندی

سلطان محمود غزنوی کے عہد میں خراسان کے اندر شیخ ابوالحسن خرقانی ایک بزرگ تھے۔ سلطان نے خاص انہیں کی ملاقات کے لئے غزنی سے خراسان کا سفر اختیار کیا۔ چنانچہ وہ کوچ و مقام کرتا ہوا خرقان جا پہنچا۔ اور شیخ صاحب کو ملاقات کے لئے اپنی فرودگاہ پر طلب کیا۔ سلطان نے ان کے پاس جو پیغام بھیجا تھا۔ وہ نہایت معنی خیز تھا۔ کہا کہ، اگر آپ میری فرودگاہ تک تشریف لائیں تو "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول والوالامر منکم" کی فضیلت حاصل ہو۔

مطالبہ نہایت زبردست تھا۔ لیکن شیخ کا جواب اس سے بھی زیادہ قوی اور معنی خیز تھا۔ آپ نے فرمایا کہ :- "اطیعوا اللہ میں اس قدر منہمک ہوں کہ اطیعوا الرسول ہی سے نادم ہو رہا ہوں، پھر اولوالامر منکم" یعنی چہ ؟"

اس جواب سے سلطان نہایت متاثر ہوا۔ اور بے اختیار اس کے آنسو نکل پڑے۔ آخر سلطان خود شیخ کے در دولت پر حاضر ہوا۔ اور شرف نیاز حاصل کیا، پھر گفتگو شروع ہوئی۔ سلطان نے کہا، کہ بایزید بسطامیؒ کا کوئی قول ارشاد ہو۔ شیخ نے فرمایا کہ" بایزید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس نے مجھے دیکھا بیم

شقاوت سے امین ہوا" سلطان نے معترضانہ لہجہ میں کہا کہ "ابوجہل اور ابوسفیان تو عرصہ تک رسول کریم کو دیکھتے رہے۔ مگر سعید نہ ہوئے۔ پھر بایزید کا یہ دعویٰ کس قدر وزندار ہے؟"

شیخ نے یہ سن کر کسی قدر تلخی سے کہا، "محمود! ادب ملحوظ رکھ" [۱]

ان مسائل میں ہے کچھ ژرف نگاہی درکار　　یہ حقائق ہیں، تماشائے لب بام نہیں!
غور کرنے کے لئے فکر و تعمق ہے ضرور　　منزل خاص ہے، یہ رہگذر عام نہیں!

پیغمبر کی شان کو اصلی رنگ میں سوائے صحابائے کرام کے اور کس نے دیکھا؟ ارشاد خداوندی ہوتا ہے کہ "تراھم ینظرون الیک وھم لا یبصرون"

یہ سن کر سلطان خاموش ہو رہا۔ پھر شیخ سے عقیدتمندانہ نصائح طلب کیں۔ آپ نے فرمایا کہ نماز باجماعت ادا کیا کرو۔ پرہیزگاری، سخاوت اور شفقت اختیار کرو۔ یعنی حق اللہ وحق العباد کی کسی شق کو نظر انداز نہ ہونے دو۔

[۱] مورخ فرشتہ نے "تاریخ بناسے گیتی" کی بناپر سلطان کے امتحان اور شیخ کی کشف وکرامات کا بھی ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے کہ خود سلطان، ایاز کے لباس میں اور ایاز سلطان کے لباس میں شیخ کے پاس گیا۔ دس کنیزکیں غلاموں کے لباس میں اور دس غلام لونڈیوں کی شکل میں اس کے ہمراہ تھے۔ شیخ نے ان سب کو پہچان لیا۔ مصنوعی سلطان کی تعظیم نہ کی۔ بلکہ ظاہری ایاز کی جانب متوجہ رہا۔

سلطان نے آرزو سے دعا کی۔ شیخ نے فرمایا۔ کہ میں ہر نماز میں :-
"اللّٰھم اغفر للمومنین والمومنات" کی دعا مانگتا ہوں سلطان
نے کہا یہ عام ہے میں خاص چاہتا ہوں۔ فرمایا "الہٰی عاقبت محمود گرداں!"
سلطان نے اشرفیوں کی ایک تھیلی پیش کی۔ شیخ نے نان جویں دیکر فرمایا کہ
کھاؤ۔ سلطان ایک دو لقمے کھا کر رہ گیا۔ فرمایا کہ کھاتے کیوں نہیں۔ کہا کہ حلق میں اٹکتی
ہے۔ ارشاد ہوا کہ اسی طرح تمہارا یہ بدرۂ زر میرے گلے میں پھنستا ہے۔ اسے
اٹھا کر لے جاؤ۔

سلطان نے تبرکاً نشانی طلب کی۔ آپ نے اپنا خرقہ مرحمت فرمایا۔ وقت
رخصت شیخ تعظیماً کھڑے ہوئے۔ سلطان نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ
جب تم آئے تھے تو اس وقت شاہانہ تکبر اور آرزو سے امتحان درویش تمہارے
دماغ میں تھی۔ لیکن اب انکسار و عقیدت درویشی ہے۔ اور یہی چیز قابل تعظیم ہے"
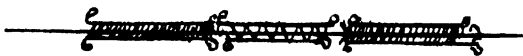
مسجد جامع دار العلوم

مسجد عروس الفلک

بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے شہر متھرا کی خوبصورت اور سنگین عمارات نے سلطان کے دل پر خاص اثر کیا۔ اور اس وقت اس نے غزنی میں اعلیٰ عمارتیں بنانے کا عزم کیا چنانچہ اس سفر سے واپسی کے وقت اس نے غزنی میں ایک سرفلک جامع مسجد بنائے جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ اس مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ سنگ سرخ اور سنگ رخام بالخصوص اس میں صرف کیا گیا۔ چنانچہ ان پتھروں کے مثمن، مسدس مربع اور مدور وضع کے ٹکڑے نہایت خوشنمائی اور موزونیت سے مسجد کے درودیوار اور محرابوں میں لگائے گئے۔ پچی کاری اور منبت کاری رشک نگار خانہ چین تھی۔ اس مسجد کے نقش و نگار اور نقاشی کو دیکھکر دیکھنے والے نقش حیرت بن جاتے۔ اور اس کی استواری اور فلک شکوہی کو دیکھکر زبان سے بے اختیار الغلۃ للّٰہ نکل جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس عالیشان جامع نے زمانہ سے عروس الفلک کا خطاب حاصل کیا۔ بعد تکمیل تعمیر جب اسے فرش و فروش اور سامان روشنی و دیگر سامان آرائش سے آراستہ کیا گیا تو وہ تمام ایشیا میں اپنی نظیر آپ نظر آئی۔ اس وقت دمشق کی جامع جسے خلیفہ ولید نے تعمیر کرایا تھا۔ اپنی شان و شوکت میں زبان زد خلائق تھی۔ لیکن جق

یہ ہے۔ کہ عروس الفلک کے سامنے اس کی شہرت بھی ماند پڑ گئی تھی ‌٭

سلطانی عمارات

سلطان نے جامع کے علاوہ اور بیشمار عمارات محلات وغیرہ غزنی میں طیار کرائے۔ جن کی شان و شوکت آسمان پر انگشت نمائی کرتی تھیں۔ غزنی کے دامن کوہ میں ایک محل بنایا۔ سامنے باغ لگایا۔ اور اونچے سرچشمہ سے کاٹ کر بیچ میں نہر لایا۔ اس کی تعریف میں درباری شاعر "فرخی" نے ایک طویل قصیدہ لکھا۔ جو کسی اور محل پر نقل کیا جائے گا۔ اس کا مطلع ہے سہ

بہ فرخندہ فال و بہ فرخندہ اختر — بہ نو باغ مے خواست شاہ مظفر

دار العلوم

دار العلوم (کالج) کی عظیم الشان عمارت مسجد کے قریب ہی نہایت اہتمام و انہماک کے ساتھ سلطان نے طیار کرائی۔ اور جب تکمیل کو پہنچی تو چیدہ علما و فضلا اس میں استاد اور لکچرار مقرر کئے یہ ایشیا کے منتخب کملا و فضلا میں سے تھے۔ طلبا کو علوم معقول و منقول کی تعلیم دیتے تھے۔ ان لوگوں کو بیش بہا تنخواہ سلطانی خزانہ سے دی جاتی تھی۔ کالج کے متعلق ایک عظیم الشان دار الکتب (لائبریری) بھی تھی۔ جس میں نادر و نایاب کتب بصرف کثیر مہیا کی گئی تھیں۔ اس دار العلوم کے طلبا سے فیس وغیرہ بالکل نہیں لی جاتی تھی۔ بلکہ مسافر اور غیر مستطیع طلبا کو سامان تعلیم۔ خوراک۔ وظائف۔ کتب وغیرہ بھی دیا جاتا

سہ سخندان پارس (آزاد)

تھا۔ شائقین علم کے لئے سہولتیں مہیا کی گئی تھیں۔ طلبا دور دور سے آکر یہاں علمی پیاس بجھاتے تھے۔ کالج کے تمام مصارف سلطانی خزانہ سے ادا کئے جاتے تھے اور اس کی صورت یہ تھی کہ ایک نہایت وسیع علاقہ بطور معافی کالج کے لئے وقف تھا۔ یہ کالج اپنی شان وشوکت اور علمی فیوض کے لحاظ سے کم ازکم ایشیاء میں اپنی نظیر آپ تھا۔

سلطانی تقلید سے اُمراء اور شہزادگان کو بھی علمی و دینی سرپرستی کی ترغیب وتحریص ہوتی۔ ان لوگوں نے مدارس وخانقاہ تعمیر کرائے ان میں علما و مدرس درس اور پند و نصائح کے لئے مقرر کئے۔

غزنی کے علاوہ افغانستان اور ممالک محروسہ کے دیگر شہروں اور مضافات میں بیشمار فقیہہ۔ مفسر۔ محدث لوگوں کو دینی و دنیوی تعلیم دیتے تھے اور اشاعت اسلام میں مصروف تھے۔ اور یہ سب درسگاہیں سلطانی سرپرستی سے شائقین علوم کی آتش شوق بجھا رہی تھیں۔

خانقاہوں میں صوفی الگ بیٹھے ہوتے اپنے اخلاقی اور روحانی تصرف سے نہایت خاموشی سے خدمات دینی اور اشاعت اسلام میں مصروف تھے۔ اور سلطان ان کی بھی کم وبیش خدمت کرتا تھا۔ سلطان کے علاوہ امراء اور رؤسا بھی ان لوگوں کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ اور اس طرح آئے دن نئی نئی خانقاہیں (ڈیوینٹی کالج) کھل رہی تھیں۔

پارسی زبان کی سرپرستی

فارسی زبان نہایت قدیم زبان ہے۔ لیکن اس نے بھی مثل دیگر زبانوں کے کچھ کم انقلاب نہیں دیکھے۔ اعراب کے ایران پر قابض ومتصرف ہونے سے پیشتر بھی اس میں وقتاً فوقتاً تغیرات ہوتے رہے۔ جس کی تاریخ کو دہرانا طوالت سے خالی نہیں۔ پھر اسلام کے سرزمین ایران پر قدم رکھنے کے بعد بھی اس میں تغیر وتبدل ہوتا رہا۔

قدیم ایرانی زبانیں ژند۔ پاژند اور استا ہیں۔ لیکن یہ مٹ چکیں اور ان کی قائم مقام موجودہ فارسی زبان ہے۔ بقول پروفیسر آزاد اگرچہ ایرانیوں کی گھر کی سلطنت تھی۔ مگر ان میں رسوم ورواج کے بند کسے ہوئے نہ تھے۔ اس لئے ہر ایک زمانہ میں مذہبوں کے اختلاط اور ملکوں کی آمد ورفت زبان پر معمولی اثر کرتی رہی۔ یونانیوں کا طوفان گزرا۔ پارتھیا والوں کی زبان نے اسے برباد کیا سینکڑوں برس کے بعد ساسانی خاندان کے اثر سے پھر ایرانی زبان کی بوسیدہ ہڈیوں میں جان پڑی پس اس طرح جو زبان بنی وہ ایران کی ملکی وفوجی زبان سمجھی گئی۔ اور موجودہ فارسی کی اصل یہی ہے۔

۶۹۰ء میں ایران پر آفتاب اسلام نے شعاعیں ڈالیں۔ یہ خسرو پرویز کا

عہد تھا۔ اس وقت ساسان پنجم نے دساتیر کو ترتیب دیا۔ فقرہ بہ فقرہ فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہی زبان ملکی یعنی فارسی زبان کہلائی۔ اور اس نے بھی زمانۂ مابعد میں عجیب وغریب انقلاب دیکھے۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن فاتح نے ملک کے علاوہ تحریر وتقریر پر بھی قبضہ کر لیا۔ تقریباً تین سو برس تک فارسی موت کی نیند سوتی رہی۔ اس کے بعد انقلاب خوشگوار واقع ہوا۔ پروفیسر آزاد لکھتے ہیں کہ:۔

"دوسری صدی ہجری سے عباسیہ دور دورہ تھا۔ کہ عیاشی نے خلافت کو سلطنت بنایا۔ اور غفلت نے سلطنت کو ضعیف کرنا شروع کیا۔ دربار میں رنگ رنگ کے مصاحب۔ محلوں میں قوم قوم کی عورتیں بھر گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مملکت میں ایک ایک ہمت والا خودسری کی تلوار باندھ کر بادشاہ بن بیٹھا۔ خلفا فقط دارالسلام بغداد میں تبرک بن کر رہ گئے۔ لیکن قرابت نبوی کا نام دربیان تھا۔ اس لئے اس حالت مذکورہ نے طول کھینچا۔"

سامانیوں نے ماوراءالنہر میں سلطنت قائم کی۔ امیر اسمٰعیل سامانی نے ترکستان اصفہان اور خراسان پر قبضہ کیا۔ جب تک یہاں عربوں کی حکومت رہی۔ عربی زبان بھی فارسی کو دباتے رہی۔ اب حکمران ایرانی النسل تھا یعنی بہرام چوبیں کی اولاد۔ اس لئے اب عربی زبان کا پہلا سا اثر نہ رہا۔ ۳۴۲ھ میں تمام دفاتر عربی سے فارسی میں تبدیل ہو گئے اور ۳۵۰ھ میں عربی تاریخ طبری کا فارسی ترجمہ ہوا۔ رودکی شاعر

نے فارسی زبان میں نغمہ سنجی شروع کی۔ اور اسی اثنا میں دولت غزنویہ کا دور دور ہوگیا۔ عربی کو ایران سے خارج کرکے فارسی کے قائم ہوجانے کے بہت سے اسباب ہیں۔

(۱) عربوں کی حکومت ایران میں قائم ہوئی۔ تو چونکہ ملازمت پیشہ و اہل قلم ایرانی ہی تھے۔ لہٰذا انھوں نے عربی سیکھکر دربار میں رسوخ پیدا کیا۔ اگرچہ انھوں نے عربی زبان سیکھی لیکن ان کا میلان شروع ہی سے یہ تھا کہ عام کاروبار سلطنت ان کی اپنی ہی زبان میں ہو۔ اور بالآخر ان ہی کی کوشش سے یہ انقلاب ہوا۔

(۲) ایرانی۔ خراسانی اور ایران کے دیگر نواح کے علما کا میلان اسی زبان کی جانب تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے فارسی زبان ہی میں سلسلہ تصنیف و تالیف شروع کیا۔

(۳) خاندان سامان۔ سلطان محمود کا میلان بھی فارسی زبان کی جانب تھا اور وہ اسی زبان کا نکتہ سنج تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے۔ کہ وہ ایرانی الاصل تھے۔ عربی خون ان کی رگوں میں نہ تھا۔ مذہب دوسری چیز ہے۔

(۴) ابوالعباس فضل بن احمد وزیر نے دولت غزنویہ کے دو حکمرانوں سبکتگین اور سلطان محمود کے زمانے پائے۔ زمانۂ ماقبل میں اس وزیر کا تعلق دولت سامانیہ کے ساتھ تھا۔ یہ شخص عربی کا فاضل نہ تھا۔ حتیٰ کہ سلطانی احکام عربی میں قلمبند نہ کرسکتا تھا۔ اس لئے اس نے عربی کے بجائے فارسی میں شاہی احکام لکھنے شروع

کیئے۔ اور روز بروز تمام دفتر ہی فارسی ہوگیا۔ فارسی ہی سرکاری زبان قرار پائی۔

سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں فارسی نے غیر معمولی ترقی کی۔ حتیٰ کہ وہ عام اور ہر دلعزیز زبان بن گئی پھر وزیر ابوالعباس کی کوششیں سونے پر سہاگہ بن گئیں۔ عربی موقوف۔ فارسی اس کی جانشین بنی۔ تمام شاہی دفاتر فارسی کے قالب میں ڈھل گئے۔ اور چونکہ ترکوں اور افغانوں کے لئے بہ نسبت عربی کے یہ زبان سہل تھی اس لئے ان لوگوں نے اس انقلاب کی بالکل مخالفت نہ کی۔ اور ایرانیوں کی بھی گویا منہ مانگی مراد ملی۔ علمی اداروں اور دربار شاہی پر یہی لوگ قابض تھے

چند روز پہلے دربار میں رسوخ و عزت بلکہ ملازمت حاصل کرنے کے لئے ضرورت تھی کہ عربی زبان آتی ہو۔ لیکن جب فارسی کا دور دورہ ہوا تو یہ خیال نسیاً منسیاً ہوگیا۔ زمانہ مابعد میں ایسا انقلاب نظر آتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ ان فارسی تصانیف پر نظر ڈالو جو فتح ایران کے زمانے سے لیکر عروج غزنویہ تک مدون ہوئیں۔ تم دیکھو گے۔ کہ عربی الفاظ نہیں۔ عربی محاورات بھی فارسی کو دبائے ہوئے ہیں۔ کہنے کو فارسی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس زبان کے پتلے میں آدھی سے زیادہ عربی مٹی لگی ہوئی ہے۔ اس کے بعد شاہنامہ کی تدوین کا زمانہ ہے۔ کہ اس کی زبان کو عربی سے پاک خالص فارسی بنانیکی کوشش لیگئی ہے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں کوئی عربی لفظ نہیں آیا۔ گو یہ صحیح نہیں۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بہت کم الفاظ عربی نے شاہنامہ کے دامن میں جگہ پائی ہے۔

وزیر ابوالعباس معزول ہوا تو اس کا جانشین خواجہ احمد بن حسن میمندی ہوا۔ یہ سلطان کا برادر رضاعی نیز ہم سبق تھا۔ یہ عربی کا فاضل تھا۔ اس لئے اس نے پھر عربی کی ترویج کی کوشش کی۔ لیکن یہ ایسی بارآور نہیں ہوئی۔ کیونکہ فارسی عوام کے لئے آسان تھی بہ نسبت عربی کے۔ اور کار دبار سلطنت تمام کا تمام ایرانیوں کے ہاتھ میں تھا۔ محمود کی آنکھیں بند ہوتے ہی عربی خارج اور نظم ونثر فارسی شاہی دربار میں داخل ہوئی۔

بایں ہمہ فارسی روز بروز وسعت پذیر ہوتی گئی۔ اسی زبان میں تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا۔ تاریخ طبری کے علاوہ ایک اور تاریخ فارسی میں لکھی گئی۔ پھر تاریخ بیہقی تصنیف ہوئی۔ جس میں خاندان غزنویہ کے حالات بہ تفصیل مذکور ہیں۔ شاہنامہ فردوسی بھی اسی زمانہ کی یادگار ہے۔

زمانہ محمودی میں عنصری۔ عسجدی۔ فرخی۔ فردوسی وغیرہ فارسی میں اعلیٰ پایہ کے شاعر ہوئے۔ سلطان محمود کا مولد زابلستان تھا۔ اسی نسبت سے وہ شاہ زابلستان کے نام سے مشہور ہے۔ گویا وہ ایرانی الاصل تھا۔ قومیت کے خیال سے فارسی کی حمایت پر اسے تحسین کہی جا سکتی ہے لیکن اسلامی نقطہ خیال سے اس کی یہ سعی مشکور نہیں کہی جا سکتی۔

عربی سے دور ہو کر مسلمانوں نے بہت نقصان اٹھایا۔ زبان کو انھوں نے نہیں چھوڑا گویا دین اسلام سے منہ موڑا۔ ہندوستان ہی میں دیکھ لو۔ عربی سے اجتناب کی بدولت ہمارا کیا حال ہے۔ نماز اور قرآن پڑھتے ہیں تو مثل طوطے اور مینا کے۔ تدبر کرنا اور احکام اخذ کرنا تو اور بات ہے۔
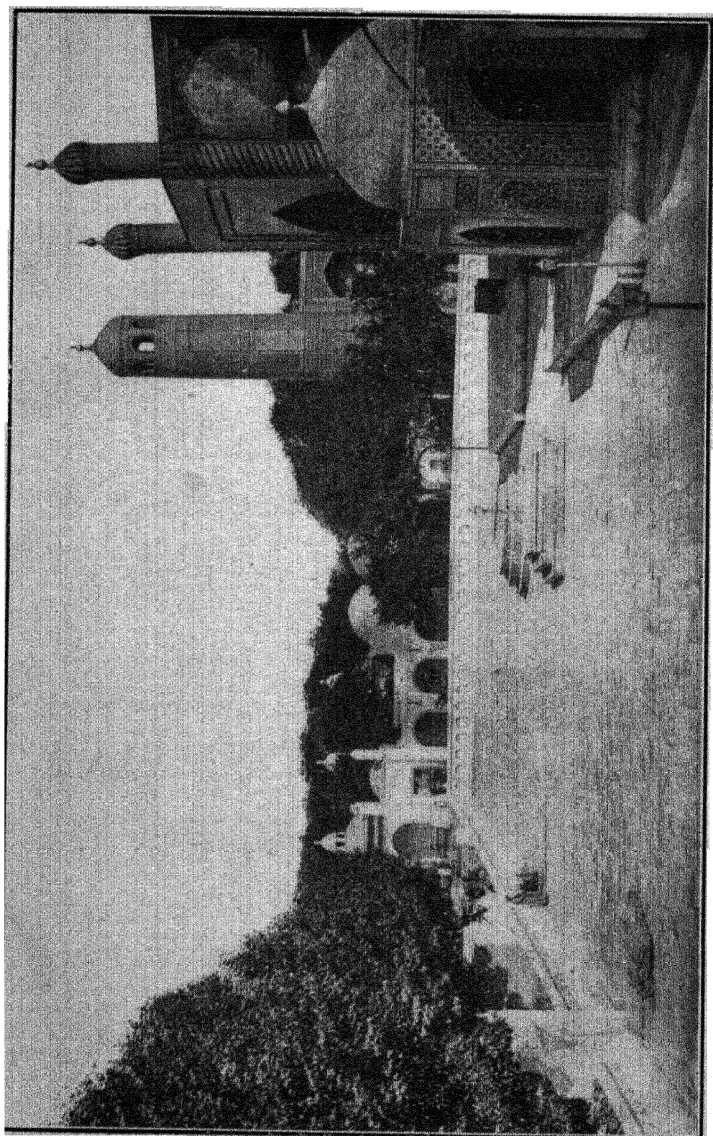
سلطانی دربار کے شعرا

سلطان محمود غزنوی کا دربار علما و فضلا۔ حکما اور شعرا سے پُر تھا۔ اہل علم کی طبائع زیادہ تر شاعری ہی کی جانب مائل تھیں۔ چنانچہ دربار محمودی میں چار سو سے کم شاعر نہ تھے۔ ہم بعض سربرآوردہ شعرا کا تذکرہ مجملاً قلمبند کریں گے۔

(۱) حکیم عنصری

دربار[1] محمودی کا ملک الشعرا تھا۔ اس نے امیر سبکتگین کا زمانہ بھی دیکھا تھا۔ امیر الامرائی اور مصاحبت خاص کے مناصب جلیلہ بھی اسے حاصل تھے۔ کم و بیش چار سو ہمعصر سخن سنج اُسے استاد مانتے تھے۔ حتیٰ کہ منوچہری نے بھی جو خود استاد ہے اپنے قصائد میں اس کے شاگرد ہونے کا اشارہ کیا ہے۔ تیس ہزار اشعار اس کی یادگار بتائے جاتے ہیں۔ لیکن اب ایران میں بھی تین ہزار سے زیادہ نہیں ملتے۔ بقول شمس العلما آزاد اس نے زبان میں ایسی اصلاح کی ہے۔ کہ اپنی نظم کو دو سو برس آگے بڑھا کر طبقۂ دوم کے شاعروں سے ملا دیا ہے

"تمام دیوان اس کا معمولی قصیدے ہیں۔ ملک کی جغرافی حالت لے کے بہاریہ اور عاشقانہ تمہیدیں لکھی ہیں۔ اکثر تیس چالیس اور پچاس شعر کی تمہید اخیر میں سلطان محمود کی مدح یا مسعود کی تعریف۔ یا بعض فتوحات کی تہنیت۔ بلکہ

[1] استفادہ از سخندان پارس شمس العلما مولانا آزاد مرحوم

آخیر میں ایک دو شعر ممدوح کے نام سے "

قصیدہ بہ تقریب جشن سدہ

سدہ[1] جشن ملوک نامدار است | از افریدون واز جم یادگار است
زمیں امشب تو گوئی کوہ طور است | کز و نور تجلی آشکار است
گر از فعل زمستانست بہمن | چرا امشب جہاں چوں لالہ زار است
ہمے ہر موج دریا را بہ ... سوزد | بداں ماند کہ خشم شہریار است

قصیدہ مدحیہ محمود سبکتگین

عنود استند بر ماہ منور | خط و زلفیں آں بروئے دلبر
یکے را سنبل نورستہ بالیں | یکے را لالۂ خود روئے بستر
بروئے وموئے او بنگر کہ بینی | بلے آذر بہر دو آں را فعل آذر
یکے بے دود سالۂ ماہ تیرہ | یکے بے نور روز و شب منور
مرا بہرہ دو چیز آمد زگیتی | دل پاک و زبان مدح گستر
یکے بہر جانان وقف کردم | یکے بر مدح شاہنشاہ کشور
مبارک دست او دوگونہ ابر است | کشد دشمنان تو دوست پرور

[1] یہ ایران کی مذہبی رسم تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک مسلمانوں میں اس کا رواج تھا۔

یکے با تیغ و بارانش ہمہ خون　　یکے با بذل و بارانش ہمہ زر
بروز رزم او بسیار بینی　　گو لشکر شکار و گرد صف در
یکے را زخم تیرش کردہ بے جاں　　یکے را زخم تیغش کردہ بے سر
یکے جیحون خوں راند بہ صحرا　　یکے ہاموں کند سد سکندر

ایک بار سلطان نے فصد کھلوائی۔ عنصری نے کھڑے کھڑے فی البدیہہ قطعہ ذیل موزوں کر کے سنا دیا ؎

آمد آں رگ زنِ مسیح پرست　　نیش الماس گوں گرفتہ بدست
طشت زریں و آبدستاں خورست　　بازوئے شہریار را بر بست
نیش بگرفت و گفت عزّ علیک　　ایں چنیں دست را کہ یارد خست
سرخرو برود بوسہ بر داد　　در سمن شاخ ارغواں بر جست

منوچہری بلخی
سنہ ۴۳۱ھ

منوچہری دامغانی (بلخ) دربار محمودی کا دوسرے درجہ کا شاعر تھا۔ عنصری کے بعد اسی کا نمبر آتا تھا۔ امارت و مصاحبت کے اعزاز اُسے بھی حاصل تھے۔ اس کی طبیعت بھی قصائد کی زمین میں خوب پھلی پھولی۔ اور اہل نظر سے اسے سند شادی دلائی۔ اس کے متعدد قصائد میں بعض پرانے الفاظ و محاورات پائے جاتے ہیں۔ جن کے متعلق مولانا آزاد مرحوم فرماتے ہیں کہ "بعض قصائد میں زبان تو جی کے لحاظ سے پُرانے الفاظ اور محاورے خوب چھوڑ گیا۔ ترقی زبان کے عاشق

عیب سمجھیں تو سمجھا کریں ۔ اس نے ایک قطعہ ابوسہل دبیر کی مدح میں کہا تھا۔ اس کے کچھ اشعار بطور نمونہ کلام حسب ذیل ہیں :-

نوروز روزگار نشاط است دائمی　　پوشیدہ ابر وشت بہ دیبائے ارمنی
بر یاسمن ۔ عصابۂ دُر مرصع است　　برار غواں طویلہ یاقوت معدنی
خیل بہار خیمہ بہ صحرا برون زدند　　واجب کند کہ خیمہ بہ صحرا برون زنی
از بامداد تا بہ شبانگاہ مے خوری　　وز شام گاہ تا بہ سحرگاہ گل کنی
بر ارغواں قلادۂ یاقوت بگسلی　　بر مشک بید نایرہ عود بشکنی
بر گل ہمے نشینی و برگل ہمے خوری　　بر خم ہمے خرامی و بر دن ہمے دنی
زشت ناخریدہ و مشک رائگاں　　ہر چند بر فشانی و ہر چند برچنی
نرگس ہمے رکوع کند در میان باغ　　زیرا کہ کرد فاختہ بر سرو موذنی
دار و خجستہ غالیہ ہالے زنند وس　　چوں خیمۂ بہ عنبر سارا ابیاگنی
نرگس لبان گنفہ زریں ترانہ ولیست　　چوں زر جعفری ۔ بہ میانش دو دانگنی
ماند بہ سینہ و دُم طاؤس شاخ گُل　　چوں مشک و درّ و دانہ بدو بر پراگنی
دو روبیہ گل چو دائرہ بر سرخ دیدہ است　　چوں پشت او بہ رشتہ زریں بیازنی

فی المضحکہ

مرا تو گوئی مے خوردن است اصل فساد　　بجان تو کہ ہمے آیدم ز تو ضحکہ

اگر فساد کند ہر کہ او نبیذ خورد — بسا فساد کہ در بشرب است در مکہ
چرا نبیذ حرام است ہست سکر حلال — نہ ہم نبیذ بود ابتدا از ال سرکہ
نبیذ خام چہ انگوری وچہ موویزی — سفید سیم اچہ بلے سکہ وچہ باسکہ
کجا نبید است آنجا بود جواں مروی — کجا نبید است آں جا کہ رود برکہ

(۳) فرخی المتوفی ۴۲۹ھ

فرخی بھی دربار محمود کا ایک سربرآوردہ شاعر ہے۔ اور اس کی شہرت عنصری سے کم نہیں۔ اس کے حالات شمس العلما آزاد مرحوم کی زبان سے سنئے۔ اس نے اور اس کی شاعری نے سیستان کے جنگلوں میں پرورش پائی۔ طبیعت میں خدائی جوہر تھا۔ خود بخود چمکتا گیا۔ اور زبان سے بڑھکر گلے پر اثر دکھایا۔ موسیقی کے پردوں سے اڑنے لگا۔ سیستان کا علاقہ شہرت کے لوازمات سے ہمیشہ خالی رہا ہے۔ وہاں تنگ دستی تنگ رکھتی تھی۔ اس پر شادی کی۔ اور شادی بھی اپنی پسند کی شادی۔ پہلے تنگ تھا۔ اب تنگ تر ہوکر گھر سے نکلا۔ امیر بلخ کو سُنا کہ اہل کمال کا قدردان ہے۔ وہاں پہنچا۔ وہ مرغزاروں میں اپنے گھوڑوں کے گلوں میں سے بچھیرے چن رہا تھا۔ اس نے وہیں جاکر سلام کیا۔ امیر نے ایک صحرائی آدمی کو جنگلی لباس میں ایسا فصیح اور روشن دماغ دیکھا۔ بہت خوش ہوا۔ خوش آوازی نے خوش کلامی کی سفارش میں زور لگائے۔ حاکم نے حکم دیا کہ ہزار بچھیرے ہم نے آج جمع کئے ہیں۔ جاؤ۔ ان میں سے جتنے بچھیرے گھیر سکو گھیر لو۔ یہ ان کاموں کے مشتاق تھے۔ کمر باندھ۔ پگڑی سنبھال دوڑے۔

اور جنگلی حکمت عملی سے چند بچھیرے گھیر لئے۔ مگر تھک گئے تھے۔ وہیں پڑ رہے یہ حالت امیر کو اور بھی پسند آئی۔ آرام اور عزت کے سامان میں ترقی دی۔ امیر دربار محمود میں گیا۔ انہیں بھی لے گیا۔ وہاں جا کر نصیبہ کھل گیا۔ اور رفتہ رفتہ ایسے ہو گئے کہ عنصری کے برابر نام آنے لگا۔"

فرخی کے کلام میں اصالت زبان اور قدرت کلام کے جوہر موجود ہیں۔ اور یہ اس خصوصیت میں اور درباری شعراسے ممتاز نظر آتا ہے۔ اگرچہ بادی النظر میں انداز نظم اس کا بھی درباری ہے۔ اس میں عربیت کا رنگ اور عربی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ ذخیرۂ اشعار عنصری سے کم نہیں

سلطان محمود نے غزنی کے قریب دامن کوہ میں ایک محل تعمیر کرایا۔ اس میں چمن بندی کرائی۔ بلند چشمہ سے کاٹ کر نہر لائی گئی۔ اس کی تعریف میں فرخی کہتا ہے اور خوب کہتا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

بہ فرخندہ فال و بہ فرخندہ اختر	بنو باغ مے خواست شاہ مظفر
بہ باغ درختاں او عود و صندل	بباغ ریاحین او لبد نتر
بہ باغے چو پیوستن مہر خورم	بباغے چو رخسارۂ دوست دلبر
بہ باغے درو سایۂ شاخ طوبلے	بباغے درو چشمۂ آب کوثر
بہشت اندرو باز یابی بہ نیساں	بہار اندرو باز یابی بہ آفد
زسر دبریدہ چو زلف بریدہ	ز شکل مدور چو چرخ مدور

در و مسکن ماہ رویاں مجلس
در و خانہ شیر گیراں لشکر

کجا جائے بزم است گلہائے بے حد
کجا جائے صید است مرغان بے سر

رواں کرد بر گرد رعنا درختاں
تدواں آموختہ مادہ و نر

یکے کاخ شاہانہ اندر میانش
سر کنگرہ بر کنار دو پیکر

کیاخ اندروں صفہائے معیفے
در صفہا ساختہ سوئے منظر (الخ)

اسدی طوسی
المتوفی ۴۶۵ھ

ابو نصر علی بن احمد نام ہے یہ بلا اختلاف استاد اور کامل فن تسلیم کیا گیا ہے۔ فردوسی نے اسی کے سامنے زانوے ادب تہ کیا۔ فارسی لغت کی کتاب سب سے پہلے اسی نے مدون کی۔ زمانہ مابعد کے لوگ اس کے مقلد ہوئے۔ اس کا کلام ٹھوس ہے۔ مگر اس میں نزاکت اور رنگینی کی بھی کمی نہیں۔ اس کی طبیعت لفظوں ہی سے شاعرانہ مضامین پیدا کرتی ہے۔ بقول آزاد بڈھا استاد ہے مگر دل نوجوان ہے۔ اب تک شاعری دوبیتی اور سہ بیتی تک ہی محدود تھی۔ اسدی نے اسے وسعت دی قطعات عاشقانہ اور واعظانہ رنگ میں لکھے۔ چمن اور حسن کی بہار دکھائی اشیائے بے جان کو جاندار اور ذی عقل بنا کر شان مسیحائی دکھائی۔ انہیں بلا کر چھوڑا۔ ان میں مناظرہ اور جنگ کرائی۔ چنانچہ مناظرۂ زمین و آسمان، روز و شب

نیزہ و کمان، گبر و مسلمان ہنوز یادگار ہیں۔ آخر میں بادشاہ یا وزیر کی تعریف بھی کر جاتا ہے۔ مناظرہ نیزہ و کمان کے ۳۱ شعر ہیں۔ ان میں سے چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں:-

مناظرہ نیزہ و کمان

هر سلاحی را اگر زخمے است اندر کارزار ‌ ‌ ‌ زخم سخت آں داں کز و گردد عدو را کارزار

لیک آں کو ہم بجائے خویش زخم آورد و لے ‌ ‌ ‌ رمح و قوس است آلت جنگ و راں کیں گزار

ہر دو را روزے جدال افتاد با ہم در سخن ‌ ‌ ‌ ایں بر آں آورد حجت ـ آں بریں کرد افتخار

قوس گفت ار چوں قد یاری تو چوبے ـ کز مثال ‌ ‌ ‌ من چناں کابر دے یارم ـ گر توئی چوں قد یار

رمح گفتا ید عصائے موسیٰ مرسل چو من ‌ ‌ ‌ آنکہ شد مار و بر آورد از سر دشمن دمار

قوس گفتا ـ بہ عصائے موسیٰ ار چوں تو ـ لیک ‌ ‌ ‌ آں عصا ہم شبیہ من شد چوں اعدا گشت مار

رمح دیگر رہ بہ تندی گفت کز کوتہ قدی ‌ ‌ ‌ مردم کوتاہ معجب باشد و نا بردبار

قوس گفتا سبک گفتی یاوہ اکنوں یک بیک ‌ ‌ ‌ پاسخ از من بشنو و عقلت بہ لفظم برگمار

ہم بہ قوت زندہ پیلم ـ ہم بہ ہیبت شرزہ شیر ‌ ‌ ‌ ہم بہ پیچش تند بادم ـ ہم بہ سوزش تفتہ نار

بر جہاں ژالہ چو نوک تیر من بارد غمام ‌ ‌ ‌ از ہوا قوس قزح چوں من پدید آرد بہار

جز بہ صحرا بر ـ نیائی تو بکار اندر کہ جنگ ‌ ‌ ‌ ہم بہ صحرا بر ـ بکار آیم من و ہم در حصار

۱؎ پیداد ـ

شاخ میوہ در خزاں چوں من گرد خم گاہ بر ماہ گردوں ہر مہے چوں من شود وقتے نزار

صاحبت را در سفر توشہ نیسانی[1] داد تو از ہوا من آورم مرغاں و صید مرغزار

رمح کایں بشنید عاجز گشت عذر آورد و گفت راست گفتی، ایں نیاموختی[2] مگر از شہریار

نامور، بر اصل، والا منوچہر اصل ملک تاج شاہان و شجاع دولت و فخر تبار

دقیقی المتوفی ۳۴۱ھ

نام ابو منصور محمد بن احمد وطن بلخ یا سمرقند۔ طبقہ اولٰے کا شاعر ہے۔ اپنی عمر کے آخری دور میں دربار غزنوی میں پہنچا۔ اور دربار امیر نصیر ابن ناصر الدین سبکتگین میں زمزمہ سنجی شروع کی۔

بہاریہ، عاشقانہ اور رندیہ، ہر قسم کے مضامین میں طبع آزمائی کی اور کامیاب ہوا۔

مولانا آزاد مرحوم سخندان پارس میں لکھتے ہیں کہ "معلوم ہوتا ہے۔ کہ سبکتگین کے گھرانے میں شاہان عجم کی تاریخ کی مدت سے فرمائش تھی۔ کیونکہ دقیقی نے امیر نصیر کی فرمائش سے اس نظم پر کمر باندھی تھی۔ مگر مسلسل نہیں مختلف بادشاہوں کے حالات نظم کئے تھے[3]۔ کہ بدعملی نے دفعتہً نیک عمل سے محروم کر دیا کمبخت غلام پر عاشق تھا۔ وہ غیرت والا تھا۔ خنجر مردانگی سے مالک کو مار ڈالا"

---

[1] نہ توانی

[2] ناموختی [3] کہتے ہیں کہ ایک ہزار شعر وہ لکھ سکا تھا۔

فردوسی کہتا ہے ؎

یکا یک از و بخت برگشتہ شد بدست یکے بندہ برگشتہ شد

فردوسی کا کلام اس کے کلام سے ممتاز ہے ۔ ملاحظہ ہو ؎

مدح سخاوت

تو آں ابری کہ تا ساید شب و روز زباریدن چناں چوں از کمال تیر

نہ باری در کف دل خواہ جز زر چناں چوں بر سرید خواہ جز بر

بہاریہ

مئے صافی بیار اے بت کہ ماہیست جہاں از ماہ تا آں جا کہ ماہیست

چو از کاخ آمدی بیروں بہ صحرا کجا چشم افگنی ۔ دیبا تے رومیست

بیا تا مے خوریم و شاد باشیم کہ ہنگام مئے و ایام شادیست
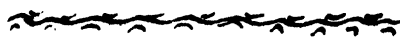
نصیحت

من ایں جا دیر ماندم خوار گشتم عزیز از ماندن دائم شود خوار

چو آب اندر شمر بسیار ماند   شود طعمش بد از آرام بسیار

شکایت روزگار!

گو نہ صبر کن کہ ترا صبر بر دہد   آرے دہد ولیک بعمرِ دگر دہد
من عمر خویشتن بہ صبوری گزاشتم   عمرِ دگر بباید وتا صبر بر دہد

شاہ نامر خسرو، رشیدی اور عسجدی معاصرین میں سے ہیں۔ ان میں سے آخر الذکر دو شعرا کا دربار محمودی سے تعلق تھا۔ دربار محمودی کے ایسے متوسلین شعرا کی تعداد چار سو کے قریب بتائی جاتی ہے۔

فردوسی نام ابوالقاسم[1] بن اسحاق۔ مولد و وطن شاداب (طوس)، اس کا باپ زمیندار اور حاکم طوس کے چار باغ میں خدمت

---

[1] سخندان پارس صفحہ ۲۷۴ لیکن صاحب تالیف التذکرہ فردوسی کا نام حسن بن اسحاق بن شرف لکھتا ہے۔ اسی طرح فردوسی کے باپ کا نام ایک تذکرہ میں فخر الدین لکھا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

باغبانی پر مامور تھا۔ شاید اسی نسبت سے یہ تخلص اختیار کیا۔ فردوسی نے ملکہ
سخن آفرینی خداداد پایا۔ بچپن ہی سے شعر موزوں کر کے الشعرا تلامیذ الرحمٰن کا
ثبوت دینے لگا۔ کھیت۔ باغ و چمن۔ پہاڑ۔ ٹیلے۔ میدان اس کی جولانگاہ
اور طائران نغمہ سنج اس کے ہمصفیر تھے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں۔ کہ "اگرچہ
اس کی طبیعت کو خالص انسانیت نے شائستگی دی تھی۔ اور امیروں کی
صحبت اور درباری تکلفات سے محروم رکھا تھا۔ لیکن خوبی اس میں یہ ہوئی
کہ ان کی خود آرائی اور ظاہر نمائی کے دھبوں سے بچ گیا۔ اس سے بڑھکر یہ
کہ زور طبع اس کا صحرا کے خلوت خانہ میں اپنے تئیں آپ پرورش دیتا رہا۔
غیروں کے کام اس کے کلام کے لئے نمونہ نہ ہوسکے۔ بلکہ علم کی اصلاح اور
مصنوعی تکلف، اس کے لکھے کو قلم نہ چھوا سکے"

فردوسی کا کلام طوس میں خوب چمکا حتیٰ کہ وہ مشہور شعرا کے زمرہ
میں شمار ہونے لگا۔ امیر طوس ابو منصور محمد اس کا مربی تھا۔ ان دنوں سلطان
محمود کی شان و شوکت اور علم پروری کی حکایات ایشیا میں بطور
کہانیوں کے سنائی جاتی تھیں۔ اس کا دربار شعرا کا مرجع بنا ہوا تھا،
امیر طوس کی ترغیب سے فردوسی نے بھی عزم غزنی کیا۔

اس نے یہ بھی سُنا کہ غزنی کے شاہی خاندان کو شاہانِ
عجم کی نظم تاریخ کا شوق ہے۔ اور کہ دقیقی کی قبل از وقت

موت[1] نے اس کام کو ناتمام چھوڑ دیا ہے۔ پس فردوسی نے پہلے اپنا امتحان آپ کیا۔ زوال جمشید اور ترقی ضحاک کے واقعات نظم کر کے اپنے احباب کو سنائے۔ سب نے پسند کئے۔ اس سے اس کا حوصلہ بڑھا۔ اور وہ بے جھجک غزنی جا پہنچا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں" وہاں عنصری شاعر سے ملاقات ہوئی۔ محمود مدت سے نظم شاہنامہ کی فرمائش کر رہا تھا۔ اور وہ ٹالتا تھا۔ فردوسی اور اس کے کلام کی شان و شوکت کو مناسب حال دیکھا۔ کہا کہ چند شعر بادشاہ

---

[1] شاہ ایران (یزدجرد) نے کیومرث کے زمانے سے لے کر خسرو پرویز کے عہد تک کے حالات قلمبند کرائے تھے۔ اس کتاب کا نام باستان نامہ تھا۔ جب عربوں نے ایران فتح کیا تو یہ کتاب شاہی کتب خانہ سے دستیاب ہوئی۔ والی خراسان (یعقوب بن لیث) نے ابو منصور عبدالرزاق بن عبداللہ عبدالملک کو حکم دیا کہ باستان نامہ کو یزدجرد کے عہد تک کے واقعات سے مکمل کیا جائے۔ چنانچہ ۳۶۲ھ میں باستان نامہ مکمل ہو گیا۔ جب اس کتاب کی نقول منتشر ہوئیں تو ایک نقل والی بخارا کے بھی ہاتھ لگی۔ ان دنوں بخارا سامانیوں کے زیر اقتدار تھا۔ اس نے دقیقی کو اس کے نظم کرنے کا حکم دیا۔ مولانا آزاد نے دقیقی کے کام کو ابو نصر کی تحریک کے ساتھ منسوب کیا ہے خبر کچھ ہو۔ ان معلومات سے ایک مورخ یہ معقول نتیجہ نکالتا ہے۔ کہ شاہنامہ فردوسی کا ماخذ باستان نامہ ہے۔

کی تعریف میں کہو اور چل کر دربار میں سناؤ۔ فردوسی نے اسی زمین میں چند اشعار لکھے "

الغرض فردوسی دربار محمودی میں جا پہنچا۔ اور اس نے مدحیہ اشعار سر دربار پڑھے۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں ؎

زیزدان ہر شاہ یاد آفریں | کہ نازد بہ او تخت و تاج و نگیں
جہاندار محمود شاہ بزرگ | بہ آبشخور آرد ہمے شیر و گرگ
جہاں آفریں تا جہاں آفرید | چو او مرزبانے نیامد پدید
ز کشمیر تا پیش دریائے چیں | برو شہریاراں کنند آفریں
چو کودک لب از شیر مادر بشست | بہ گہوارہ محمود گوید نخست
بہ بزم اندر او آسمان وفاست | برزم اندر او شیر جنگ آزماست
بہ تن زندہ پیل و بجان جبرئیل | بہ کف ابر بہمن بہ دل رود نیل

اس کے بعد اس نے رستم و اسفندیار کی نظم داستان سنائی جو اس نے طوس ہی میں موزوں کی تھی۔ تمہید ملاحظہ ہو ؎

کنوں خورد باید مئے خوشگوار | کہ مے بوئے مشک آید از جوئبار
ہوا پر خروش و زمیں پر ز جوش | خنک آں کہ دل شاد دارد ز نوش
درم دارد و نقل و نان و نبید | سر گوسفندے تو اند برید

پروفیسر آزاد لکھتے ہیں کہ:۔ اس کی نظم کے دبدبہ سے دربار گونج اٹھا محمود

بہت خوش ہوا۔ نظم شاہنامہ کے لئے حکم دیا۔ ایک خانۂ باغ اپنے حرم سرا کے زیر سایہ۔ وہیں انواع واقسام کے ہتھیار۔ شاہان سلف کے دربار اور مشہور معرکوں کے مرقعے۔ عجیب جانوروں کی تصویریں سجا کر ایک عجائب خانہ مرتب کر دیا۔"

سلطان نے فردوسی کی تنخواہ مقرر کر دی۔ وہ چار سال تک غزنی میں رہا گاہے ماہے سلطان کو اپنی نظم سنا آتا۔ اور بیش بہا انعام لے آتا تھا چار سال کے بعد سلطانی اجازت سے طوس گیا۔ جب فردوسی ہزار ابیات لکھ چکا تو خواجہ احمد وزیر نے سلطانی حکم سے اسے ہزار دینار بھیجے۔ پھر جب چہارم حصہ کے قریب شاہنامہ نظم ہو چکا۔ تو اس نے سلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ بہت پسند آیا۔ فردوسی نے بیش بہا انعام پایا۔ کچھ عرصہ بعد سلطانی دربار میں شکایت کی گئی کہ فردوسی مذہباً قرمطی ہے۔ کہتے ہیں۔ کہ وزیر خواجہ احمد بن حسن میمندی۔ فردوسی کا مربی تھا اور خواجہ ایاز سے اس کی نہ بنتی تھی اور بنا شکایت یہی ناموافقت یا مخالفت تھی فردوسی سے جواب طلب ہوا۔ تو اس نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور پھر بہ حسن تعلیل اشعار ذیل میں معذرت خواہ ہوا:-

چو در ملک سلطان کہ چرخش ستود ۔۔۔ بسے ہست ترسا و گبر و یہود
گرفتند در ظل عدلش قرار ۔۔۔ شدہ ایمن از گردش روزگار
چہ باشد کہ سلطان گردوں شکوہ ۔۔۔ رہے کا شمار د یکے زاں گروہ

فردوسی کا وظیفہ و تنخواہ بحال رہی۔ مگر کہتے ہیں کہ دیندار سلطان کے دل میں اس کی پہلی سی وقعت نہ رہی۔ آخرکار تیس سالہ جگر کاوی کے بعد فردوسی نے شاہنامہ مکمل کیا۔ جس میں ساٹھ ہزار اشعار تھے۔ کہتا ہے ؎

بسے رنج بُردم دریں سال سی عجم زندہ کردم بدیں فارسی

جب مکمل شاہنامہ خدمت سلطانی میں پیش ہوا۔ تو سلطان اُسے دیکھکر خوش ہوا۔ جوش مسرت میں اس کی زبان سے نکلا ؎

بہ چشمم چو بگشود گنج گہر کنوں پیلوانش دہم گنج وزر

سلطان نے حکم دیا کہ فردوسی کو ایک بار فیل اشرفیاں دی جائیں۔ لیکن اس کے مخالف وزیر یا امیر نے ساٹھ ہزار درم اُسے دینا چاہے۔ فردوسی نے نہ لئے اور آزردہ ہوکر چلا گیا۔ اور ہجو لکھی۔ اس کے بعد اسے تلاش کیا گیا۔ مگر نہ ملا فردوسی اقبال محمودی کے خوف سے کہیں رہ نہیں سکتا تھا۔ آخر طوس ہی جاکر سر چھپایا۔ ہجو کو منوچہر بن قابوس نامی رئیس نے شاہنامہ سے علحدہ کر دینے کی خواہش فردوسی سے کی اور ایک سو اسی مثقال سونا پیش کیا۔ فردوسی نے منظور کیا۔

دربار سلطانی میں ایک لطیفہ ہوا۔ ایک گورنر سرکش ہوگیا۔ اُسے تنبیہہ مراسلہ لکھا گیا۔ اس وقت سلطان وزیر خواجہ احمد میمندی سے کہنے لگا "اگر جواب حسب مراد نہ آیا تو پھر کیا کیا جائے گا۔ وزیر کی زبان سے دفعتاً نکلا ؎

اگر نہ بہ کام من آید جواب   من و گرز و میدان و افراسیاب!

یہ شعر فردوسی کا تھا۔ سلطان متاثر ہوا۔ حتیٰ کہ قصور معاف کیا۔ اور اس کے ساتھ ہزار دینار بھیجے۔ لیکن جب شاہی کارندے فردوسی کو ڈھونڈتے ہوئے طوس پہنچے تو لوگ فردوسی کا جنازہ قبرستان لے جا رہے تھے۔ واقعہ صرف اسی قدر ہے۔ باقی افسانہ اور افسانہ بھی فرضی جسے واقعیت سے قطعاً تعلق نہیں اور یہ متاخرین کی ایجاد ہے لینپول صاحب بہادر یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ "سلطان محمود کو شعر و سخن کا بہت شوق تھا۔ اور (وہ) شاعروں کی بڑی قدر کرتا تھا۔ فردوسی پر بادشاہ کی بڑی نظر عنایت تھی" سلطان محمود کے حالات میں لکھتے ہیں " اس بادشاہ کے تذکرے میں ایک اور مشہور قصہ بھی قابل ذکر ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس میں ایک عیب بھی تھا۔ یعنی بعض اوقات انصاف پر طمع غالب ہو جاتی تھی۔ بادشاہ نے فردوسی کو شاہنامہ لکھنے کا حکم دیا۔ اور فی شعر ایک اشرفی عطا کرنے کا وعدہ کیا۔ فردوسی نے بڑا خون جگر کھا کر ساٹھ ہزار شعر لکھے۔ ساٹھ ہزار شعر دیکھ کر محمود اپنے وعدہ سے پچھتایا اور دون ہمتی سے فردوسی کو صرف ساٹھ ہزار روپے یعنی انعام موعودہ کا سولھواں حصہ دینے لگا۔ اس کو فردوسی نے منظور نہ کیا اور ناراض ہو کر غزنی سے چلا گیا۔ کہتے ہیں کہ پیچھے محمود نے نادم ہو کر فردوسی کے پاس پورا انعام بھیجا۔ مگر جب اس کے قاصد اشرفیوں کے توڑے لیکر فردوسی کے گھر پہنچے ہیں اس وقت فردوسی کا انتقال ہو چکا تھا اور لوگ اس کا جنازہ لئے جاتے تھے"۔

اصل واقعہ پر اضافہ کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ سلطان نے فی شعر اشرفی دینے کا وعدہ کیا اور پورا نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ لینپھرج صاحب اور متاخر مورخین نے یہ نکالا ہے کہ سلطان میں بیشمار خوبیوں کے باوجود ایک عیب بھی تھا کہ بعض اوقات انصاف پر طمع غالب ہوجاتی تھی" سلطان پر دون ہمتی کا بھی الزام لگایا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطان کا فردوسی کو فی شعر ایک اشرفی دینے کا وعدہ کرنا بھی غلط اور اس سے انحراف بھی غلط ہے اور اس امر کے ثبوت موجود ہیں۔

(۱) یہ روایت متاخرین کی ایجاد ہے یا اضافہ ہے۔ متقدمین کے کان اس سے آشنا نہ تھے (ا) سلطان کے کسی ہمعصر مورخ نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ (ب) سلطان کی اولاد کے زمانہ کے مورخین نے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ (ج) اگر یہ کہا جائے کہ مورخین وابستگان دولت غزنویہ نے خوف یا طمع سے اس واقعہ کو چھپایا تو ہم منہاج سراج "کی تاریخ طبقات ناصری پیش کریں گے اس مورخ کا تعلق غوریوں سے تھا اور یہ بات اس کتاب میں بوضاحت معرض تحریر میں آچکی ہے۔ کہ غوری سخت دشمن تھے غزنویوں کے۔ پس اگر سلطان نے وعدہ۔ اور پھر بدعہدی کی ہوتی تو اس کا ذکر طبقات ناصری میں ضرور آتا۔ (د) ہندوستانی مورخ ضیا برنی جو عہد تغلق میں ہوا ہے مصنف تاریخ فیروز شاہی ثقہ معتبر مورخ ہے اور ہر ایک بات اچھی ہو یا بری کھول کر بیان کرنے کا عادی ہے امیر خسرو دہلوی کے کمالات۔ اور علاء الدین خلجی کی حکومت کی ناقدردانی کی شکایت کرتا ہوا کہتا ہے کہ کاش امیر خسرو جیسا باکمال استاد عہد محمود میں ہوتا اور فیاض و

قدر دان سلطان انعام و اکرام و جاگیرات سیر حاصل سے امیر خسرو کو مالا مال کرتا۔

ہم ضیاء برنی کے اس بیان سے دو نتایج اخذ کریں گے:۔

(۱) اس تاریخ کی تدوین کے زمانہ تک (عہد تغلق) سلطان کی بدعہدی کی روایت ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ یہ زمانہ مابعد کی ایجاد ہے۔

(۲) سلطان کی علم پروری و قدر دانی کا شہرہ افغانستان اور ترکستان خراسان سے نکل کر ہندوستان تک آپہنچا تھا۔

(۲) ہم نے واقعات میں لکھا کہ سلطان نے فردوسی کو ایک فیل دینار زر دینے کا حکم دیا لیکن وزیر پاکسی اور درباری کی مخاصمت سے یہ رقم فردوسی کو نہ ملی۔ ہم نے یہ بھی لکھا کہ فردوسی کے قرمنطہ ہونے کی شکایت کی گئی۔ یہ خیالی اور قیاسی باتیں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک قلمی تاریخ سے ماخوذ ہیں۔ یہ تاریخ نویں صدی ہجری کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا نام ہے تالیف التذکرہ۔ یہ کتاب کتب خانہ میاں ولڈا صاحب واقعہ حصار (پنجاب) میں موجود ہے

(۳) تاریخ فرشتہ ایک معتبر تاریخ ہے۔ اس کے متعلق فاضل لیتھبرج کی رائے ہے کہ ہند کی نہایت مستند انگریزی تاریخوں میں جو ہند کی سلطنت اسلامیہ کا حال مندرج ہے وہ اکثر اسی (تاریخ فرشتہ) سے لیا گیا ہے''

اسی تاریخ فرشتہ میں مرقوم ہے کہ یہ قصہ (سلطان محمود کی بدعہدی) غلط ہے سلطان علوم و فنون کا نہایت قدر دان اور سرپرست تھا۔

(۴) ابوالفضل فردوسی کو "لالچی اور سخن فروش" کے خطاب دیتا ہے۔ گویا الزام فردوسی

کے سر رکھتا ہے۔ اس سے بھی سلطان کی بدعہدی کی تردید ہوتی ہے۔

(۵) الفنسٹن صاحب کی رائے کا مفہوم بھی اسی قسم کا ہے۔ دیکھو اردو تاریخ صفحہ ۵۵۴

(۶) بیتھبرج صاحب بھی اسے واقعہ نہیں کہتے۔ بلکہ "قصہ" کہتے ہیں۔

(۷) اس قسم کے معاہدے وجن کے انحراف کا سلطان کو الزام دیا جاتا ہے) محض تاجرانہ ہوتے ہیں۔ (کتب فروش یا اہل مطابع) اس قسم کے معاہدے شعرا اور مصنفوں سے کیا کرتے ہیں۔ ایسا معاہدہ کسی بادشاہ خصوصاً کسی مشرقی بادشاہ کی شان کے منافی اور گویا اس کی توہین ہے۔ پس اگر اور تمام باتوں سے قطع نظر کرکے اس قصہ کو اسی اصول سے دیکھا جائے تو اس کی حقیقت آئینہ ہو جاتی ہے!

(۸) فردوسی کو تنخواہ اور وظیفہ ملتا تھا۔ اس صورت میں تصنیف کے آخر میں کسی خاص رقم کا وعدہ کیا؟ رہا انعام وہ اختیاری ہے۔ یہ لازمی نہیں کہ تنخواہ دار ملازم کو انعام دیا ہی جائے!

(۹) فردوسی نے سلطانی مصاحبت اور جاگیر کی خواہش کی تھی۔ پھر وہ کسی انعام کا کیونکر متوقع ہو سکتا تھا۔ اگر ہوتا تو یہ خود اس کی غلطی تھی۔

(۱۰) یہ ممکن ہے کہ فردوسی کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ اولاً ہزار اشعار لکھے جانے کے بعد سلطان نے اپنے وزیر خواجہ احمد کی معرفت اسے ہزار اشرفیاں بطور انعام بھیجی تھیں پس بہت ممکن ہے کہ فردوسی نے یہ قیاس کر لیا ہو کہ اگر شاہنامہ میں میں ساٹھ ہزار اشعار لکھ سکا تو مجھے ساٹھ ہزار اشرفیاں ملیں گی۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ خود فردوسی کا قصور ہے

سلطان پر اس کا کچھ الزام نہیں آتا!

(۱) فردوسی، وزیر یا کسی امیر کی ریشہ دوانی سے بغیر روپیہ لئے چلا گیا اس کے بعد وزیر کے منہ سے اتفاقاً فردوسی کا شعر نکلا تو سلطان کو فردوسی یاد آیا۔ اس کا قصور معاف کیا اور اس کے لئے زرِ سرخ بھجوایا۔ اگر بقول متاخرین سلطان لالچی تھا۔ تو اب وہ روپیہ کیوں بھجواتا؟ اب تو اس کے پاس ایک زبردست بہانہ تھا۔ اگر وہ ایک ایسے شخص کو جس نے سلطان کی ہجو لکھی۔ اور جس پر قرامطہ ہونے کا بھی الزام عائد ہوتا تھا معاف نہ کرتا اور اسے زر نہ بھیجتا۔ تو یقیناً اسے ملامت نہیں کی جا سکتی تھی۔

(۲) یہ معلوم کر کے کہ فردوسی قرامطہ کے عقائد رکھتا ہے۔ سلطان جیسے سُنی بادشاہ کی اس کی جانب کم التفاتی کا سلوک کرنا قابل ملامت نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ جب خود فردوسی نے اپنے اشعار میں دبی زبان سے اس جرم کا اقبال کر لیا اور کہہ دیا کہ آخر سلطان کے زیرِ سایہ اور بھی تو کفار و مشرک رہتے ہیں۔

اولاً ہزار اشعار کے بعد فردوسی کو ہزار اشرفیوں کا انعام دیا گیا تھا۔ ممکن تھا کہ سلطان شاہنامہ کی تکمیل کے بعد ایسا بیش قرار انعام دیتا۔ جس کی شرح فی شعر اشرفی سے بھی بڑھ جاتی۔ لیکن فردوسی کی بدقسمتی کا کیا علاج تھا۔ کہ بے دینی کی تہمت اس کے گلے پڑی سلطان کی علم پروری کی تفصیل تم پڑھ آئے ہو۔ ان سب باتوں پر ایک نظر ڈالو۔ اور قیاس کرو کہ کیا ایسا سلطان فردوسی کے ساتھ بدعہدی کر سکتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ سلطان نے فردوسی سے فی شعر ایک اشرفی دینے کا وعدہ کیا نہ اس معاہدہ سے انحراف کیا۔

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ آخر اس فرضی افسانے نے اس قدر شہرت کیوں پکڑی کہ وہ سلطان محمود اور فردوسی کی تاریخ کا جزو لاینفک بن گیا؟ بات یہ ہے کہ جب کوئی بااقبال فاضل اور حامل علم و فضل قوم انحطاط کی طرف جاتی ہے تو اس کے تمام معقول و منقول علوم فنون کی قائم مقام صرف شاعری رہ جاتی ہے گویا شاعری اور زوال قوم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ کلیہ مسلمانوں پر بالکل منطبق ہے طہران جاؤ یا بغداد۔ غزنی کے دربار کو دیکھو یا دیوان خاص دہلی کی سیر کرو۔ ہر جگہ یہی نظارے پیش نظر ہوں گے۔ ہر جگہ ان علمبرداران علم و فن کے پاس یہی اسلحہ (شاعری) رہ گیا تھا۔ اور وہ امرا کو اسی سے زیر و مرعوب کرنا چاہتے تھے! ان میں سے ہر ایک مرزا آسودہ انھاہنیں لوگوں نے فردوسی کے واقعہ میں نمک مرچ لگا کر اس افسانہ کا صور ایسی بلند آہنگی سے پھونکا کہ اس کی گونج آج تک ہمارے کانوں میں موجود ہے! قوم کی تاریخی بدمذاقی اور اس سے بے اعتنائی۔ مزید برآں، کسی نے آنکھ کھول کر نہ دیکھا کہ درحقیقت بات کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قومی ادبار کے زمانے میں ایسے ہی شگوفے کھلا کرتے ہیں۔ جن لوگوں کے اخلاق خود گرے ہوتے ہیں انہیں بے تکلف اپنے بزرگوں کے اخلاق میں بھی یہی غلاظت نظر آجاتی ہے۔

سلطان محمود کی دینی سرگرمی۔ جہادی جوش۔ فاتحانہ پیش قدمی۔ علمی

سرپرستی - معدلت گستری سب کچھ فراموش! مگر بد عہدی کا فرضی افسانہ ازبر!
حیف برما بود بر قوم ما!! استغفراللہ، استغفراللہ

پس سلطان محمود نہ لالچی تھا - نہ زر پرست اور نہ دون ہمت - بلکہ فیاض
عالی ہمت علم دوست اور علوم وفنون کا مربی تھا - اس نے غزنی میں دار العلوم
قائم کیا - بیشمار دینی دنیوی مدارس وخانقاہیں ممالک محروسہ میں کھلوائیں اس
کا دربار علما وفضلا کا مرجع بنا ہوا تھا -

پروفیسر محمود شیرانی نے ایک معرکۃ الآرا مقالہ لکھکر یہ ثابت کرنے کی
کوشش کی کہ فردوسی کی جو ہجو سلطان سے منسوب کی جاتی ہے - وہ دراصل
کوئی مستقل نظم نہیں ہے - بلکہ فردوسی کے متفرق اشعار ہیں جو اس نے
مختلف مواقع پر مختلف اشخاص کے متعلق کہے - یہ مضمون اردو انگریزی رسائل
میں شائع ہوچکا ہے ؛

سلطان کے جانشین

سلطان محمد

سلطان محمود کے سات فرزند (۱) محمود (۲) محمود (۳) ابراہیم (۴) اسمٰعیل (۵) عبدالرشید (۶) نصر اور (۷) محمود (ثانی) تھے۔ بڑے مسعود اور محمد تھے۔ لیکن ان میں صرف ایک دن کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ مسعود ایک دن بڑا تھا۔ یہ دونوں بھائی تعلیم۔ اخلاق حسنہ۔ اور دینداری کے لحاظ سے مساوی، مگر شجاعت۔ کاروائی اور سخاوت میں مسعود ممتاز تھا۔ اس نے ایام شہزادگی میں قزوین۔ رے۔ ہمدان اور طارم تسخیر کر کے اپنی فاتحانہ قابلیت کا ثبوت بہم پہنچایا۔ ملوکان ویلمی کو بھی اسی نے زیر کیا۔

جب سلطان محمود رہ گرائے عالم بقا ہوا تو شہزادہ محمد بہ تائید وزیر حسن بن محمد سریر آرائے حکومت ہوا۔ سلطان نے اس کی تخت نشینی کی وصیت کی تھی[1] اس وقت شہزادہ مسعود ہمدان (ہرات) میں تھا۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ سلطان اپنا جانشین تو شہزادہ محمد ہی کو کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی آرزو یہ تھی کہ اس کے بعد اس کے فرزندوں میں حکومت کے لئے نزاع

[1] نامہ خسروان

اور خونریزی نہ ہو۔ اور اس امر کی اس نے اپنی حیات میں کوشش کی چنانچہ محمد کو حکومت کے لئے نامزد بھی کر دیا۔ لیکن اس کی دلی آرزو پوری نہ ہوئی۔ وفات سے بہت عرصہ پیشتر جب سلطان عراق میں تھا اس نے شہزادہ مسعود سے دریافت کیا کہ

"جان پدر! میرے بعد تم اپنے بھائی محمد سے کس طرح پیش آؤ گے؟"

شہزادہ نے معاً کہا "جس طرح سلطان اپنے بھائی سے پیش آئے تھے"

سلطان یہ سن کر چونک پڑا۔ پھر اس نے مسعود کو نرمی سے سمجھایا کہ "اس قسم کے خیالات فاسدہ کو دل و دماغ میں جگہ نہ دو۔ اور میرے روبرو قسم کھاؤ کہ موجودہ حکومت و امارت پر قناعت کرو گے۔ اور اپنے بھائی سے دست و گریباں نہ ہو گے"

شہزادہ مسعود نے تامل کے بعد جواب دیا۔ سلطان کے ہر حکم کی تعمیل کو میں اپنی سعادتمندی سمجھتا ہوں۔ لیکن اظہار حقیقت بھی ضروری ہے۔ فرض کیجے کہ آج میں نے اس قسم کی قسم کھائی اور کل مجھے ترکۂ پدری سے بالکل محروم کر دیا گیا تو میں بھی آخر سلطان کا جگر گوشہ ہوں۔ اور اس لئے حسب حکم شریعت ترکۂ پدری کا مستحق

یہ سن کر سلطان نے کہا "بے جا بدگمانی کی ضرورت نہیں۔ تمہارا حصہ تم کو ضرور دیا جائیگا۔ تم قسم کھاؤ کہ بھائی سے آمادۂ جنگ نہ ہو گے"

مسعود نے جواب دیا "میں عرض کر چکا ہوں کہ میں سلطان کے ہر ایسے حکم کی تعمیل کے لئے حاضر ہوں جو منصفانہ ہو۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ میں یہاں ہوں اور بھائی محمد غزنی بیٹھے ہیں۔ اگر وہ یہاں موجود ہوتے اور قسم کھا کر مجھے ترکۂ پدری

دینے کا یقین دلاتے تو میں بھی قسم کھا لیتا۔ لیکن موجودہ حالات میں یہ معاملہ طے نہیں ہو سکتا۔" یہ سُنکر سلطان مایوس ہو کر غزنی واپس گیا [1]

سلطان محمد نے جوں ہی تخت پر قدم رکھا خزانوں کے دروازے کھول دیے۔ اس کے نزدیک حکومت کو ہر دل عزیز بنانے کا یہ آسان نسخہ تھا۔ مگر یہ غلطی تھی۔

مسعود نے بھائی کی تخت نشینی کی خبر سُنی تو ہمدان سے خراسان آیا اور حسب ذیل مضمون کا مراسلہ بھائی کو بھیجا :-

"اب جبکہ سلطنت والد مغفور نے آپ کے سپرد کر دی ہے۔ تو میں اس کا مطالبہ کرنا فضول سمجھتا ہوں۔ نیز ترکۂ پدری سے بھی دست بردار ہوتا ہوں مجھے بلاد جبال۔ عراق۔ طبرستان ہی کافی ہیں۔ ہاں اس قدر چاہتا ہوں۔ کہ سکوں پر میرا نام بھی مسکوک ہو۔ اور چونکہ میں بڑا ہوں۔ لہٰذا پہلے میرا نام آنا چاہیے خطبہ میں میرا نام مقدم رکھا جائے۔ امید ہے کہ اس امر کو آپ بہ نظر پسندیدگی دیکھیں گے [2]

انصاف کہتا ہے کہ تخت کے مقابلے میں یہ مطالبہ ناجائز نہ تھا لیکن سلطان محمد نے اسے قبول نہ کیا اور اس کا سخت جواب بھیجا [3]

---

[1] نامۂ خسروان

[2] نامۂ خسروان

[3] نامۂ خسروان

معلوم ہوتا ہے کہ یہ امر مسعود کو گراں گزرا اور وہ بھی آمادۂ پیکار ہو گیا۔ اور اس کے کچھ اور اسباب بھی فراہم ہو گئے۔

سلطان محمود کے مشہور اور بہادر جرنیل خواجہ ایاز اور علی خوشاوند نے معہ فوج غلامان خاصہ مسعود کی حمایت پر کمر باندھی۔ وہ ہرات کی جانب روانہ ہو گئے۔ یہ دیکھ کر سلطان محمد نے ہندو فوج کو ہندو جرنیل سوندی کی ماتحتی میں جو سلطان محمود کا معتمد اور بہادر جرنیل تھا۔ خواجہ ایاز وغیرہ کے تعاقب میں روانہ کیا۔

دونوں فوجوں کی مٹھ بھیڑ ہوئی۔ معرکہ سخت رونما ہوا۔ نتیجہ سلطان کے حق میں مفید نہ نکلا۔ ہندو سپاہ بہادرانہ کھیت رہی۔ جرنیل سوندی رائے سلطان محمود غزنوی کی اولاد کی حمایت کرتے ہوئے اس کے مقاصد پر قربان ہو گیا[1][2] خواجہ ایاز وغیرہ کوچ و مقام کرتے ہوئے شہزادہ مسعود کے پاس نیشاپور جا پہنچے۔

ادھر سلطان محمد نے جنگ کی طیاریاں شروع کر دیں۔ بڑی بڑی چھاؤنیوں

---

[1] طبقات اکبری۔

[2] جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سلطان محمود اور اس کا خاندان ہندوؤں کا دشمن تھا اور ہندو غزنویوں کے۔ ان کے لئے یہ واقعہ قابل غور ہے کہ کیا ایسی کشیدگی کی حالت میں بھی کوئی گورنمنٹ ایسے لوگوں پر اعتماد کر سکتی ہے! اور ناراض قوم کے افراد ایسی جاں نثاری دکھا سکتے ہیں؟

سے فوجیں طلب کر کے لشکر آرائی میں مصروف ہوا۔ اور ہرات کی جانب کوچ کا عزم کیا۔ کہ بھائی سے دست وگریباں ہو۔ اس وقت بعض حقیقی خیرخواہان دولت نے سعی بلیغ کی کہ بھائیوں میں تلوار نہ چلے۔ لیکن سلطان پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا[1] اس نے اپنے چچا یوسف کو طلب کر کے اس فوج کا سپہ سالار نامزد کیا اور ہرات کی جانب کوچ بول دیا۔ یہ لشکر یلغار کرتا ہوا موضع نگینہ آباد (تکیا باد) جا پہنچا۔ ماہ رمضان المبارک ۴۲۱ھ کی یکم تاریخ تھی۔ کامل ایک ماہ یہ فوج اسی مقام پر پڑی رہی۔

کہتے ہیں کہ عین عید کے روز جب لشکر جشن منا رہا تھا۔ سلطان محمد کے سر سے تاج گر پڑا۔ اور امرانے اسے اس کے حق میں فال بد سمجھا۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہی فوج ایک ماہ بیکار پڑی پڑی گھبرا گئی تھی اور اس تساہل کو سلطان کی عدم شجاعت اور کمزوری پر محمول کرتی اور بددل سی ہوگئی تھی۔

اُدھر شہزادہ مسعود کی قابلیت وشجاعت کا نقش اُمرا کے دل پر گہرا بیٹھا ہوا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۳ شوال ۴۲۱ھ کی شب کو سلطان محمد کے اپنے امرانے (جن پر وہ اعتماد رکھتا اور جنہیں اپنا خیرخواہ سمجھتا تھا) اسے گرفتار کر کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔ اس گروہ کے سرغنے یوسف ابن سبکتگین۔ جرنیل علی خوشاوند اور وزیر حسن میکائیل تھے۔ سلطان محمد کو نابینا کیا گیا۔ اور پانچ سال بعد معزول ہوا۔ آٹھ سال حکومت کی۔

[1] نامہ خسرواں

اب یہ امرا مع شاہی فوج کو چ کرتے ہوئے ہرات جا پہنچے۔ اور شہزادہ مسعود کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب شہزادہ نے یہ روداد سنی تو سخت متاسف ہوا اور نمک حرام اُمرا کی سزا دہی کی جانب متوجہ ہوا۔ چنانچہ اول اس نے کو نمک وزیر حسن ابن محمد کو پھانسی پر چڑھوایا۔ پھر جرنیل علی خوشاوند کو تہ تیغ کرایا۔ اس کے بعد یوسف کو نظر بند کر دیا۔

مسعود کے اس طرز عمل کو مورخین نے غلط اور مضر بتایا ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئیگی۔

سلطان محمد گو آٹھ سال تک حکومت کرتا رہا۔ لیکن اس کی حکومت کامیاب نہیں ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ عام رائے شروع ہی سے اس کے خلاف اور اس کے حق میں نفی۔ پھر مسعود کی شجاعت اور حکمرانہ قابلیت کا سکّہ امرائے دولت کے قلوب پر بیٹھا ہوا تھا۔ پھر جب اظہار شجاعت کا موقع آیا۔ تو تاہل کرنے لگا اس طرح فوج میں بددلی پھیلی اور اس کے دوستوں ہی نے اسے اسیر کر لیا۔

سلطان محمد کے اس انجام سے عام رائے کی قوت کا بھی پتہ لگتا ہے۔ اور اس واقعے کے اندر اس حکمران طبقہ کے لئے بصیرت و عبرت ہے جو عام رائے سے بے نیازی کا سلوک کرنے کا خوگر ہے:

(۲) سلطان مسعود

اپنے بھائی محمد کی معزولی اور نظر بندی کے بعد غزنی آکر تخت نشین ہوا۔ اس کا سہت سالہ

عہد حکومت اندرونی فتنوں کے دباتے ۔ سلاجیق کا زور توڑنے اور مہمات ہند میں صرف ہوا۔ مورخ نامۂ خسروان لکھتا ہے :-

" سلطان مسعود خودسر و خود پسند بادشاہ تھا ۔ ہواخواہان دولت میں سے کسی کی نہ سنتا تھا۔ جب سرکش اشخاص اندرون ملک میں بازار فتنہ و فساد گرم کرتے تھے تو وہ مہمات ہندوستان پر روانہ ہوجاتا تھا۔ اور جب سلجوقیوں نے خراسان اور دیگر حصص ملک پر قبضہ کر لیا تھا تو وہ ترکوں سے دست و گریبان ہونے کی فکر میں پڑا ہوا تھا۔ جب وہ سمجھتا تھا کہ میں دشمن سے میدان میں عہدہ برآ نہ ہوسکوں گا۔ تو اپنے سرداران فوج کو کمزوری کا الزام رکھکر سزائیں دیتا تھا اس کی تفصیل آئندہ آئیگی "

سلطان مسعود کو آغاز حکومت ہی میں ناکامی ہوئی اس کی سب سے بڑی وجہ علی خویشاوند اور حسن محمد وزیر وغیرہ امرا کا استیصال اور سزادہی تھی ۔ درحقیقت ان لوگوں نے جو کچھ کیا تھا وہ مسعود ہی کے واسطے کیا تھا۔ پس اخلاقی نقطۂ خیال سے اس کا فعل خواہ کتنا ہی مستحسن کیوں نہ قرار دیا جاسکے لیکن سیاسی نقطۂ نظر سے یہ ایک خوفناک غلطی تھی ۔ جس کا خمیازہ سلطان مسعود کو اٹھانا پڑا۔ ان اُمرا کے متعلقین اور ان سے ہمدردی رکھنے والے تمام سردار سلطان سے ناراض تھے گو اگرچہ سلطانی رعب و اقبال نے ان کی زبان بندی کر رکھی تھی لیکن دل و دماغ ایسی حالت میں بھی برابر کام کئے جایا کرتے ہیں۔ جذبات

پیدا ہوتے ہیں۔ اور بڑھتے ہیں (اگرچہ وہ سینہ سے دہن تک نہیں آ سکتے)
ان باتوں کا ظاہری نتیجہ یہ تھا کہ قوم کی متفقہ قوت کا شیرازہ درہم برہم ہو رہا تھا۔ یا جوش تکبیر محمودی زمانے کا جوش سرفروشی۔ اور شوق جاں بازی اب غزنی میں نظر نہ آتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سلطان محمود کے بعد اس کا ایک بھی جانشین اس دل و دماغ کا نہ نکلا ؎

قیس سا کوئی بھی اٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے میں سدا ایک ہی شخص (حالیؒ)

سلطان مسعود کی زیادہ تر توجہ سلجوقیوں کی جانب منعطف رہی۔ سلطان محمود غزنوی اول اول سلجوقیوں کو محض بے حقیقت شے سمجھتا رہا۔ مگر بعد ازاں جب امیر طوس ان سے عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ تو سلطان نے بذات خاص لشکرکشی کر کے ان کو پامال کیا۔ اور اب انہیں سرنیاز جھکاتے ہی بنی۔ لیکن یہ اطاعت سلجوقیوں کی محض پالیسی یاد فع الوقتی تھی۔ باپ کی طرح بیٹا بھی سلاجیق کو خیال میں نہ لاتا اور ان کی سرکشی اور فساد کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔

سلاجیق سے معرکہ آرائی

جب سلطان مسعود ہندوستانی مہمات میں مصروف تھا۔ تو سلجوقیوں نے پھر سر اٹھایا۔ چنانچہ ماوراء النہر اور خراسان میں ہنگامہ تاخت و تاراج گرم کیا۔ سلطان کو اس کی اطلاع پہنچی تو وہ واپسی کے وقت ۴۲۸ھ میں ان کی سزا دہی کے

ارادہ سے غزنی سے روانہ بلخ ہوا۔ لیکن یہ ارادہ اسے ملتوی کرنا پڑا۔ اور رد
قدرخان کے علاقہ پر حملہ آور ہوا جس کا ابھی ابھی انتقال ہوا تھا۔

اس واقعہ سے سلجوقیوں کو قوت بڑھانے کا اور بھی موقع مل گیا۔ چنانچہ انھوں نے زور شور سے طیاریاں شروع کیں۔ بلخ کے گورنر نے سلطان کو رپورٹ بھیجی کہ جعفر بیگ (سلجوق) کثیر جمعیت کے ساتھ رعایا کو تاخت و تاراج کر رہا ہے۔ سلطان فوراً بلخ کی جانب روانہ ہوا۔ لیکن یہ خبر سن کر کہ جعفر بیگ مرو چلا گیا۔ اب دارالخلافہ غزنی خالی تھا طغرل بیگ نے موقع تاکا اور وہاں جا پہنچا۔ اور بے خوف ہوکر سلطانی اصطبل کو تاخت و تاراج کیا یہ تاریخ غزنویہ میں ایک ایسا مکروہ واقعہ تھا کہ آئندہ کے لئے حکومت کی بے رعبی ہوگئی اور اسی سے دولت غزنویہ کی بداقبالی اور سلجوقیوں کے روشن مستقبل کی فال لی گئی۔

سلطان مسعود جعفر بیگ کے تعاقب میں مرو روانہ ہوا۔ اس سے قبل وہ سلطانی دستہ فوج کو ہزیمت دے چکا تھا۔ لیکن اب اپنے میں تاب مقابلہ نہ دیکھکر طالب مصالحت ہوا۔ اور سلطان سے ایک چراگاہ کی سند طلب کی۔ مگر یہ محض دفعۃ الوقتی تھی سلطان نے اسے معافی دیکر سند چراگاہ عطا کی اور اس فتنہ سے مطمئن ہوکر ہرات کو روانہ ہوا۔ سلجوق اب بھی شرارت سے باز نہ آئے۔ سلطانی فوج پر دفعۃً حملہ کرکے اسے نقصان پہنچایا۔ مگر گرفتار ہوئے۔ اور ان کو مع زن و فرزند تہ تیغ کرکے

ان کے سر گدھوں پر لاد کر سردار ترکمان (بیغو) کے پاس بھیجے گئے۔ بیغو نے لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے اظہار تاسف کیا۔ سلطان ہرات سے نیشاپور اور وہاں سے طوس گیا۔ ترکمانوں سے سخت مقابلہ ہوا۔ اور انہیں شکست فاش دی۔ یعنی تقریباً تمام کو تہ تیغ کیا۔ اس کے بعد ان قلعہ جات کو حلقہ نگیں کیا جو ترکمانوں کے زیر اقتدار تھے۔ یہاں کے لوگوں کو ترکمانوں کی اطاعت کے جرم میں سزائیں دیں۔

اب سلطان نے طغرل بیگ کی سزادہی کا ارادہ کیا جس نے خاص دارالحکومت غزنی میں چھاپہ مارنے کی حیرت انگیز گستاخی اور جرأت کی تھی۔ لیکن طغرل کو منہ چھپانا پڑا اور سامنے نہ آیا۔ اسی اثنا میں موسم سرما سر پر آگیا۔ برف باری شروع ہوگئی۔ غزنی کا راستہ برف کے تودوں سے اٹ کر مسدود ہوگیا۔ اور اس طرح سلطانی فوج کا سلسلہ غزنی سے منقطع ہوگیا۔ ہوشیار سلجوقی ان باتوں سے بےخبر نہ تھے۔ بلکہ موقع کی تاک میں تھے۔ چنانچہ یہ وقت اپنے مفید مطلب دیکھکر چوہوں کی مانند بلوں سے نکل آئے۔ اور چاروں طرف کا رستہ گھیر لیا۔ اب سلطان کو سوائے مقابلہ کے اور چارہ کار نظر نہ آیا۔

مقابلہ زور شور سے شروع ہوا۔ تین روز برابر خونریز جنگ ہوتی رہی خون کی ندیاں بہ نکلیں۔ تیسرے روز چند غزنوی اُمرا سلجوقیوں کے پاس چلے گئے۔ ان کی علیحدگی باقی غزنوی فوج کی بھی بےدلی اور دل شکستگی کا باعث ہوئی

بہت سے غزنوی بہادر کھیت رہے۔ میدان کا رنگ بدلا نظر آنے لگا۔ لیکن یہ عالم دیکھکر سلطان کی رگ حمیت پھڑکی۔ خون جوش میں آیا۔ بہ نفس نفیس دشمنوں پر حملہ کیا۔ اور کئی خونخوار دشمنوں کو آنا فاناً خاک وخون میں ملا دیا۔ لیکن بایں ہمہ غزنوی فوج کی حالت قابل اطمینان نہ تھی۔ حتیٰ کہ سلطان کے بہادر ہمراہی بھی اس کے ساتھ نہ رہ سکے۔ چنانچہ وہ اس بہادر کو میدان میں تنہا چھوڑ گئے۔

سلطان نے اب اپنی قسمت کا فیصلہ کیا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور میدان سے باہر نکلنے کا عزم کیا۔ تلوار اس کی راہ صاف کرتی تھی کسی دشمن میں اس سے مقابل ہونے کی جرأت نہیں تھی۔ بلکہ وہ خودبخود ہی رستے سے ہٹ جاتے تھے۔ حتیٰ کہ سلطان میدان سے صحیح سلامت نکل کر قلعہ مرو جا پہنچا یہاں چند ہزیمت خوردہ سپاہی بھی اس سے آملے۔ دشمن کو تعاقب کی جرأت نہیں ہوئی اور یہ سلطان کی ذاتی شجاعت کا اثر تھا۔

سلطان بخیریت تمام غزنی پہنچ گیا۔ اور متعدد سرداران فوج کو ہندوستان کے قلعوں میں مقید کر دیا۔ یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن اس شکست کا نتیجہ غزنوی کے حق میں نامبارک نکلا۔ ملک میں بے رعبی ہوگئی اور یہ واقعہ بھی دولت غزنویہ کے زوال کا ایک سبب تھا۔ اور سلجوقی دہقان سے سلطان بن گئے۔

حاکم پنجاب کا تمرد

احمد نامی ایک امیر عہد محمودی میں خزانچی تھا اس نے تغلب و خیانت کی۔ سلطان نے اسے جرمانہ

اور قید کی سزا دی۔ پھر کچھ عرصہ بعد اس کا قصور معاف کر کے اسے پنجاب کے ایک حصہ کی حکومت دیدی۔ لیکن یہ شخص نیک طینت نہ تھا۔ کہ سلطان کے اس سلوک کا ممنون ہوتا۔ اب سلطان مسعود کے عہد میں اس نے اپنی طبیعت کی خباثت ظاہر کی۔ کہ تمرد دکھایا۔ اور سرکش بن بیٹھا۔ سلطان مسعود نے اس کی سرکوبی کے لئے ایک ہندو جرنیل ناتھ (ناتھ) کو بہت سی فوج دے کر پنجاب بھیجا۔ کہ احمد کو سرکشی کا مزہ چکھائے۔

میدان کارزار گرم ہوا شمشیر ہندی نے جوہر دیکھے اور دکھائے لیکن احمد غالب رہا۔ جرنیل ناتھ مع تقریباً تمام فوج کے سر میدان اپنے آقا سلطان مسعود ابن سلطان محمود پر نہایت وفاداری سے قربان ہو گیا۔ یہ خبر غزنی پہنچی تو سلطان نے اور فوج احمد کی سرکوبی کیلئے بھیجی۔ یہ بھی ہندو سی فوج تھی اور اس کے جرنیل کا نام تولک (تلک) تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ احمد نہایت چلتا پرزہ تھا۔ اس نے ان لوگوں کو جو دربار غزنی سے کشیدہ تھے اپنا دست و بازو بنا لیا تھا اور اس معرکہ میں سب لوگ موجود تھے۔ جنرل تلک سے احمد کی معرکہ آرائی شروع ہوئی ایک جانب احمد باغی معہ اپنے باغی دوستوں کے سینہ سپر تھا۔ اور یہ سب لوگ مسلمان اور ان لوگوں کی یادگار تھے جن کا مجاہدانہ جوش استیصال کفر و ضلالت میں پیش پیش رہا کرتا تھا لیکن اب یہ خود اپنی جڑ اپنے ہاتھ سے کاٹ رہے ہیں۔ اپنی مرکزی طاقت کی کمزوری کے خواہاں ہیں ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔ دوسری جانب غیر مسلم جرنیل تلک ہے جو اپنے مسلمان آقا سلطان مسعود غزنوی کیلئے جان فروشی کر کے حق نمک ادا کر رہا ہے کیتی وابستگان دولت غزنویہ مسلمان امرا بھی اسکی پشت پر موجود ہیں۔

کئی معرکے ہوئے۔ آخر غزنوی اقبال غالب آیا۔ باغی احمد اور اس کے سرکش رفقا مغلوب ہوئے۔ جرنیل تلک نے اس کی بہت سی جمعیت کاٹ کر رکھدی۔ باغی کو قید کر لیا۔ احمد دریائے سندھ کو عبور کرتے ہوئے

سفارتِ خلافت

۲۰ ذیقعدہ ۴۲۲ھ بروز شنبہ خلیفہ القادر باللہ نے وفات پائی اور ان کی جگہ ولیعہد القائم بامر اللہ تخت نشین ہوئے۔ دنیائے اسلام سے تجدید بیعت کا مطالبہ ہوا۔ چنانچہ فقیہہ ابوبکر بن محمد السلیمانی الطوسی امیر مسعود کی خدمت میں خراسان روانہ کئے گئے۔ خبر وفات خلیفہ اس سے قبل خراسان جا پہنچی تھی مگر مصلحتاً مخفی رکھی گئی۔

۱۵ ذی الحجہ کو امیر مسعود کی خدمت میں خط پہنچا کہ سفیر خلافت شورقان آ پہنچا ہے سلطان نے احکام جاری کئے کہ راہ میں اس کی خوب خاطر و مدارات کی جائے۔

ابوبکر خراسان آ پہنچا۔ خواجہ علی میکائیل حسب الحکم امراء، شرفاء، فاضلوں، عالموں اور فقیہوں کو لے کر سفیر کے استقبال کو گیا۔ علی نے بے حد تکلف کیا۔ وہ اس شان سے استقبال کے لئے نکلا کہ اس کے پیچھے بوعلی رسول دار مع مرتبہ داروں اور سواروں کے تھا جب سفیر قریب شہر پہنچا تو تین صاحب بوالحسن کرخی ندیم، مظفر حاکم ندیم (جو عربی روانی سے بولتے تھے) اور دس سرہنگ ہزار منتخب سواروں کے ساتھ آئے اور وہ ۲۲ ذالحجہ یوم شنبہ کو خلیفہ کے ایلچی کو نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ شہر لائے۔ اسے محلہ سیدِ باقلی کے ایک آراستہ محل میں فروکش کیا گیا۔ اور مکلف دسترخوان بچھایا گیا

قرار پایا کہ بروز نوروز سفیر کی پذیرائی ہو۔ امیر ایک روز پیشتر ہی کوشک عبدالاعلیٰ پہنچ گئے۔ ۴۲۳ھ کا آغاز ہوا یعنی یکم محرم آیا۔ دن پنجشنبہ تھا۔ چار ہزار غلام علی الصباح راہوں پر کوشک کے دونوں طرف پرے باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ دو ہزار کلاہ دوشاخ سر پر رکھے۔ گراں پٹکے اور پرتلے باندھے۔ ہر غلام کے ہاتھ میں عصائے نقرہ۔ دو ہزار کلاہ چہار پر اوڑھے اور کیش (ترکش) اور پیٹی کسے اور شمشیر و شقا و تیر ہوائی اور میخ تنگ (موشان با کیش) کمر پر کسے ہر غلام کمان اور تین چار تیر ہاتھ میں لئے۔ دیبائے شستری کی قبائیں پہنے۔ تین سو غلامان خاصہ امیر کے قریب صفہ (چبوترہ) کے رستوں پر جامہ ہائے فاخرہ پہنے کلاہ ہائے دو شاخ اوڑھے اور زریں پٹکے باندھے زریں عمود ہاتھ میں لئے۔ کچھ کمرہائے مرصع پر جواہر باندھے کھڑے تھے۔ پانسو سالار سرور دروازے پر سرائے دیلماں کے درمیان ایستادہ تھے۔ تمام اعیان درگاہ ولایت دار اور حاجب کلاہ ہائے دوشاخ اوڑھے۔ کمر زر باندھے۔ حاضر دربار تھے۔ دروازے کے باہر مرتبہ دار متعین تھے۔ نیز بہت سے ہاتھی مع نشانات موجود تھے۔

ایلچی اس کوکبہ میں سے ہو کر گزرا۔ رسول دار سفیر کو سواروں اور ایک انبوہ کے ساتھ لایا۔ اور دربار میں بٹھایا۔ بوق کوس، دہل اور کاسۂ پیل کی آواز بلند ہوئی۔ ایلچی یہ تکلفات دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے ایسی شان و شوکت کبھی کا ہے کو دیکھی تھی۔ امیر تخت پر جلوہ فرما تھا۔ سفیر نے صفہ کے سامنے کھڑے ہو کر سلام کیا۔ خواجہ

بزرگ احمد حسین نے جواب سلام دیا۔ خواجہ اور امیر کے سوا سب کھڑے تھے۔ یوسف حاجب نے ایلچی کو سہارا دے کر بٹھایا۔

اس وقت امیر سفیر سے بہ آواز بلند بولے۔ تم نے حضرت امیر المومنین کو کس حالت میں چھوڑا۔ ایلچی نے جواب دیا۔ اللہ تعالیٰ سلطان المعظم کو مطلع فرمائے کہ امام القادر باللہ امیر المومنین انار اللہ برہانہٗ کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون سخت سانحہ ہے۔ ایزد پاک خلیفہ مغفور کو فردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ اور خداوند دین و دنیا امیر المومنین کو باقی رکھے۔

اب خواجہ بزرگ نے اس مسئلہ پر ایک نہایت عمدہ تقریر کی۔ اس کے بعد سفیر کی طرف خط پیش کرنے کا اشارہ کیا۔ ایلچی کھڑا ہوا۔ خط دیبائے سیاہ کے خریطہ میں تھا۔ وہ اسے تخت کے سامنے لے گیا۔ اور خط امیر کے ہاتھوں میں دیکر واپس آیا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

امیر نے خواجہ ابوالنصر کو آواز دی۔ وہ تخت کے روبرو حاضر ہوا۔ اور خط لیکر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر تخت کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ خریطہ کھولا اور خط پڑھکر سنایا یہ عربی زبان میں تھا۔

امیر بولے اس کا ترجمہ بھی سناؤ۔ تاکہ سب سمجھیں۔ اس نے ترجمہ ایسی روانی اور صفائی کے ساتھ سنایا کہ سب حیران رہ گئے۔ اس کے بعد سفیر باحترام تمام قیام گاہ کو واپس کیا گیا اور اس کی خاطر و مدارات خوب ہوتی رہی۔

اب امیر نے ماتم داری کا سامان کیا۔ جب وہ دوسرے دن دربار میں آیا تو اس کی قبا نیز دستار سیاہ تھی۔ تمام والی حشم اور تاجیک ماتم پرسی کے لئے آتے۔ ایلچی بھی بلایا گیا۔ اس نے ماتم داری کے لوازم بچشم خود دیکھے۔ بازار بند کئے گئے۔ رعایا کے لوگ جوق جوق آتے تھے سفیر بھی ہر روز آتا تھا۔ اور چاشت کے وقت رجب امیر دربار سے چلا جاتا تھا) واپس چلا آتا تھا۔ تین دن اسی حالت میں گزرے اور چوتھے روز لوگ بازار میں آئے۔ کچہریاں کھلیں۔ اور ڈہل اور دمامے بجنے لگے۔

امیر نے خواجہ علی سے کہا کہ عیدگاہ سے لے کر مسجد جامع تک قبے بنائے جائیں۔ نیز ہر ممکن تکلف کیا جائے۔ اس کی تعمیل ہوئی۔ دوشنبہ سے لے کر پنجشنبہ تک خوب آرائش ہوتی رہی۔ چنانچہ بلخ کو درعبد الاعلیٰ سے لے کر جامع مسجد تک اس قدر آراستہ کیا گیا جس کی نظیر تاریخ غزنی میں نہیں ملتی۔ بے شمار قبے بازار میں عبد الاعلیٰ تک اور وہاں سے درگاہ سلطان اور محتشمان بارگاہ کے محلوں تک بنے ہوئے تھے۔

جمعہ کو دربار ہوا۔ خاتمہ کے قریب خواجہ علی نے آرائش کی اطلاع دی اور دیگر احکام طلب کئے۔ امیر نے فرمایا کہ "لوگوں کو ہدایت کردو کہ وہ اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہیں مگر اپنے قبول اور سامان کا خیال رکھیں۔ ہمارے گزرتے وقت لہو ولعب اور راگ رنگ بند کر دیا جائے۔ ہاں گزر جانے کے بعد اجازت ہے ہم نماز پڑھ کر دوسری طرف شارستان ہوتے ہوئے باغ میں پہنچ جائیں گے

خواجہ نے احکام جاری کئے۔ سپاہ جیوش روانہ ہوئے۔ اور سب لوگوں سے تحریری وعدے لے لئے۔ امیر بوقت چاشت روانہ ہوا۔ چار ہزار غلام مذکورہ بالا زیب و زینت کے ساتھ پیادہ با وردی اس کے آگے تھے۔ سالار بکتغدی پیچھے تھا۔ غلامان خاصہ، اس کے بعد سلطانی نشان اور مرتبہ دار اور حاجب آگے آگے۔ حاجب بزرگ بلکاتگین پیچھے۔ سلطان کے پیچھے خواجہ بزرگ اور خواجگان داعیان درگاہ۔ خواجہ کے پیچھے خواجہ علی میکائیل۔ قاضی۔ فقیہہ علما، زعیم اور اعیان بلخ تھے۔ خلیفہ کا سفیر۔ علی میکائیل کے دہنے ہاتھ پر تھا۔

امیر اس ترتیب کے ساتھ نہایت آہستہ آہستہ مسجد جامع پہنچا۔ بجز مرتبہ داروں کی آہٹ اور نیز وزرا کے کوئی دوسری آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

امیر مسجد کے قریب سواری سے اترا۔ اور ممبر کے نیچے جا بیٹھا۔ ممبر پر اوپر سے نیچے تک دیبائے زربفت پڑا تھا۔ خواجہ بزرگ سپہ سالاران وزراء امرا طبیب گیو علی میکائیل اور سفیر کچھ فاصلے پر بیٹھے۔ خطیب نے خطبہ اور نماز پڑھی۔ اس کے بعد سلطانی خزانچی آئے۔ اور انھوں نے حریر کی پانچ تھیلیاں لاکر منبر کے نیچے رکھ دیں۔ ان کے اندر دس ہزار دینار تھے۔ یہ خلیفہ کے لئے نذر تھی۔ اس کے بعد خداوند زادوں امیروں، فرزندوں، خواجہ بزرگ اور حاجب بزرگ کی نذریں آئیں۔ اس کے بعد دوسرے لوگوں کی۔ آواز دیتے جاتے تھے کہ یہ نثار فلاں اور یہ نثار فلاں۔ اور رکھتے جاتے تھے۔

جب یہ سلسلہ ادا کر کے ختم ہوا۔ تو امیر اٹھا اور سوار ہو کر مع غلاموں، لشکر اور امرائے دربار کے شارستان کے نیچے باغ کی طرف روانہ ہوا۔ خواجہ بزرگ ہمرکاب تھا۔ خزانچی۔ دبیران خزانہ اور مستوفی نذریں براہ بازار خزانے کو لے گئے۔ خواجہ علی میکائیل مع سفیر کے بازار سے گزرا۔ بلخ کے لوگوں نے خوب خوشیاں منائیں اور بہت سے برتن نیز طرح طرح کی اشیا نثار کیں۔ در عبدالاعلیٰ تک پہنچتے پہنچتے نماز مغرب کا وقت ہو گیا۔

علی سفیر کو دوسرے رستہ سے اس کوکبہ کے ساتھ اپنے مکان پر لے گیا۔ خوب خاطر و مدارات کی۔ دعوت نہایت مکلف ہوئی۔ اس کے بعد سفیر اپنی قیامگاہ کو گیا۔ امیران خبروں سے بہت خوش ہوئے۔

امیر نے دوسرے روز خواجہ ابونصر مشکان کو حکم دیا کہ خواجہ بزرگ کے پاس جاؤ اور خلیفہ سے عہد و پیمان کرنے اور سفیر کی واپسی کی تدبیر کرو۔

بونصر دیوان وزارت پہنچا۔ خلوت ہوئی۔ سفیر طلب ہوا۔ بعد طویل گفتگو یہ معاملہ طے ہوا۔

(۱) قرار پایا کہ امیر بغدادی مشورہ کے مطابق عہد و پیمان کریں گے اور جب یہ عہد نامہ بغداد پہنچے گا۔ تو خلیفہ ایک نیا منشور امیر کے پاس روانہ کریگا اور اس منشور میں خراسان۔ خوارزم۔ نیم روز۔ زابلستان۔ تمام ہند، سندھ چغانیاں۔ ختلان۔ قبادیان۔ ترمذ۔ قصدار۔ مکران۔ والستان۔ گیگانان۔ رے

جبال۔ اصفہان۔ حلوان۔ گرگان۔ طبرستان کے تمام علاقے امیر مسعود کے نام لکھ دیئے جائیں۔

(۲) خلیفہ خاقان ترکستان سے خط و کتابت نہ کریں۔ نہ انہیں انعام و خلعت دیں۔ بلکہ حسب معاہدہ سابق (مابین خلیفہ القادر باللہ و امیر محمود) ان لوگوں کے پاس امیر مسعود کے توسل کے بغیر کوئی خلعت نہ بھیجا جائے۔

(۳) یہ بھی قرار پایا کہ یہی سفیر (سلیمانی) یہ خدمات انجام دے کر واپس آئے اور اپنے ساتھ امیر المومنین کا ایک ایسا اعلیٰ خلعت لائے جو اب تک کسی کو نہ عطا ہوا ہو۔

(۴) سفیر ایک اجازت نامہ بھی لائے کہ امیر کرمان پر براہ سیستان حملہ آور ہو سکے۔ نیز کرمان سے عمان پر اور قرامطہ کو مغلوب کیا جائے۔

سفیر کو بتایا گیا کہ لشکر بے قیاس جمع کیا جا چکا ہے اور توسیع سلطنت ضروری ہے۔ پس لشکر کو کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے۔

امیر نے یہ بھی کہا کہ اگر درگاہ خلافت کی حرمت مدنظر نہ ہوتی تو یقیناً قصد بغداد کیا جاتا۔ تاکہ حج کا رستہ کھل جاتا۔ پدر بزرگوار نے ہمیں اسی خدمت پر مامور کیا تھا اگر ہمیں رَے۔ خراسان سے چلے آنے کی ضرورت پیش نہ آجاتی تو آج ہم مصر یا شام میں ہوتے۔ ہمارے فرزند مستعد ہیں اور کوئی نہ کوئی کام ان کے حوالے ہونا چاہیئے! آل بویہ کے ساتھ ہمارے دوستانہ تعلقات ہیں اس لئے

ہم انہیں تکلیف پہنچانا نہیں چاہتے۔ تاہم زیادہ ہوشیار رہنا۔ حرمت خلافت ملحوظ رکھنا اور راہ حج کھلا رکھنا ان کا فرض ہے۔

اس کے بعد امیر نے کہا کہ ہم نے اپنی سلطنت کے مسلمانوں کو حکم دیدیا ہے کہ وہ حج کے لئے تیار ہوں۔ ان کے ساتھ ہمارا ایک سالار حج جائیگا۔ پس ہم اس وقت اتمام حجت کرتے ہیں۔ اگر اس معاملہ میں کوشش نہ ہوئی تو ہم خود سعی کریں گے۔ ورنہ خدا تعالیٰ ہم سے مواخذہ کریگا۔ کہ ہم نے باوجود قوت کے اپنا یہ فرض ادا نہیں کیا۔

سفیر نے تسلیم کیا اور سندًا ان امور کی یادداشت مانگی۔ جو اس کے حوالے کی گئی۔ اور اس کے بعد اسے رخصت کر دیا گیا۔ بونصر نے امیر کو اس کارروائی کی اطلاع دی۔ اور وہ بہت خوش ہوا۔

امیر نے ۱۵ محرم کو اعیان بلخ، فقہا اور سادات کو بلایا۔ یہ لوگ بعد دربار امیر کے روبرو پیش ہوئے۔ علی میکائیل بھی آیا۔ اور سفیر بھی رسولدار کے ساتھ آیا خواجہ بزرگ عارض۔ بونصر مشکان۔ حاجب بزرگ۔ بلگاتگیں اور حاجب بکتغدی بھی موجود تھے۔ بونصر نے بیعت نامہ اور حلف نامہ (سوگند نامہ) کا ترجمہ نہایت خوب کیا تھا۔ عربی نسخہ سفیر کو دیا گیا۔ کہ وہ مقابلہ کرتا جائے۔ فارسی ترجمہ بونصر نے باآواز بلند پڑھا۔ حاضرین نے بغور سنا۔ جسے سن کر سفیر بولا۔ عین اللہ علی الشیخ (خدا شیخ کو اپنی حفاظت میں رکھے) یہ ترجمہ بالکل عربی کے مطابق ہے۔ میں حضرت

امیر المومنین سے یہی عرض کر دوں گا۔

اس کے بعد بونصر نے عربی عہدنامہ پڑھکر سنایا۔ امیر بولے ریں نے سن لیا اور سمجھ لیا۔ فارسی نسخہ مجھے دیدو۔ وہ بونصر نے امیر کے حوالے کیا۔ جسے امیر نے پڑھا۔ اور نہایت روانی کے ساتھ۔ اس کے بعد دوات خاصہ پیش ہوئی اور امیر نے بغداد سے آئے ہوئے عربی عہدنامہ نیز بونصر کے ترجمہ پر اپنے قلم سے کچھ عبارت لکھی۔ دوسری دوات دیوان رسالت سے لاکر رکھی گئی۔ خواجہ بزرگ اور حاضرین نے شہادتیں تحریر کیں۔ مگر سالار بکتغدی لکھنا نہیں جانتا تھا اس لئے اس کی طرف سے بونصر نے لکھا

اب سفیر اور اہل بلخ کو رخصت کر دیا گیا۔ حاجب بھی وہاں سے چلے گئے بس امیر اور تین شخص وہاں رہ گئے۔ ان لوگوں نے مشورہ کیا کہ خلیفہ کو کیا کیا تحفے بھیجے جائیں۔

سفیر ۲ محرم روز شنبہ کو پھر دربار میں لایا گیا۔ امیر نے اسے خلعت فاخرہ معہ استر (جس میں پانسو مثقال سونا لگا ہوا تھا اور جو خلعت فقہا کی مانند تھا) اور دو گھوڑے عنایت کئے۔ اس کے علاوہ اسے لاکھ درہم اور بیس جامہ قیمتی مع استر اور رحل اور برقعہ بھی دئے گئے۔ نیز پانسو دینار اور دس تھان خواجہ بزرگ نے اپنی طرف سے دئے۔ سفیر دربار سے رخصت ہوا۔ بونصر نے خلیفہ کے خط کا جواب رسولدار کے ہاتھ سفیر کو بھجوایا۔ یہ خط تاریخ مصنف بیہقی کے قلم کا لکھا ہوا تھا اور

خواجہ بزرگ نے حسب ذیل اموال واجناس خلیفہ کے لئے سفیر کی قیامگاہ پر بھجوایا۔

(۱) ہر قسم کے قیمتی کپڑوں کے سو تھان۔ جن میں سے دس زربفت کے تھے

(۲) نافہ ہائے مشک پچاس

(۳) شمامۂ کافور ایک سو۔

(۴) ریشمی تھان ہر قسم اعلیٰ دو سو گز

(۵) تیغ ہندی پچاس

(۶) جام زریں ایک۔ جس کا وزن ہزار مثقال تھا اور جو موتیوں سے پُر تھا۔

(۷) پارۂ یاقوت سُرخ دس

(۸) لال بدخشاں قسم اعلیٰ بیس

(۹) خراسانی۔ ختلی (بدخشانی) گھوڑے مع جھول و برقعہ دیبا سے

(۱۰) ترکی غلام شائستہ پانچ۔

سفیر خلیفہ ۲۲ر محرم روز پنجشنبہ کو بلخ سے روانہ ہوا۔ پانچ قاصد اس کے ہمراہ بھیجے گئے۔ تاکہ وہ ایک ایک اخبار تازہ کے ساتھ رستے ہی سے واپس آئیں اور باقی دو آدمی واقعات بغداد معلوم کر کے پلٹیں۔

کچھ مخبر مسافروں اور امیروں کی جماعت میں پوشیدہ طور پر بھیجے گئے۔ تاکہ وہ واپس آکر امیر کو قاصدوں کے حالات سے مطلع کریں۔ سفیر جن جن شہروں سے گزرنے والا تھا۔ امیر نے ان کو مراسلات بھیجکر اس کی خاطر تواضع کرنے کے

احکام جاری کئے - اور اس بارہ میں نہایت اہتمام کیا۔

کچھ روز بعد وہی سفیر (سلیمانی) بغداد سے بلخ کی طرف روانہ ہوا۔ امیر کے حکم سے رتے میں اس کا شاندار استقبال ہوا۔ ایک ہفتہ وہاں قیام کیا۔ سفیر ۸ ربیع الآخر کو نیشاپور آ پہنچا۔ عمائدین نے نہایت شاندار استقبال کیا۔ ایک ہفتہ بعد باغ شادیاخ کے دروازے سے ایلچی کی قیام گاہ تک ایک جلوس کا اہتمام کیا گیا۔ تمام لشکر - اعیان - اور سرہنگ سوار تھے - جن کے ہاتھوں میں نشان تھے پیادے کل ہتھیار لگائے سواروں کے آگے کھڑے تھے۔ مرتبہ دار دو رویہ ایستادہ تھے ۔ امیر صفہ میں تخت پر متمکن تھا ۔ رسولدار کے ہمراہ سالار اور حاجب کلاہ ہائے دوشاخ اوڑھے ہوئے تھے ۔ ہر طرف شان و شوکت نظر آتی تھی - حاجب چند سپہ دار، پردہ دار ، سپر کش ، سوار اور بیس اونٹ علی العباج خلعت لانے کے لئے ایلچی کی قیام گاہ پر پہنچ گئے تھے ۔

ایلچی کے ساتھ خلیفہ کا ایک خادم خاص بھی آیا تھا۔ پس ان دونوں کو محمل میں بٹھایا گیا - نیز خلیفہ کی خلعتوں کو اونٹوں پر بار کیا ۔ شاگرد پیشہ تحفہ تحائف سروں پر رکھے ۔ آٹھ گھوڑے زین اور سنہری ساز و سامان کے ساتھ سونے کے نعل پیروں میں جڑے - آگے آگے نشان ایک سوار کے ہاتھ میں اور منشور، اور نامہ دیبائے سیاہ میں لپٹا ہوا دوسرے سوار کے ہاتھ میں ایلچی کے آگے آگے حاجب اور مرتبہ داران سب سے آگے ۔ یہ جلوس اسی ترتیب سے روانہ ہوا ۔

بوق دہل کی آواز بلند ہوئی۔ بلا کا شور و غل ہوا۔ تمام سامان لشکر، ہاتھیوں کے جلوس کے ساتھ پیچھے سے آرہا تھا۔

ایلچی اور خادم کو دہلیز پر اتار کر امیر کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے سلطان کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ خادم نے زمین چومی۔ اور اب وہ دونوں کھڑے ہوگئے۔ امیر اُن سے مخاطب ہوئے۔ تم نے خداوند ولی نعمت امیر المومنین کو کس حال میں چھوڑا؟ سفیر نے جواباً کہا: "تندرستی اور شادمانی کے ساتھ"

پھر بولا: "تمام کام کامیاب! رکن خلافت، سلطان المعظم کی عمر دراز ہو۔ حضرت خلیفہ آپ سے خوش ہیں"۔

اب حاجب ابو النصر نے ایلچی کا بازو پکڑا۔ اور صفہ کے درمیان تخت کے نزدیک بٹھا دیا۔ ایلچی بولا: "خداوند کی حیات دراز ہو۔ میں جب حضرت خلافت میں پہنچا۔ اور سلطان کی اطاعت اور فرمانبرداری کا حال مجلس عاملہ میں بیان کیا۔ اور القادر باللہ کی تعزیت اور امیر المومنین کی تخت نشینی کی تہنیت بجا لانے، خطبہ پڑھنے، نیز شرائط بیعت بجا لانے کی کیفیت بیان کی تو امیر المومنین نے (جیسا کہ اس کی ہمت بلند کے سزاوار تھا) مجھے سلطان کی خدمت میں مکرر بھیجا۔ پھر امیر المومنین نے دربار عام کیا۔ جو امیر خلیفہ کے سامنے حاضر ہوتا تھا، حضرت اس کے روبرو سلطان کی تعریف کرتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ آج ہمارا بزرگ تر اور قوی تر حکم ناصر دین اللہ حافظ بلاد اللہ المستقیم من اعداء اللہ ابو سعید مسعود ہے

اور حضرت نے اسی مجلس میں حضرت سلطان کے نام ملک ہائے موروث و مکتسب اور نو مفتوحہ علاقے عطا کرنے کا منشور تحریر کرنے کے احکام جاری کئے۔ اور دوات طلب فرما کر توقیع کو خط عالی سے آراستہ کیا۔ اور لفظ عالی سے مبارکباد دی۔ نیز مہر لگانے اور خط کو خادم دعا کے حوالے کرنے کا حکم دیا پھر نشان طلب فرمایا اور اسے دست خاص سے باندھا۔ طوق۔ کمر۔ کنگن اور تاج بھی منگائے۔ اور خود ہر ایک چیز میرے حوالے کی۔ اور دعا فرمائی کہ خدائے بزرگ و برتر مبارک کرے!

اس کے بعد سلے ہوئے کپڑے طلب فرما کر اس باب میں ایسی باتیں فرمائیں جو باعث فخر ہیں۔ اسی قسم کی باتیں ان گھوڑوں کے پیش ہوتے وقت (جو خاصہ سے ان چیزوں کے بعد لائے گئے) ارشاد فرمائیں۔ بعدازاں جب عمامہ اور شمشیر پیش ہوئے تو حضرت امیر المومنین نے فرمایا کہ یہ عمامہ (جو ہاتھ کا بندھا ہوا ہے) اسی طرح سے ناصر دین کو دیا جائے۔ اور وہ اسی طرح سے اپنے سر پر رکھے۔ تاج کے بعد تلوار کھینچی۔ اور فرمایا کہ ناصر دین زنادقہ اور قرامطہ کو مغلوب کرے اور اپنے باپ یمین الدولہ والدین کی سنت پیش نگاہ رکھے اور اس تلوار سے ممالک دشمن فتح کرے۔"

یہ سن کر امیر نے ابونصر کی جانب اشارہ کیا۔ وہ صف سے باہر نکلا اور سفیر سے عربی میں کہا، وہ فوراً کھڑا ہو گیا، اور منشور جو دیبائے سیاہ میں ملفوف تھا

امیر کے سامنے تخت پر رکھ دیا۔ اور بونصیر اسے اٹھا کر ایک طرف آکھڑا ہوا

ایلچی بولا اگر رائے ہو تو تخت سے نیچے تشریف لے آئیے تاکہ حضرت

کو خلعت پہنایا جائے۔ پھر بولا۔ مصلے بچھاؤ! مصلے سلاح دار کے پاس تھا

اس نے فوراً بچھا دیا۔ امیر روبقبلہ ہوا۔ باغ میں بوق زریں بجنے لگے۔ دوسرے

باجے بھی بجے۔ دروازہ پر کوس بجنے لگا۔ آئینہ پیل کو جنبش ہوئی۔ بلکاتگین اور

دیگر حاجب دوڑے۔ انھوں نے امیر کے بازو کو سہارا دیکر اسے تخت سے اتارا

اور مصلے پر بٹھا دیا۔ سفیر نے خلعت کے صندوق منگائے۔ سات پیراہن نکلے۔

ایک دیبائے سیاہ کا اور باقی بھی قیمتی کپڑوں کے تھے۔ امیر نے بوسہ دیا اور دو

رکعت نماز پڑھی۔

اب امیر تخت پر گئے۔ تاج مرصع بجواہر، طوق اور مرصع کنگن پیش کئے گئے

سب نے بوسہ دیا اور تخت پر امیر کے دہنے ہاتھ پر رکھ دیا۔ خادم بندھا ہوا عمامہ سلطان

کے سامنے لے گیا۔ امیر نے بوسہ دیا اور کلاہ اتار کر عمامہ سر پر رکھا۔ اور نشان سیدھے

ہاتھ میں لیا۔ شمشیر حمائل کی اور اسے بوسہ دیکر پہلو پر رکھا۔ اس پر لوگوں نے تکبیر کہنی شروع

کی۔ تمام صفہ زریں ہوگیا۔ اور صحن چمن کیسہائے سیم کی وجہ سے سیمی بن گیا۔

ایلچی رخصت کیا گیا۔ اس وقت اس قدر خیرات ہوئی جس کی تفصیل دشوار ہے۔

ایلچی عصر کے وقت اپنی قیام گاہ پر پہنچا۔ اور خاص و عام اس تقریب سے مہینوں خوشیاں

مناتے رہے جس کی نظیر شاید دنیا میں نہ ملے۔

مہمات ہند

سرہند سلطان نے سنہ میں سرہند قلعہ سرستی پر فوج کشی کی اور بالآخر اسے تسخیر کر کے قبض و تصرف میں لایا۔ اس فوج کشی کا سبب یہ تھا کہ یہاں مسلم تاجروں کا مال اسباب لوٹ لیا اور ان کو قید کر لیا گیا تھا۔ سلطان نے بعد تسخیر قلعہ مسلم تاجروں کو آزاد کر دیا۔ اور تمام مال غنیمت انہیں کو دیدیا۔

قلعہ ہانسی غزنوی فوجیں مہم سرہند سے فارغ ہو کر بجانب مشرق بڑھیں اور کوچ کرتی کرتی قلعہ ہانسی کے قریب جا خیمہ انداز ہوئیں یہ قلعہ ایک مشہور اور مستحکم قلعہ تھا۔ اور دور دور نزدیک اس کے ناممکن التسخیر ہونے کے افسانے مشہور تھے۔ اور کوئی مسلمان حملہ آور بھی یہاں تک نہیں پہنچا تھا۔ جب غزنویوں نے محاصرہ شروع کیا تو ہندو سردار قلعہ کے باہر آ کر بھی داد شجاعت دیتے رہے۔ مقابلہ نہایت سرگرمی سے شروع ہوا۔ اہل قلعہ نے شجاعت کے اعلیٰ جوہر دکھائے ایک روز تو ہندو فوج نے خوفناک جرأت سے کام لیا۔ غزنوی فوج مصروف نماز تھی کہ ان لوگوں نے دفعتاً حملہ کر کے بہت سے مسلمانوں کو مولی گاجر کی طرح کاٹ کر رکھ دیا لیکن اس کا کوئی اہم نتیجہ نہیں نکلا۔ مقابلہ پھر شروع ہوا۔ جنگ برابر جاری رہی حتیٰ کہ چھ روز بعد مسلمانوں نے قلعہ تسخیر کر لیا۔ ہندو سپاہی آخر دم تک لڑتے رہے۔ جن لوگوں نے ہتھیار رکھ دئے۔ انہیں امان دی گئی ۔

قلعہ سونی پت

ہانسی کی تسخیر کے بعد غزنوی بہادر یلغار کرتے ہوئے سونی پت جا پہنچے۔ یہ ایک مضبوط ریاست تھی۔ راجہ دیپال ہر یاں کا راجہ تھا۔ اس وقت دہلی ناقابل التفات تھی۔ اور سونی پت کی ریاست شہرت رکھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان مسعود سونی پت پر حملہ آور ہوا اور دہلی کو ناقابل التفات سمجھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ سلطان محمود نے بھی دہلی پر کوئی حملہ نہیں کیا۔ اس سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے۔ اس وقت اگر دہلی کوئی ریاست تھی تو چھوٹی سی یعنی ناقابل التفات اور غیر مشہور

ہندو فوج مقابلہ پر آئی تو مگر بے دلی کے ساتھ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ بہت سی کھیت رہی۔ باقی بہادران غزنی کے ہاتھوں اسیر ہوئی۔ راجہ قسمت کو برسر یاری نہ دیکھکر جنگل میں روپوش ہوگیا۔

سونی پت میں ایک عظیم الشان بت خانہ تھا۔ سلطان مسعود اور اس کے رفیق مجاہدین نے بت توڑ کر اپنا قومی فرض ادا کیا

رام راجہ کی اطاعت

غزنوی فوجیں مہم سونی پت سے فارغ ہوکر راجہ رام کے کوہستانی علاقہ پر حملہ آور ہوئیں۔ ریاست کوہستان سہالہ میں واقع تھی۔ راجہ رام نے اپنے میں قوت مقابلہ نہ دیکھکر اور حملہ آوروں سے مرعوب ہوکر سر نیاز جھکایا۔ اور زرخطیر بطور نذرانہ سلطان کی خدمت میں پیش کرکے فدویانہ حاضر ہوا۔ اور خراج

کے وعدے پر طالب امان ہوا۔ جسے سلطان نے پسند فرمایا۔

ان مہمات کے حسن اختتام کو پہنچتے پہنچتے موسم گرما کا آغاز ہو گیا۔ اب غزنویوں کا یہاں ٹھہرنا تکلف و تکلیف سے خالی نہ تھا۔ دوسرے عین اسی وقت سلطان کو فتنہ سلاجقی کی اطلاع ملی۔ لہٰذا اب واپسی کا عزم کیا گیا۔

سلطان مسعود نے اپنے فرزند شہزادہ ابوالمجد کو لاہور کی حکومت پر مامور کیا اور خواجہ ایاز کو اس کا اتالیق و مشیر سلطنت مقرر کیا۔

اہل غور

یہ مذکور ہو چکا ہے۔ کہ غوریوں نے کوہستان غور میں کس طرح آزاد خودمختار ریاست و حکومت کی بنا ڈالی۔ پھر یہ بھی معرض تحریر میں آیا کہ سلطان محمود غازی نے اپنے عہد میں کس طرح سے زیر کیا۔

غوریوں نے عہد مسعودی میں پھر سر اٹھایا۔ اندرون ملک سے ایک فتنہ پیدا ہوا۔ ابوعلی حاکم غور کے بھتیجے عباس بن شیث نے اُسے (ابوعلی کو) تہ تیغ کر کے حکومت خود سنبھال لی۔ اور چونکہ دولت غزنویہ زوال پذیر ہو چکی تھی۔ لہٰذا اس کی ماتحتی سے اپنے آپ کو آزاد و خودمختار بنایا۔ وہ دولت غزنویہ کا سخت ترین دشمن تھا۔ اور نہایت ظلم و جبر کے ساتھ حکومت شروع کی۔

واقعہ شہادت

فتنۂ سلاجیق کی تفصیل اور اس میں سلطان مسعود کی ناکامی کی تفصیل اوپر گزری۔ یہ بھی مذکور ہوا کہ اُمرائے غزنی کے تمرد اور باہمی نااتفاقی سے سلطان کی حکومت کامیاب حکومت نہ بن سکی۔ بہادروں اور سامانِ جنگ کی بھی قلت تھی۔ سلطان اپنے دشمنوں کی خاطر خواہ سرکوبی نہ کر سکا۔ لہذا اب اس نے عزم کیا کہ لاہور (ہندوستان) پہنچکر اور وہاں سے فوجی جمعیت لے کر غزنی کے دشمنوں سلاجیق وغیرہ کا قلع قمع کرے۔ اس کو کئی دوستدار ہندو راجگان سے امداد کی توقع تھی۔

سلطان نے معاملاتِ غزنی کا یہ انتظام کیا کہ اپنے فرزند کلاں امیر مودود کو بلخ کی حکومت پر مامور کیا۔ علیٰ ہذا القیاس شہزادہ ایزدیار کو حکومت غزنی اور امیر محمد کو ملتان کی حکومت سپرد کی۔ اور ان انتظامات سے فارغ ہوکر خود ہندوستان کی جانب کوچ کیا۔ اونٹوں پر بادشاہی خزانہ اور دیگر قیمتی ساز و سامان اس کے ہمراہ تھا۔ لاہور اس کی منزلِ مقصود تھی۔

سلطان مسعود معہ اپنے ہمراہیوں کے کوچ کرتا ہوا الواح راولپنڈی تک آپہنچا۔ لیکن جب وہ موضع مارگلہ کے قریب پہنچا تو یکایک اس کے ہمراہی غلاموں نے (زیادہ ہندو کم ترک) خزانہ لوٹنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ تمام زر و جواہر اپنے

قبضہ وتصرف میں کرلیا۔ غرض یہ ہوا کہ سلطان کے ہمراہی امرا اس واقعہ کو خاموشی سے دیکھا کئے۔ سلطان مسعود اپنے معزول نابینا بھائی (محمد) کو ہمراہ لایا تھا۔ یہ تقاضائے سیاست مطلب یہ تھا کہ اس کی غیر حاضری میں ناراض امرا محمد کو کہیں تخت غزنی پر نہ قابض کرادیں۔ لیکن اس کا ہمراہ لانا اور بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ سلطان کے ہمراہی غلاموں اور امرائے نے محمد کو آزاد کرکے اُسے اپنا سلطان بنایا۔ اور اب ان لوگوں نے سلطان مسعود کے خیمہ پر حملہ کردیا۔

سلطان مسعود کو فی الحال اس کے سوائے اور چارہ کار نہ تھا کہ سرائے مارگلہ میں قلعہ بند ہوجائے۔ چنانچہ اس نے یہی کیا۔ مگر امرا اور فوج نے اس کی رفاقت سے کانوں پر ہاتھ رکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان مسعود گرفتار کرکے نابینا بادشاہ محمد کے روبرو پیش کیا گیا اور آخر کار اسے ایک قلعہ میں نظر بندی کا حکم ہوا۔

سلطان مسعود زیادہ مدت اس حالت میں نہیں رہا۔ اس واقعہ کے چند ہی روز بعد احمد بن سلطان محمد۔ سلیمان بن یوسف سبکتگین اور ابن علی خوشاوند نے قید خانہ میں جاکر اسے خنجروں سے شہید کردیا۔ یہ واقعہ ۴۳۲ھ میں رونما ہوا۔ وہ دنیا میں ۴۴ سال رہا۔ تیرہ سال حکومت کی۔

علمی و مذہبی خدمات

دربار مسعودی بھی مثل دربار محمودی کے علما و فضلا کا مرکز بنا رہا۔ کیونکہ سلطان مسعود علم و فضل کا نہایت قدر دان تھا۔

ابوریحان خوارزمی (منجم) نے نجوم و ریاضی میں کتاب قانون مسعودی، علم ریاضی تصنیف کر کے سلطان کے اسم گرامی پر معنون کیں۔ جس کے صلے میں سلطان نے ایک فیل نقرہ ابوریحان کو عنایت کیا۔

قاضی ابو محمد ناصحی نے فقہ کی ایک عمدہ کتاب مدون کر کے اس کا نام فقہ مسعودی رکھا۔ سلطان نے سیر چشمی سے اس کی قدر دانی کی۔

سلطان مسعود نے اپنے زمانہ اقبال یعنی آغاز عہد میں ممالک محروسہ (خراسان ترکستان۔ افغانستان اور ہندوستان) میں اس قدر مدارس اور مساجد تعمیر کرائیں کہ ان کا شمار محالات سے ہے۔ اس زمانہ کے اُمرا نے بھی اس کی تقلید میں علمی و دینی خدمات میں غیر معمولی فیاضی دکھائی۔

لکھا ہے کہ سلطان بنفس نفیس اس قدر کریم النفس تھا کہ ایک روز میں ایک ایک لاکھ درم غربا اور مساکین میں تقسیم کرا دیتا تھا۔

ابوالفضل بیہقی | یہ عہد غزنوی کا مشہور مورخ ہے جو سنہ ۳۸۶ھ ۹۹۶ء

میں اس عالم آب وگل میں آیا۔ اور ۴۷۰ھ (۱۰۷۷ء) میں یعنی وفات مسعود سے سات سال بعد رہگرائے عالم عقبیٰ ہوا۔ ابو الفضل کی تاریخ مختلف ناموں سے شہرت پذیر ہوئی۔ مثلاً تاریخ بیہقی۔ تاریخ ناصری، تاریخ مسعودی۔

مصنف نے اس تاریخ میں ۴۰۹ھ (۱۰۱۸ء) سے لے کر آئندہ پچاس سال کے واقعات از عہد محمود یا زمانہ ابراہیم نہایت شرح اور بسط کے ساتھ لکھے تھے اور یہ ایک نہایت ضخیم کتاب تھی

میر خواند نے روضۃ الصفا میں لکھا ہے کہ یہ کتاب بیس جلدوں میں ہے۔ ... لکھا ہے کہ اس نے پنجاہ سالہ واقعات کئی ہزار صفحات میں تحریر کئے ہیں۔

لیکن افسوس کہ اس تاریخ کا بیشتر حصہ دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں رہا بلکہ تلف ہو گیا۔ صرف مسعود غزنوی کے عہد ۴۲۱ھ لغایۃ ۴۳۲ھ کے واقعات ملے جو ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے ۱۸۶۲ء میں شائع کئے۔

اس کتاب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخ نہایت بلند پایہ تصنیف تھی اور اس کا بیشتر حصہ ابو الفضل کا چشم دید تھا۔ اس لئے فارسی تاریخوں میں یہ تاریخ مستند اور دلچسپی کا مرکز ہے۔ جو سفارت خلیفہ القائم بامر اللہ کے زمانے میں غزنی آئی اور جس شان کے ساتھ اس کی پذیرائی ہوئی بیہقی نے اس میں نہایت تفصیلی حالات تحریر کئے ہیں جو اسی کتاب میں کسی دوسرے مقام پر درج ہیں:

سُلطان مودُودْ

سلطان مسعود نے اپنے فرزند شہزادہ مودود کو حکومت بلخ پر مامور کیا تھا۔ جب شہزادہ نے باپ کی شہادت کی خبر پائی تو فوراً غزنی آپہنچا فوج کثیر اس کے ہمرکاب تھی۔ سلطان محمد کی فوج سے ہنگامہ آرائی شروع ہوئی۔ دو روز تک میدان کشت وخون گرم رہا۔ بالآخر مودود غالب آیا۔ بدنصیب سلطان محمد۔ اس کا فرزند شہزادہ (جو سلطان مسعود کی قتل کی سازش میں شریک تھا) اور اس کی تمام ذریات و اُمرا جو اس کے معاون و مددگار اور شریک سازش قتل مسعودی تھے اسیر کئے گئے۔

سلطان محمد اور اس کی اولاد اور قاتلان سلطان مسعود (شہزادہ احمد بن سلطان محمد۔ سلیمان بن یوسف۔ ابن علی خویشاوند) کو تہ تیغ کیا گیا۔ بدنصیب محمد کی اولاد میں سے صرف ایک شہزادہ عبدالرحیم زندہ رہا۔

عبدالرحیم کی جان بخشی کا سبب تاریخ میں مذکور ہے۔ جب سلطان مسعود بقید حیات نظر بند تھا۔ تو شہزادگان عبدالرحیم اور عبدالرحمٰن (ابن سلطان محمد) بدنصیب سلطان سے ملنے گئے۔ کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن نے سلطان کے سر سے کلاہ اتار لی اور تمسخر آمیز گفتگو شروع کی۔ لیکن سعادتمند عبدالرحیم نے اس حرکت

پر بھائی کو ملامت کی۔ اور سلطان کا کلاہ اٹھا کر بہ ادب تمام سلطان کے سر پر رکھ دیا۔ اسی سلسلے میں شہزادہ عبدالرحیم کی جان بخشی کی گئی۔

ابونصر احمد فاضل اور فہمید وزیر اعظم تھا۔ سلطان نے اُسے نیز دیگر امرا کو معزول کیا۔ علاوہ ازیں بعض دیگر امرا معتوب یا مقتول ہوئے۔

سلجوقی سردار جعفر بیگ کی دختر سلطان مودود کے حبالۂ عقد میں آئی۔ گو اس تعلق کا فائدہ یہ سوچا ہوگا کہ جو کچھ دشمنی سے نہ ہو سکا وہ محبت سے کیا جائے دشمن کو گڑ دے کر مارا جائے۔ لیکن یہ منصوبہ کامیاب نہ ہوا۔ سلجوقی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے۔ اور ان کی تاخت و تاراج کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

طغرل دراصل سلطان محمود کا خانہ زاد ترک غلام۔ نہایت بے باک۔ بہادر اور دلیر آدمی تھا۔ سلطان مودود نے اسے خراسان میں جنرل مقرر کیا۔ یہ منچلی طبیعت کا آزادنش آدمی تھا۔ اور سلطان کا برادر نسبتی تھا۔ اس نے سلجوقیوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کئے۔ لہٰذا اس نے تمرد دکھایا۔ لیکن بالآخر باغی ہوکر اور سلطانی افواج سے شکست کھا کر سلجوقیوں کے پاس چلا گیا۔ اور ان لوگوں کے عادات و اطوار اور جذبات کا خوب مطالعہ کیا

یہ سچ ہے کہ سلطان مودود کی ذاتی شجاعت۔ مستعدی اور لیاقت نے غزنی کو سلجوقیوں کی دست برد سے بچایا۔ لیکن اس قسم کے تمام معرکے سلجوقیوں کے مقابلہ میں مدافعانہ تھے نہ کہ جارحانہ۔ مطلب تھا دارالخلافہ غزنی کو دشمنوں سے

بچانا۔ خراساں پر سلجوقی قابض ہو گئے۔ اور انہیں یہاں سے نکالنے میں سلطان مودود کو کامیابی نہیں ہوئی۔ بلکہ وہاں ترکوں کا شاہانہ تسلط قائم رہا۔

مہمات ہند پنجاب پشاور وغیرہ کا علاقہ سلطان محمد کے فرزند کے قبضے میں تھا۔ سلطان مودود نے اس پر لشکر کشی کی۔ دشمن کو زیر کیا اور ملک پر قبضہ کر لیا۔

اس وقت شہزادہ مجدود (بن سلطان مسعود) ملتان۔ سندھ۔ ہانسی تھانیسر میں حکومت کر رہا تھا۔ خواجہ ایاز اس کا وزیر تھا۔ اس وقت مجدود ہانسی میں مقیم تھا۔ اور دہلی کی ریاست پر حملے کی طیاری کر رہا تھا۔ کیونکہ مدت کی اطاعت گزاری سے منحرف ہو کر اور خراج بند کر کے اس ریاست نے اظہار تمرد کیا تھا اور اپنی طاقت کو بڑھانے کی فکر میں تھی۔ لیکن یہ مہم ناتمام رہی۔ کیونکہ شہزادہ مجدود کو فوراً ہانسی سے لاہور کی جانب کوچ کرنا پڑا۔ اور لشکر جرار سے قبل ہی روانہ کر دیا۔

بات یہ تھی کہ سلطان مودود کی طبیعت اپنے بھائی مجدود کی جانب سے صاف نہ تھی۔ اور یہ خود غزنوی فوج لے کر بھائی کے استیصال کے لئے لاہور آ پہنچا تھا۔ اس کے مقابلے کو مجدود بھاگوں بھاگ لاہور آیا۔

مجدود کا لشکر تعداد میں زیادہ تھا اور مودودی فوج میں کوئی خاص جوش نہ تھا۔ اس لئے وہ بے دل سی ہو رہی تھی۔ اور بے مقابلہ ہی واپسی پر تلی ہوئی تھی۔ علاوہ ازیں اکثر امرائے غزنی جو مودود کے طرز عمل کو مبنی بر تشدد

سمجھتے تھے اور انقلاب حکومت کے لئے تیار تھے۔ مجدود کی اطاعت پر آمادہ تھے۔ کہ ایک ناگہانی حادثہ پیش آیا۔ جس نے واقعات کا رُخ بدل دیا۔ ناگاہ شہزادہ مجدود عید اضحیٰ کی صبح کو اپنے خیمہ میں مُردہ پایا گیا۔ اس کی اصل حقیقت ظاہر نہ ہوئی۔ بحالات ظاہر ظن غالب یہی ہے۔ کہ شہزادہ مودود کی خفیہ سازش کا شکار ہوا۔

اس حادثہ کے کچھ مدت بعد وزیر خواجہ ایاز کا بھی لاہور میں انتقال ہو گیا۔ اس کا مزار لاہور میں موجود ہے۔

اب لاہور سے دہلی تک کے ہندوستانی علاقہ میں بے غل وغش سلطان مودود کا قبضہ وتصرف ہو گیا۔ اور گویا ہندوستانی فتوحات کا دروازہ کھل گیا۔ لیکن چونکہ سلطان سلجوقیوں کی وجہ سے غزنی سے زیادہ مدت تک غیر حاضر نہیں رہ سکتا تھا لہٰذا ہندوستان میں کوئی خاص مہم سر نہیں ہوئی۔

شہزادہ مجدود بذات خاص لاہور میں موجود تھا۔ خواجہ ایاز ایک تجربہ کار حکمران تھا۔ اس واسطے اہل ہند سر نہ اٹھا سکتے تھے۔ بلکہ ادائیگی خراج اور دیگر معمولات میں اظہار عقیدتمندی وہواخواہی کرتے رہتے تھے۔ گو وہ دفع الوقتی اور منافقت ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن جب نہ مجدود رہا اور نہ ایاز اور سلطان مودود کو بھی سلجوقی فتنہ کے دبانے کی غرض سے غزنی واپس چلا جانا پڑا۔ اور ہندو پنجاب کی حکومت صرف چند اُمرا کے غزنی کے ہاتھ میں رہ گئی۔ تو اہل ہند آب رفتہ کے واپس لانے

کی فکر میں پڑ گئے۔ یہ لوگ غزنویوں کے حالات سے بے خبر نہ تھے۔ اس لئے اس وقت کو اپنی کامیابی کے لئے برمحل سمجھا۔ راجہ دہلی اور قرب و جوار کے راجاؤں نے مشورہ کیا۔ حتیٰ کہ ۴۳۵ھ میں ہندو راجگان کی متفقہ افواج نے ہانسی اور تھانیسر پر کامیاب حملے کئے۔ اور غزنوی اُمرا کو بے دخل کر دیا۔ حتیٰ کہ ہانسی سے لے کر لاہور تک کا تمام علاقہ غزنویوں کے قبضے سے نکل گیا۔

ان واقعات کی اطلاع غزنی پہنچی تو سلطان مودود نے علی کوتوال کی ماتحتی میں افواج پنجاب بھیجیں۔ لیکن یہ سندھ اور پنجاب سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ البتہ انھوں نے پنجاب کے سرکشوں کی کافی گوشمالی کی۔

اسی زمانہ میں ایک ہندو ممتاز جنرل ہیمراے نے تمرد دکھایا۔ ہیمراے عہد محمودی کا ایک بہادر سپہ سالار تھا۔ اور عمدہ خدمات ادا کر چکا تھا۔ مگر سلطان مودود کے عہد میں وہ ناراض ہو کر غزنی سے چلا آیا۔ اور کوہستان کشمیر میں متمردانہ لبسر کرنے لگا۔ لیکن علی کوتوال نے اسے دم دلاسا دیکر اپنے پاس لاہور بلا لیا۔ پھر چند روز بعد غزنی روانہ کر دیا۔

سلطان مودود نے نہ صرف اس ہندو جنرل کا قصور معاف کر دیا۔ بلکہ بیشمار انعام واکرام دیکر اسے خوش کر دیا۔ حتیٰ کہ اس نے آئندہ زمانہ میں نہایت عقیدتمندانہ خدمات ادا کیں۔

یہ واقعہ بھی اہل ہند کے لئے خاص غور کے قابل ہے!

اگرچہ ہانسی سے لاہور تک علاقہ مسلمانوں کے قبضہ سے نکال لیا گیا تھا لیکن قلعہ نگر کوٹ تاحال مسلمانوں کے قبضے میں تھا۔ اور یہ امر اہل ہند کے لئے شاق تھا کہ نگر کوٹ جیسا مقدس مقام اب بھی مسلمانوں کے قبضے میں رہے۔ تاہم نگر کوٹ ایسی آسانی سے نہیں لیا جا سکتا تھا۔ جس طرح کہ ہانسی وغیرہ۔ اس لئے ہندوؤں کو اس کے لئے خاص اہتمام کرنا پڑا۔

"جب دولت غزنویہ میں انحطاط کا آغاز ہوا۔ اور اس سے غازی محمود جیسا کوئی اور فاتح نہ نکلا بلکہ آل محمود ہی میں باہم تلوار چلنے لگی تو زمانہ شناس ہندوؤں نے پہلو بدلا۔ اور غزنوی عقید تمندی کا جُوا اپنی گردن سے گرا کر اپنی گزشتہ عظمت اور بحالی سلطنت کے خواب دیکھنے لگے۔ ان کا سرغنہ راجہ دہلی تھا۔ اس لئے کہ پنجاب سے گزر کر اولاً اسلامی سیلاب کی زد دہلی پر پڑتی تھی۔ مدبر اور دور اندیش راجہ ہندوؤں کو غزنویوں کے خلاف متفق کرنے میں کامیاب ہوا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ بہادران اسلام اور سلاطین غزنی کے رعب و داب سے عام ہندو تاحال سخت مرعوب تھے۔ اس لئے راجہ دہلی کی تجاویز کامیاب نہ ہوتی تھیں۔ عام ہندو غزنویوں کے مقابلے سے دل چراتے اور راجہ کی رفاقت سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ میدانی علاقہ کو دشمنوں کے قبضہ سے نکال لینا چنداں دشوار نہ تھا۔ لیکن قلعہ نگر کوٹ کی تسخیر بوجہ اس کے کوہستانی اور دشوار گزار علاقہ میں واقع ہونے کے

مرعوب فوج کے لئے آسان نہ تھا۔لیکن دانشمندانہ تدابیر سیاست ایسے مواقع پر خوب کام دیا کرتی ہیں۔ اور کام لینے والے اس سے عین وقت پر کام لیا کرتے ہیں۔راجہ دہلی نے اپنے ایک مشہور مشیر برہمن سے اس بارۂ خاص میں مشورت کی۔ایک خواب مشہور کیا کہ نگر کوٹ کے دیوتا (جوالا مکھی) نے مجھ سے خواب میں کہا ہے کہ میں غزنی میں چند سال سے[1] اس لئے قیام پذیر تھا۔کہ دولت غزنویہ کو نقصان پہنچاؤں۔ اور اس حکومت پر زوال لاؤں۔ اولاد محمود کے دل میں نااتفاقی کا تخم بوؤں۔ اور اب یہ تمام کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے ہیں اس لئے میں اپنے عقیدتمند ہندوؤں کی امداد کے لئے عنقریب ہندوستان پہنچنے والا ہوں۔لہٰذا تم (راجہ) تمام ہنود کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ تمہارا ملک جو مسلمانوں نے دبا لیا ہے۔جلد بزور شمشیر ان سے واپس لے لو۔میرا وطن نگر کوٹ جلد دشمنوں سے خالی کراؤ۔کہ میں عنقریب اپنے قدیم گھر میں پہنچا چاہتا ہوں۔

یہ ہے مضمون خواب۔جو راجا نے مشہور کرایا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ عام ہندو اسے صحیح نہ سمجھتے۔کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ راجہ پرمیشر کا روپ (خدا بہ شکل انسان و معاذ اللہ) ہوتا ہے۔

---

[1] اس بت کے ٹکڑے بھی سلطان محمود غزنی لے گیا تھا۔ اور پامالی عوام کے لئے سرراہ ڈلوا دیا تھا۔

الغرض ہندوؤں میں ایک عام جوش پھیل گیا۔ ان لوگوں نے خیال کیا کہ اولاد محمود کے زوال کا باعث درحقیقت نگرکوٹ کا دیوتا ہے۔ جو عنقریب ہماری مدد کے لئے یہاں آیا چاہتا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس تدبیر سے دانشمند راجہ نے ہندوؤں میں دلیری کی روح پھونکی۔ اور مسلمانوں کے رعب کو ان کے دلوں سے زائل کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا (۴۳۵ھ) کہ ہندوؤں نے لاہور سے لے کر دہلی تک کا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ سے نکال لیا تھا۔ اور ان لوگوں نے چار ماہ سے قلعۂ نگرکوٹ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ لیکن بایں ہمہ یہ قلعہ تسخیر ہونے میں نہ آتا تھا۔ مسلمان قلعہ دار محصور ہو کر اب تک مقابلہ پر جما ہوا تھا۔ دراصل مذکورہ بالا خواب اسی مشکل پر غالب آنے کے لئے تصنیف کیا گیا تھا۔

راجہ نے اب اس تجویز کے دوسرے حصے پر عمل شروع کیا۔ اس نے نگرکوٹ کے اس بت کی ہم شبیہ (جسے محمود غزنی لے گیا تھا) ایک اور بت بنوایا۔ مگر نہایت مخفی طریق پر۔ اور ایک روز رات کو چپکے سے باغ میں رکھوا دیا۔ باغبان جو اس راز سے واقف تھا۔ راجہ کے پاس دوڑا ہوا گیا اور تمام ہنود کو دیوتا کی واپسی کی خوش خبری سنائی۔

راجہ بہت سی نذر بھینٹ لے کر سر و پا برہنہ دیوتا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ معزز درباری پنڈت برہمن اس کے ہمرکاب تھے۔ یہ جلوس باغ میں پہنچا

تو اُن لوگوں نے اپنے سر دیوتا کے قدموں پر ڈال دیئے۔ اور نہایت جوش و خروش اور عقیدتمندی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد راجہ نے کہا کہ مہاراج نے بڑی منزل طے کی ہے کہ ایک رات میں غزنی سے چل کر یہاں آپہنچے ہیں۔ وہ تھک گئے ہوں گے۔ اس لئے انہیں آرام کی ضرورت ہے۔ پس آج انہیں آرام کر لینے دو۔ کل درشنی (زیارتی) دربار عام کیا جائے گا۔

اگلے روز درشنی دربار ہوا۔ ہندوؤں کے دل جوش و خروش اور جذبات سے پُر تھے۔ راجہ۔ اہل دربار اور ان کی تقلید میں عام ہندوؤں نے زرِ نقدی نذر بھینٹ دیوتا پر اس قدر چڑھائی کہ سونے چاندی کا ڈھیر لگ گیا۔ اور اس نقد و جنس کا مصرف دشمنوں کی مدافعت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ گویا یہ کثیر رقم قومی جنگ کے لئے چندہ تھی جو ہندوؤں کو غزنویوں سے کرنی تھی۔ نذر و نیاز آچکی تو راجہ کے مشیر برہمن نے کھڑے ہو کر کہا کہ" دیوتا حکم دیتے ہیں کہ جلد میرے مکان کو دشمنوں سے خالی کراؤ! تاکہ میں اس میں جا کر پھر آباد ہوں"۔

یہ حکم سُن کر ہندوؤں کے دل جوش و خروش سے لبریز ہو گئے۔ اُسی وقت سے از سر نو فوجی طیاریاں ہونے لگیں۔ عام ہندوؤں نے اس قومی جنگ (جہاد) میں والنٹیر (مجاہدین) کی حیثیت سے حصہ لینے کا ارادہ کیا۔ اور آخر کار یہ پُرجوش سپاہ نہایت بے جگری سے قلعہ نگر کوٹ پر حملہ آور ہوئی۔ جس پر تا حال مسلمانوں کا قبضہ تھا۔

فی الحقیقت یہ حملہ نہایت دلیرانہ اور جاں بازانہ تھا۔ کہ مسلمان اس کی تاب نہ لا سکے۔ اور زیادہ مدت تک مدافعت نہ کر سکے۔ بالآخر ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہوئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ کہ مسلمانوں کی امداد کا سلسلہ لاہور سے منقطع ہو چکا تھا اور چار ماہ کے طویل محاصرہ و مقابلہ نے انہیں بُری طرح تھکا دیا تھا۔ لیکن مسلمانوں نے جلد ہی دوبارہ نگرکوٹ پر قبضہ کر لیا تفصیل آئندہ آئے گی

قلعہ نگرکوٹ پر ہندوؤں نے بزور شمشیر و تدابیر قبضہ کر لیا۔ غزنوی قلعہ دار طالب امان ہوا۔ اور صرف جان لے کر لاہور چلا گیا۔

اس غیر معمولی واقعہ سے نگرکوٹ کے دیوتا کی کرامات تمام ہندوستان میں مشہور ہو گئی۔ بچہ بچہ کی زبان پر اس کے افسانے تھے۔ مندر کی شان و شوکت کو چار چاند لگ گئے تھے۔ چنانچہ اب یہاں پیشتر سے بھی زیادہ ہندو زائرین (جاتری) آنے لگے تھے۔

یہ ایک کامیاب تدبیر تھی جس کے ذریعے ہندوؤں میں مذہبی روح پھونک کر ان میں قومی جوش پیدا کیا گیا۔ اور ان کے دلوں سے غزنویوں کا رعب نکالا گیا ایک موحد کے نقطۂ خیال سے اس قسم کا طرز عمل خواہ کتنا ہی معیوب اور قابل اعتراض ہو۔ لیکن اس کی ضروریات اس کے جواز کا فتویٰ دیتی ہیں۔ یہ باتیں ہندو قوم ہی سے مخصوص نہیں بلکہ ہر قوم ایسا ہی کیا کرتی ہے۔ اگرچہ اسلام کی تاریخ ایسے واقعات سے خالی ہے۔

ایک ہمعصر مسلم مورخ لکھتا ہے۔ کہ اس واقعہ سے جہاں ہندوستان کے پولٹیکل دماغوں، اور زمانہ و وقت کی ضرورت کے مطابق تدابیر سوچنے اور عوام ہند کے عام رجحان عقائد کا حال معلوم ہوتا ہے۔ وہاں یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ہندوستان میں عقیدہ اور مذہب کا لوگوں کے دلوں پر کس قدر اثر ہے اور جس مشکل کا حل کسی طرح نہ ہو سکے اس کا حل مذہبی روایات کی امداد سے ہو سکتا ہے۔ اس مورخ کی رائے ہے کہ ہندوستان میں پولٹیکل مشکلات کی دیوار خواہ کتنی ہی دبیز اور مضبوط کیوں نہ تعمیر کی جائے لیکن مذہبی روایات کا گزر اس میں رخنہ کر سکتا ہے۔ ہندو جب تک کہ خالص ہندو ہیں ان میں یہ طاقت باقی رہیگی اور وہ اس پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ ہندو قوم کے دور میں ایسی تدابیر سے کام لینے والے لیڈر ہمیشہ نکلتے رہے اور قوم کے مردہ و افسردہ جوش کو تازہ اور زندہ کرتے رہے ہیں۔

کیا یہ تمام باتیں صحیح اور امر واقعہ ہیں؟ اس کا جواب تاریخ ہند میں لکھنا چاہیے!

حملۂ لاہور

ہانسی۔ تھانیسر خصوصاً نگر کوٹ کی کامیابی سے ہندوؤں کے حوصلے بڑھ گئے۔ ہندو قوم نے اب اپنے آپ کو طاقتور اور اس قابل پایا کہ غزنویوں کو حکومت ہند سے بالکل خارج کر دیں۔ چنانچہ ان لوگوں نے لاہور پر حملہ کر کے مسلمانوں کی رہی سہی طاقت کو بھی پامال کر دینے کا عزم مصمم کیا اور زور شور سے طیاریاں کرنے لگے۔ چنانچہ پرجوش فوج یلغار

کرتی ہوئی لاہور کے قریب جا پہنچی۔ اس وقت لاہور کے مسلمانوں کی سیاسی عالت نہایت عجیب و غریب تھی خاص لاہور دو عملی نہیں بلکہ سہ عملی اور طوائف الملوکی کی بلا میں گرفتار تھا۔ یہاں تین مسلم سردار برسر حکومت۔ مگر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اور ہر ایک خود غرضی کا پتلا تو ایک دوسرے کے استیصال پر آمادہ تھا غالبًا یہ امر بھی ہندو راجگان کے لیئے محرک حملہ لاہور ہوا علاوہ ازیں دشمن واقف تھے کہ مسلمانوں کو غزنی سے کسی قسم کی امداد نہیں مل سکتی ہندو فوجیں سر پر جا پہنچیں تو مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں۔ اور وہ باوجود اختلاف و نفاق مشترک دشمنوں کی مزاحمت پر آمادہ ہو گئے۔ تینوں مسلم سرداروں نے جب دیکھا کہ ہم سب نہیں بلکہ دین اسلام پنجاب سے جلاوطن ہوا چاہتا ہے۔ تو آخر اسلامی حمیت اور قومی عزت نے ان کے دل میں جوش مارا۔ اور وہ باوجود ذاتی مخالفتوں کے ہندو فوج کے مقابلہ کے لیئے باہم متفق ہو گئے چنانچہ یہ سردار دس ہزار جان فروش مجاہدین کے ساتھ دشمنوں کے مقابلہ کو نکلے۔ ہندو فوج تعداد کے لحاظ سے مسلمانوں سے کئی گنی تھی۔ لیکن بایں ہمہ جب اسلامی فوجیں میدان میں آئیں تو ہندو فوجیں بلا مقابلہ ہی پسپا ہو گئیں ہندو راجگان واپس چلے گئے۔ اور یہ نہایت حیرت انگیز بات تھی۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمان مقابلہ کے لیئے نہایت جوش، جان بازی کے ساتھ گھر سے نکلے تھے۔ لیکن صرف اتنی بات ہندو راجگان کی واپسی کا

باعث نہیں ہو سکتی ۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ ہندو راجگان نے یہ سمجھا ہوگا ۔ کہ لاہور کے مسلم سردار متفق ہو کر مقابلہ نہ کر سکیں گے ۔ لیکن جب انھوں نے ان کی متفقہ طیاری کی داستان سُنی تو اپنے کو کامیاب نہ ہوتا دیکھکر بے مقابلہ ہی لپا ہو گئے ۔ اگرچہ تعداد کے لحاظ سے ان کی فوج کی تعداد زیادہ تھی ۔ لیکن یہ ایسی بات تھی ۔ . . . . کہ ہندوستان کے متعدد معرکوں میں قلیل التعداد دشمنوں پر غلبہ حاصل کیا گیا ۔ اور راجگان ہند اس سے ناواقف نہ تھے ۔

ان واقعات کے بعد بھی سلطان مودود کی فوجیں کئی بار پنجاب آئیں لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکیں کہ سرکشوں کو سزا دیں ۔ ہندو طاقت کا پامال کرنا ان کی طاقت سے باہر ثابت ہوا ۔

حقیقت یہ ہے کہ سلطان مودود کی توجہ زیادہ تر اندرونی معاملات کی جانب منعطف رہی ۔ سلجوقیوں کا فتنہ فتنۂ قیامت ثابت ہوا ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ۔ کہ سلطان کو بیرونی معاملات مثلاً ہندو پنجاب کی جانب التفات کرنے کی فرصت نہیں ملی ۔ ورنہ فتوحات ہند میں شک نہ تھا ۔

سلطان مودود نے ۴۴۱ھ میں بعمر ۲۹ سال وفات پائی ۔ نو سال حکومت کی ؛

سلطان علی ابن مسعود

سُلطان مرحوم (مودود) کے چار فرزند تھے۔ منصور۔ محمد۔ سلیمان اور محمود۔ لیکن ان میں سے کسی کو سلطنت نہیں پہنچی۔ بلکہ امرائے سلطنت نے اورنگ حکومت پر علی بن مسعود کو متمکن کیا۔ اور اس نے بہاء الدولہ کے خطاب سے حکومت کرنی شروع کی۔ ایک دوسرے مورخ کا بیان ہے۔ کہ امرائے غزنی نے علی بن مسعود اور محمد بن مودود کو مشترک سلطان بنایا اور اس طرح یہ دونوں چار سال تک حکومت کرتے رہے۔

اس میں شک نہیں کہ حکومت میں یہ ایک جدید اور عجیب تجویز تھی جس کی نظیر تاریخ میں ملنی دشوار ہے۔ لیکن اس کی علت غائی یہ تھی۔ کہ حقیقی معنوں میں سلطان ایک بھی نہ ہو۔ اور تمام سیاہ وسفید کے مالک امرائے سلطنت رہیں یہی کیفیت چار سال تک قائم رہی۔ کاروبار سلطنت میں نہ علی کو دخل و اختیار تھا۔ اور نہ محمد کو۔ امرائے دولت اپنا اپنا الو سیدھا کرتے رہے تھے۔ وزیر عبدالرزاق کی قوت زیادہ نمایاں تھی۔ یہ حالت بھی چار سال سے زیادہ قائم نہ رہ سکی۔ نظام حکومت درہم برہم ہوگیا۔ اب کیا تھا۔ انہی امرا نے دونوں سلطانوں کو معزول اور نظر بند کر کے عبدالرشید ابن سلطان محمود کو سلطان بنادیا حقیقت یہی ہے۔ کہ مودود کے بعد سلطنت غزنی کا حشر ترک اُمرا اور غلاموں کے ہاتھ سے وہی ہوا جو خلافت بغداد کا

سلطان عبدالرشید

عبدالرشید سلطان محمود کا فرزند[1] تھا۔ سلطان مودود نے اپنے زمانہ حکومت میں اسے ایک قلعہ کے اندر جو سبت اور غزنی کے درمیان واقع تھا نظر بند کر دیا تھا۔ جب سلطان مودود کی وفات کی خبر ملک میں مشہور ہوئی تو وزیر عبدالرزاق اس وقت سکینان میں تھا۔ وہ دوڑا ہوا اس قلعہ میں پہنچا جس میں عبدالرشید نظر بند تھا۔ اور اسے آزاد کیا۔ اور غزنی لا کر سلطنت پر قابض کرا دیا ۴۴۴ھ

سلجوقیوں سے معرکہ

سلطان عبدالرشید کے روبرو بھی مثل اس کے بزرگوں کے سب سے بڑا فتنہ سلجوق تھا جس نے رعب و داب سلطنت کو گھن لگا رکھا تھا۔ لہذا سب سے پہلے اس نے اسی جانب توجہ مبذول کی۔ چنانچہ سپہ سالار طغرل کو جو سلطان محمود غزنوی کا غلام اور سلطان مودود چہارم کا برادر نسبتی تھا۔ سپاہ کثیر دیکر سلجوقیوں کے مقابلہ کو سکینان بھیجا۔ یہ وہی طغرل ہے جو سلطان مودود کے عہد میں باغی ہو کر سلجوقیوں

[1] "عبدالرشید خود را از نژاد شاہ محمود میداشت۔ برج گو بند پور مسعود بود" (نامہ خسروان)

کے پاس چلا گیا تھا اور اُن کے جذبات مدت تک جذب کرتا رہا جیسا کہ بالتفصیل گزرا۔ اب یہ غزنی آیا۔ سلطان عبدالرشید نے اس کی گزشتہ تقصیرات کو نظرانداز کرکے اُسے سپہ سالار مقرر کیا

الپ ارسلان سلجوقی اپنا ٹڈی دل لشکر لے کر طغرل کے مقابلہ کو نکلا خون ریز معرکہ ہوا۔ طرفین کے بے شمار بہادر میدان میں کام آئے۔ بالآخر الپ ارسلان کو شکست فاش ہوئی۔

طغرل مظفر و منصور آگے بڑھا۔ اور داؤد سلجوقی سے مقابلہ کا ارادہ کیا۔ لیکن وہ بے جنگ ہی پسپا اور فرار ہوگیا۔ اسی طرح طغرل نے ابوالفضل اور بیغو سلجوقی کو زیر کرکے عالمگیر شہرت حاصل کی۔

سلجوقیوں کے مقابلہ میں کامیابی تو ہوئی لیکن یہ غزنویوں کی کامیابی نہ تھی بلکہ اس کے زوال کا باعث تھی۔ طغرل اپنی اس کامیابی سے نہ صرف مغرور بلکہ مجنون ہوگیا۔ اس نے بہت سی فوج فراہم کی اور سپاہ کثیر لے کر غزنی آیا۔ لیکن دماغ میں اور ہی خیال لے کر یعنی دولت غزنویہ کی بیخ کنی کے منصوبے۔ چنانچہ وہ غزنی واپس آتے ہی حکومت پہ قابض ہوگیا۔ عبدالرشید کو معزول، نظربند اور بالآخر تہ تیغ کیا۔ عبدالرشید نے صرف ۲ سال حکومت کی۔ تیس سال کی عمر میں شہید ہوا۔

سلطان عبدالرشید عالم، فاضل، اور محدث تھا۔ مگر شجاع اور اولو العزم نہ تھا[1]

[1] طبقات ناصری

یہی وجہ تھی کہ وہ خود سلجوقیوں کے مقابلہ کو نہ نکلا۔ اور طغرل کو بھیجا۔ جس نے یہ گل کھلائے
عبدالرشید کے علاوہ اس نے نو نادر غزنوی شہزادگان کو تہ تیغ بے دریغ
کیا۔ پھر دختر سلطان مسعود کو بہ جبر حبالۂ عقد میں لایا۔ شہزادہ فرخ زاد اور ابراہیم حُسنِ
اتفاق سے بچ گئے تفصیل آئندہ آئیگی۔

جب ان تاسف انگیز واقعات کی اطلاع ان خیر اندیش سرداران غزنی کے
کانوں تک پہنچی جو اس وقت ہندوستانی مہمات میں مصروف تھے اور جن کا سردار
فرشگین کرخی اور خیر خیر تھا تو ان کے دل غیرت و غضب کے جذبات سے پُر ہو گئے
انھوں نے سرداران غزنی اور دختر شاہ مسعود کے ساتھ سلسلۂ نامہ و پیغام جاری
کیا اور ان لوگوں کی غیرت و حمیت کے جذبات کو بھڑکایا۔ انھوں نے لکھا۔ کہ

"اب ان لوگوں کو جو اپنے آپ کو غزنی کے بہادر کہتے ہیں زنانہ لباس پہن
لینا چاہیئے۔ اس لئے کہ انھوں نے اپنی گردن کو ایک نابکار غلام کے جوئے کے
نیچے رکھدیا۔ اور ایسے نااہل اور بے رحم انسان کی اطاعت کو گوارا کر لیا ہے۔
کیا تم اس شخص کی اطاعت نہیں کر رہے ہو جس نے بے گناہ شہزادہ کو تلوار کے
گھاٹ اتارا!"

ان الفاظ نے وہی اثر کیا۔ جس کی توقع پر یہ مُنہ سے نکالے گئے تھے۔
بہادران غزنی آئیں تو جائیں کہاں۔ اب ان کے جوش غضب کا کیا ٹھکانا تھا۔
ایک روز عین دربار میں جب کہ کورنمک طغرل شاہی تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ مواد

پھوٹ نکلا۔ نوشتیگن ترک نے تلوار سے طغرل پر حملہ کیا۔ اس کے غلام نے اس کی مدد کی۔ حتیٰ کہ اس کا خاتمہ کردیا۔ اور اس کی نعش کو ریزہ ریزہ کردیا۔

اب یہ کام امرائے غزنی کا تھا کہ انھوں نے طغرل کے سر کو شارع عام میں ٹنکایا اور اس کی نعش کی تشہیر کرائی۔ الغرض کہ طغرل اپنی نمک حرامی کی پاداش کو پہنچا کوئی چالیس سال اس نے تخت غزنی پر حکومت کی۔ لیکن اس کا معاوضہ اسے نہایت گراں ادا کرنا پڑا۔ یعنی جان عزیز۔

مہمات ہند

سلطان عبدالرشید نے جرنیل نوشتگین کرخی کو مہمات ہند پر مامور کیا۔ چنانچہ یہ جان باز سردار پنجاب سے بھی آگے نکل آیا اور ہندو طاقت کو پامال کرنا شروع کیا حتیٰ کہ بڑھتے بڑھتے نگرکوٹ جا پہنچا۔ قلعہ پر گھیرا ڈال دیا۔ ہندو فوج نے محصور ہوکر مقابلہ شروع کیا۔ مگر اسے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ چنانچہ وہی نگرکوٹ جسے ہندوؤں نے نہایت اہتمام اور خاص تدابیر سے چار ماہ محاصرہ کرکے مسلمانوں کے قبضہ سے نکالا تھا چھ روز کے محاصرہ میں ان کے قبضہ سے نکل گیا۔ اور مسلمان دلیرانہ اس کے اندر داخل ہوکر اس پر قابض ہوگئے۔

اس سے زیادہ نوشتگین کو فرصت نہ ملی۔ فتنہ طغرل کی اسے اطلاع پہنچی اور وہ غزنی واپس چلا گیا۔ چنانچہ طغرل کا استیصال اسی کی کوشش کا نتیجہ تھا۔

سلطان فرخ زاد ۴۴۴ھ

کور بخت طغرل نسل محمودی کے استیصال سے اپنی سلطنت کو استحکام دینے کا تمنائی تھا۔ تاکہ دعویداران سلطنت اس کی راہ میں روڑا نہ اٹکا سکیں اور سلطنت مستقل طور پر اس کے خاندان میں منتقل ہو جائے۔ اسی منصوبے کی تکمیل کی غرض سے اس نے دختر مسعود سے نکاح کیا اور نو شہزادگان غزنی کا خون بہایا۔ لیکن بایں ہمہ دو شہزادے اس کے ہاتھ سے بچ گئے۔

جب طغرل تخت پر قابض ہوا ہے تو اس وقت دو شہزادے فرخ زاد اور ابراہیم (ابن مسعود) قلعہ برغندہ میں نظر بند تھے۔ چنانچہ طغرل نے ان کے قتل کے لئے بھی جلاد بھیجے۔ یہ لوگ رات کو قلعہ میں پہنچے تو قلعہ دار نے کہا۔ کہ اچھا آج ٹھیر و کل آپ اپنا کام کرنا۔ رات گزر گئی اور صبح کو جلاد اپنے کام کو انجام دینے کے لئے قلعہ میں داخل ہوئے۔ اور دونوں کے قتل کا تہیہ کرنے لگے۔ لیکن عین اسی وقت چند سوار سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے قلعہ کے دروازہ پر ٹھیرے اور اجازت پاکر اندر داخل ہوئے۔ اور قتل طغرل کا مژدہ سنایا۔ اور اس طرح شہزادوں کی جان بچ گئی۔

شہزادہ ابراہیم قید خانہ کے مصائب اٹھا اٹھا کر نہایت ضعیف و نزار ہو گیا

تھا اور علیل بھی تھا اس لئے فرخ زاد کو تخت نشین کیا گیا (۴۴۳ھ)

اس سلطان نے نہایت حلم۔ لیاقت اور عدل کے ساتھ حکومت شروع کی۔ مظالم اور بدعنوانیوں کا استیصال کیا۔ خیر خیر کو قلمدان وزارت عطا کیا فرخ زاد کے لئے بھی سب سے بڑا کام فتنہ سلجوق کو دبانا تھا۔

فتنہ سلاجیق

ہوشیار سلاجیق واقعات غزنی اور خاندان محمود کی پریشانیوں سے بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ اس موقع کو اپنے لئے مفید سمجھ کر سپاہ کثیر کے ساتھ غزنی آ پہنچے۔ داؤدان کا سردار تھا ادہر سے دستور معظم خیر خیر غزنوی فوج لے کر سلجوقیوں کے مقابلہ کے لئے میدان میں آیا۔ آخر آتش جنگ مشتعل ہوئی۔ اور ان نوں کی جانوں کو مثل ہیزم خشک جلانے لگی خون ریز معرکہ پڑا۔ میدان غزنویوں کے ہاتھ رہا۔ داؤد اور اس کی بقیۃ السیف سپاہ سر پر پاؤں رکھکر فرار ہوئی۔ بے شمار مال غنیمت غزنویوں کے قبضہ میں آیا۔

اب غزنویوں کی باری تھی۔ سلطان نے لشکر آرائی شروع کی کہ خراسان پر حملہ آور ہو کر دشمن کی قوت کا قلع قمع کر دے۔ چنانچہ غزنوی لشکر کوچ کرتا ہوا خراسان جا پہنچا۔ ہنگامہ کارزار گرم ہوا۔ طرفین کے ہزاروں بہادر کھیت رہے اب بھی نصرت غزنویوں کی جانب تھی۔ سلجوقیوں کا سردار کلسارق معہ کثیر سپاہ کے اسیر ہوا۔ لیکن ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔

جعفر بیگ نے جب اس ہزیمت کی خبر سنی تو سانپ کی طرح پیچ و تاب کھانے لگا۔ چنانچہ اس نے اپنے فرزند الپ ارسلان کو جرار فوج دے کر سلطان فرخ زاد کے مقابلہ پر بھیجا۔ طویل جنگ اور خونریز معرکہ ہوا۔ مگر اب کے غزنویوں کو کامیابی نہ ہوئی۔ بلکہ ان کے کئی سردار سلجوقیوں نے اسیر کر لئے۔ بقیۃ السیف سپاہ غزنی واپس گئی

فرخ زاد نے سلجوقی سپہ سالار گل سارق کو بندی خانہ سے نکال کر اسے مژدہ آزادی سنایا اور اس پر شاہانہ نوازشات مبذول کیں۔ گل سارق خراسان واپس پہنچا تو سلجوقیوں نے بھی غزنوی سردار جوان کے ہاں اسیر تھے آزاد کر کے غزنی واپس بھیجے۔ اور اس طرح گویا مفاہمت ہو گئی۔

سلطان فرخ زاد نے ۴۵۱ھ میں بعمر ۳۴ سال وفات پائی۔ سات سال حکومت کر کے۔ یہ سلطان حلیم و عادل اور سنجیدہ تھا۔ جوہر شجاعت سے بھی بے بہرہ نہ تھا۔ آغاز حکومت میں کابل کے ایک علاقہ میں وبا پھیلی سلطان نے اس علاقہ کا خراج معاف کر دیا۔

حکومت ہند کی حالت میں کوئی تغیر نہ ہوا :

سلطان ابراہیم

فرخ زاد کی وفات کے بعد ۴۵۱ھ میں شہزادہ ابراہیم بہ اتفاق جملہ امرائے دولت تخت نشین ہوا۔ اور اس نے نہایت قابلیت، عدل اور رعب داب کے ساتھ حکومت شروع کی۔

دولت غزنویہ کے لئے نہایت اہم معاملہ فتنۂ سلجوقی تھا۔ گو گزشتہ برسوں میں غزنوی سلجوقیوں کے ہاتھ سخت تنگ رہے۔ لیکن عہد فرخ زاد میں اس حالت میں تبدیلی ہوئی۔ دو شکستوں سے سلجوقی ڈھیلے سے ہو گئے اور مفاہمت کر لی۔

سلطان ابراہیم کے زمانے میں دوستانہ تعلقات نے زیادہ وسعت اختیار کی۔ چنانچہ داؤد سلجوقی نے سلطان سے باقاعدہ صلح کر لی۔ اور اس طرح ادہر سے سلطان کو اطمینان ہو گیا۔ چند روز بعد داؤد کا انتقال ہو گیا۔

اب سلطان کو موقع ملا کہ سلطنت کا اندرونی نظام درست کرے۔ اور رعایا کی خوشحالی اور آبادی میں کوشش کرے۔ چنانچہ چند ہی روز میں ملک سرکشوں سے صاف اور مرکز امن و امان بن گیا۔ ملک میں از سر نو محمودی رنگ نظر آنے لگا۔ جدید شہر و قصبات آباد ہوئے۔ جن میں دو خیر آباد[1]

[1] قصبہ خیر آباد دریائے اٹک کے کنارے ضلع پشاور میں اب بھی واقع ہے۔ اور ریلوی اسٹیشن ہے۔

اور ایمن آباد ہیں۔[1]

اگرچہ دولت غزنویہ کا اندرونی نظام از سرنو درست کر لیا گیا تھا۔ تاہم سلجوقیوں کی جانب سے کافی اطمینان نہ تھا۔ اور سلطان اس امر کو محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ دفعتًا خبر سُنی گئی کہ ملک شاہ[2] سلجوقی خاص غزنی پر حملہ آوری کی طیاری کر رہا ہے۔ لیکن اس خبر کے عملی ثبوت بہم پہنچنے سے قبل ہی دانشمند سلطان نے سلجوقیوں سے عزیزداری کے تعلقات قائم کر کے اس رخنہ کو بند کر دیا۔ چنانچہ سلطان ابراہیم کے فرزند مسعود (ثانی) کا عقد ملک شاہ کی دختر سے ہوا

[1] ایمن آباد ضلع گجرانوالہ (پنجاب) میں ایک آباد اور بارونق قصبہ ہے۔ بہت اغلب ہے کہ یہی قصبہ سلطان ابراہیم کے عہد کی یادگار ہو۔

[2] خانہ بدوش اور آوارہ گرد سلجوقی نے کس طرح عروج حاصل کیا۔ اور یہاں خراسان کس طرح محمود کے جانشینوں کو تنگ کیا۔ بالتفصیل مذکور ہو چکا ہے۔ لیکن خدا کی شان کہ اب یہ لوگ صاحب تاج و تخت بن گئے تھے۔ اور ان کا رعب و داب غزنوی سے بھی بالا ہو گیا۔ ملک شاہ تیسرا حکمران ہے۔ طغرل اور الپ ارسلان اس سے قبل برسر حکومت رونما ہو چکے ہیں۔ طغرل نے دو بار سلطان مسعود کو نیچا دکھا کر ۴۵۶ھ میں باقاعدہ اپنی حکومت کا اعلان کیا۔ ۴۶۸ھ میں اس نے پایۂ تخت ایران (اصفہان) کو فتح کیا۔ اس سے پیشتر وہ خوارزم۔ خراسان کے بیشتر علاقہ کو قبضہ و تصرف میں لا چکا تھا۔ چنانچہ ہرات و نیشاپور اسی کے قبضہ میں تھے اور اب گویا تمام ایران پر اس کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ (۴۷۲ھ تا ۴۷۶ھ)

مورخ فرشتہ لکھتا ہے۔ کہ

سلطان ابراہیم نے چند خط امرائے ملک شاہ کے نام بھیجے۔ ان کا مضمون اس قسم کا تھا۔ کہ گویا ان کے اور سلطان ابراہیم کے درمیان ملک شاہ کے خلاف کوئی سازش اور قرارداد ہوئی ہے۔ یہ خط ملک شاہ کے ہاتھ لگے۔ اور مقصد بھی یہی تھا (بقول فرشتہ) سلطان اپنے امراسے بدظن ہو کر حملہ غزنی کا ارادہ ترک کیا اور سلطان ابراہیم کے ساتھ سلسلہ عزیزداری قائم کیا۔"

(نوٹ بقیہ صفحہ ماسبق) بعدازاں بغداد پر حملہ آور ہوا۔ اور امیرالامرا کو جس نے خلیفہ کو معزول کیا تھا تہ تیغ کر کے خلیفہ کو از سرنو بر سر حکومت کیا اور دختر خلیفہ سعیدہ کو اپنے حبالۂ عقد میں لایا۔ اس کے جانشین الپ ارسلان کے زمانہ میں دولت سلجوق نے اور بھی عروج پکڑا۔ یہ نہایت عادل، دانشمند اور علم دوست تھا۔ قیصر روم نے ایران پر حملہ کیا مگر ہزیمت کھائی۔ اور گرفتار ہوا۔ الپ ارسلان نے اس کی تاجبخشی کی اور شاہانہ مدارات سے اسے رخصت کیا۔ ارسلان نے ترکستان فتح کیا۔ اس کا زمانۂ حکومت نہایت بارعب تھا۔ مگر بایں ہمہ سات سال سے زیادہ حکومت نہ کر سکا الپ ارسلان کے بعد اس کا فرزند ملک شاہ صاحب تاج و نگین ہوا۔ یہ بادشاہ عادل۔ خوش خلق اور وجیہہ تھا۔ اس کے زمانہ میں اکثر نہریں اور باغ تعمیر ہوئے علم دوست اور علما و شعرا کا سرپرست تھا۔ سیاحت کا شائق تھا۔ بہت سا ملک فتح کیا۔ خواجہ نظام الملک طوسی (بانی نظامیہ یونیورسٹی) اس کا وزیراعظم تھا۔ قیصر روم

فرشتہ نے اس اتحاد و مصالحت کا سبب امرائے سلجوقی کی فرضی سازش قرار دیا ہے۔ جیسے سلطان ابراہیم نے بادر کرایا۔ ایک مسلمان ہمعصر مورخ اس بیان کو تسلیم نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ ملک شاہ جیسا دانشمند بادشاہ ایسی آسانی سے مغالطے میں نہیں آسکتا تھا جب اس کے امرا کے زمرہ میں نظام الملک جیسا جاں نثار اور معتمد وزیر موجود تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ امرائے سلجوقی کی پارٹیاں تھیں۔ ایک پارٹی کا مقصد العین یہ تھا کہ نظام الملک کو ترک کر دے۔ بادشاہ بیگم (ترکان خاتون) اس گروہ کی طرفدار تھی دیگر باقی امرا نظام الملک کی رفاقت کا دم بھرتے تھے۔ وجہ اختلاف جانشینی کا مسئلہ تھا۔ نظام الملک کی کوشش یہ تھی۔ کہ بڑے شہزادے برکیارق کو جو ہر طرح قابل تھا ولیعہد بنایا جائے۔ لیکن ترکان خاتون کمسن شہزادے محمود کی حکومت کی خواہاں تھی اور ہر وقت نظام الملک کے خلاف بادشاہ کے کان بھرتی رہتی تھی حتیٰ کہ نظام الملک اس سازش کا شکار اور معزول و مقتول ہوا۔

بقیہ صفحہ ماسبق) نے ایران پر چڑھائی کی۔ اور سوء اتفاق سے خود ملک شاہ قیصر کے سپاہیوں کے ہاتھ میں گرفتار ہوا۔ دانشمند وزیر نے قیصر سے صلح کے لئے سلسلہ جنبانی کی اور اس طرح بادشاہ کو نکالا۔ قیصر کو یہ معلوم ہوا تو بڑا افسوس کیا۔ پھر از سر نو جنگ ہوئی۔ قیصر گرفتار ہوا۔ ملک شاہ نے اس کی جان بخشی کی۔ ان ہر سہ کے علاوہ اس خاندان میں گیارہ حکمران اور ہوئے یعنی کل ۱۴ کس۔ خاتم سلطنت رکن الدین طغرل بن

ملک شاہ کے دانشمند اور فہمیدہ ہونے میں کلام نہیں، لیکن ایسی کشمکش کے وقت ۔ اس کا فریب کھا جانا امر عجیب نہیں ہو سکتا ۔ بہت اغلب ہے ۔ کہ یہاں کی ایک پارٹی نے (دوسری پارٹی کو زک دینے کے لئے سلطان ابراہیم کے منصوبہ میں زیادہ نہیں تو محض " خاموش " رہ کر ہی مدد دی ہو ۔

لیکن بایں ہمہ ہم یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ اس اتحاد و مصالحت کا سبب صرف یہی ایک تنہا ۔ نہیں اور بھی کئی وجوہ تھے ۔

سلجوقیوں اور غزنویوں کے بار بار معرکے ہوئے اور کبھی کسی فریق نے اور کبھی کسی فریق نے غلبہ حاصل کیا ۔

گو سلجوقیوں کا اقبال مائل بلندی اور غزنویوں کا ستارہ افق کی جانب آ رہا تھا ۔ اور اب سے پیشتر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تاریکی میں غائب ہو جائیگا ۔ لیکن سلطان ابراہیم کے طرز عمل نے از سر نو دولت غزنویہ کے قالب بے جان میں جان ڈال دی ۔ دیکھنے والوں کو محمودی دور نظر آنے لگا ۔ یہ بھی ایک امر واقعہ ہے ۔ کہ سلجوقی باوجود مستحکم قوت رکھنے کے غزنویوں کی مرکزی قوت نہ توڑ سکے باوجود بار بار کی کوشش کے وہ دار الامارت غزنی کو نہ لے سکے ۔

ملک شاہ ایک اولو العزم و بیدار خود مختار حکمران تھا ۔ ترکستان، خراسان اور بیشتر حصہ ایران اس کے ممالک محروسہ میں شامل تھے ۔ وہ خلیفہ بغداد کا نائب محافظ سمجھا جاتا تھا ۔ بایں ہمہ اُسے اس امر کی ضرورت تھی ۔ کہ ممالک محروسہ کا انتظام

کرے - اور یہ کامل امن و امان کی صورت ہی میں حاصل ہو سکتا ہے۔ قیصر روم نے بار بار اس کے ملک پر حملے کئے۔ گو ہزیمت و خفت اٹھائی

الغرض سلطان ابراہیم اور ملک شاہ برابر کی چوٹ تھے - اور بظاہر ایک دوسرے کا استیصال ناممکن نظر آتا تھا۔ پس ان دونوں نے اپنی بہتری دوستی اور اتحاد میں سمجھی جنگ کا آخری نتیجہ دونوں کے حق میں مفید ہوتا - لیکن اس میں بھی کچھ شک نہیں تھا کہ ہزاروں مسلمانوں کے خون سے سرزمین اسلام رنگین ہوتی اور وہ قوت جو غیر مسلموں کے استیصال کے لئے وقف تھی۔ خود اپنی ہی بیخ کنی اور کمزوری کا باعث ہوتی - یہ طرز عمل اسلام اور مسلمانوں کے مفید ہونے کے علاوہ دونوں سلطنتوں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوا۔ ملک شاہ حسن بن صباح کی روک تھام کر سکا - اور رومی عیسائیوں کو زک دی۔ ادہر سلطان ابراہیم کو اندرونی انتظام سے فارغ ہو کر مہمات فتوحات ہند کے لئے وقت مل گیا - اور وہ کام جو سلطان محمود کے بعد رہ گیا تھا از سر نو شروع ہو گیا :

مہمات ہند بالتفصیل لکھا جا چکا ہے کہ راجگان ہند غزنویوں کے مقابلہ میں کس قسم کا طرز عمل اختیار کرتے تھے۔ جب ان کو قوی دیکھتے تو اطاعت و خراج سے ان کی ماتحتی کو قبول کر لیتے - گو یہ بالکل مخالفانہ ہی کیوں نہ ہو اور جب انہیں کمزور دیکھتے تو تمرد دکھاتے۔ جب غزنوی حکمران خانہ جنگیوں میں منہمک اور سلجوقی بغاوت کے فرو کرنے میں مصروف تھے تو ہندوؤں نے خوب ہاتھ پاؤں نکالے - نہ صرف سرکشی اور تمرد دکھایا اور ملک مسلمانوں کے قبضہ سے نکال لیا بلکہ

خاص علاقہ سلطانی (پنجاب) پر حملے اور تاخت تاراج کرتے رہے اور اس سلسلہ میں بہت سے مسلم امرا کے علاوہ بیشمار مسلمانوں کے خون کا ایک اور دریا اس پنجاب میں بہ نکلا تھا کہ یہ سلسلہ سلطان ابراہیم کے زمانہ تک جاری رہا۔

سلطان نے اول ایک فوج چند تجربہ کار امرا کے ماتحت پنجاب بھیجی کہ باغی امرا کی گوشمالی کی جائے۔ چنانچہ اس فوج نے باغیوں کو ناکوں چنے چبا دئے۔ اور بہت تھوڑی مدت میں وہ تمام قلعہ جات اور علاقے فتح کر لئے جن کو ہندو دبا بیٹھے تھے اس کے علاوہ کچھ اور علاقہ بھی فتح ہوا

۴۷۲ھ میں خود سلطان ابراہیم نے بہ نفس نفیس عزم ہند کیا۔ چنانچہ غزنی سے یلغار کرتا ہوا پنجاب تک آپہنچا اور قلعہ اجودھن (پاک پٹن) کو تسخیر کر لیا۔

اس مہم سے فارغ ہو کر قلعہ ادپال گڑھ[1] پر حملہ آور ہوا۔ اور اسے چند روز

[1] موجودہ جغرافیہ میں ادپال گڑھ کا نام نہیں آتا۔ قرائن سے یہ قلعہ کوہ بندھیاچل کے جنوب میں وسط ہندوستان احاطہ چھوٹا ناگپور میں واقع ہوگا۔ تاریخ فرشتہ میں مرقوم ہے۔ کہ قلعہ دپال گڑھ پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے (۲) قلعہ کے ایک جانب دریا ہے (۳) دوسری جانب گنجان اور خاردار جنگل (۴) جنگل اس قدر گنجان اور تاریک ہے۔ کہ انسان کا گزر وہاں محال ہے۔ اس لئے شعاع آفتاب اس کے اندر نہیں پہنچتی (۵) یہاں کے درختوں پر سانپ بچھو وغیرہ موذی جانور بکثرت ہیں۔

ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ردپال گڑھ کوہ ہمالیہ پر دوسیہ پہاڑوں

کے محاصرہ کے بعد فتح کر لیا۔ بہت سے دشمن قتل و قید ہوئے۔ بہت سے لوگوں نے فرار ہو کر جان بچائی۔

اس کے بعد سلطان قلعہ درہ کی تسخیر پر آمادہ ہوا۔ جو ایک نہایت مستحکم اور دشوار گزار قلعہ تھا۔ اور نہایت گنجان صحرا میں واقع تھا۔ قلعہ کے اندر ایک جھیل یا تالاب تھا جس کا قطر نصف فرسنگ سے کم نہ تھا۔ لیکن اس کا عمق نامعلوم تھا یہ تالاب کبھی خشک نہ ہوتا تھا۔ اور یہ امر اہل قلعہ کے لئے موجب تقویت تھا۔

صاحب قلعہ اور اس کے باشندے ہندو نہ تھے بلکہ ایرانی اصل خراسانی تھے۔ یہ وہ لوگ تھے۔ جن کے بزرگوں کو اب سے بہت زمانہ پیشتر افراسیاب نے ایران سے جلا وطن کیا تھا۔ یہ قوم فی الحقیقت شجاع اور عادات و تمدن میں ہندوؤں سے مختلف تھی۔ کئی ہندو راجگان نے ان لوگوں سے قلعہ چھیننے کی کوشش کی۔ مگر ناکامی ہوئی۔ کیونکہ یہ قوم شمشیر زن تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود ہندوؤں کو شاقی اور زدہاتی رہتی تھی۔ الغرض خراسانی سلطان ابراہیم کے زمانہ تک بالکل آزاد تھے

سلطان ابراہیم اس قلعہ کی تسخیر پر آمادہ ہوا۔ پہلا کام یہ تھا کہ سلطان نے

(بقیہ صفحہ ماسبق) میں واقع تھا۔ (جو گویا نمونہ بہشت ہیں۔ کیونکہ ایسے علاقے سانپ وغیرہ موذی جانوروں کی پرورش کی قابلیت نہیں رکھتے) بلکہ منطقہ حارہ کے گرم و خشک قطعہ میں واقع تھا اور یہ موقع بندھیاچل کے جنوب میں چھوٹا ناگپور کے اضلاع میں ہو سکتا ہے۔

بیلداروں (سفر مینا) کو حکم دیا کہ گنجان جنگل کو کاٹ کر رستہ بنائے۔ چنانچہ چند روز میں رستہ بن گیا۔ اور حملے شروع ہوئے۔ لیکن کوئی اہم نتیجہ حاصل ہونے سے قبل بارش شروع ہوگئی۔ اور بارش بھی ایسی کہ تین ماہ تک کھلنے میں نہ آئی اور اسی مدت سلطانی فوجوں کو بیکار پڑا رہنا پڑا۔

خدا خدا کرکے برسات ختم ہوئی۔ غزنوی بہادروں نے کمر باندھی۔ اور دشمن پر حملے کرنے شروع کئے اور رفتہ رفتہ قلعہ کے قریب پہنچ گئے۔ اس وقت سلطان ابراہیم نے اہل قلعہ کو دعوت اسلام عدم قبولیت کی صورت میں جزیہ اور آخر میں تلوار کا پیغام بھیجا۔ خراسانی بہادروں نے آخرالذکر چیز پسند کی۔ اور مقابلہ زور شور سے شروع ہوگیا سخت خونریزی ہوئی۔ جانبین کے ہزاروں بہادر مولی گاجر کی طرح کٹ گئے۔ لیکن بالآخر خراسانی بہادر تھک گئے۔ اور غزنویوں نے ان کا قلعہ تسخیر کرکے اپنے تصرف میں کرلیا۔ اور نمایاں فتح حاصل کی۔ بیشمار مال غنیمت ہاتھ آیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس قلعہ میں آبادی نہایت کثیر اور فوجی جمعیت بہت زیادہ تھی۔ عام باشندے بھی شمشیرزن تھے۔ چنانچہ ایک لاکھ اسیران جنگ غزنویوں کے قبضہ میں آئے۔ جن میں بیشتر شمشیرزن تھے۔

اس قلعہ (درہ) کا محل وقوع بھی مشکوک ہے۔ اور موجودہ جغرافیوں میں اس کا پتہ نہیں ملتا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ قلعہ بھی ممالک متوسط میں واقع ہو۔ اگر ایسا

ہے۔ تو زمانہ حال کا موجودہ ریلوے سٹیشن دردڑا (دیراد) دراصل درہ یہی ہے جو کثرت استعمال اور امتداد زمانہ سے بگڑ بگڑا کر دردڑا بن گیا۔[۵]

ہندوستان کے یہ وہ دور دراز مقامات ہیں۔ کہ اس سے قبل کوئی مسلمان حملہ آور یہاں تک نہیں پہنچا۔ سلطان محمود غزنوی اور اس کا سپہ سالار بھڑود ریح۔ سومنات۔ کالنجر۔ اور قنوج سے آگے نہ بڑھ سکا۔

سلطان ابراہیم کی فتوحات ہند کی سرحد یہی مقام ہے۔ اس سے آگے اسلامی فوجیں نہ بڑھیں۔ بلکہ یہیں سے غزنی کو واپس ہوگئیں سلطان نے کسی ہندو راجہ یا رئیس کو معزول نہیں کیا۔ نہ ان سے کسی قسم کی بدعہدی کی۔ بلکہ غیر شرعی محاصل جو مسلمان حکام نے قبل ازیں لگا رکھے تھے۔ ان کو بند کر دیا۔

ان مہمات سے مستقل نتائج یہ حاصل ہوئے۔ کہ اکثر راجگان ہند دولت غزنی کے مطیع و منقاد اور خراج گزار بن گئے۔ اسلامی ہند میں مستقل امن و امان ہو گیا۔

---

[۵] یہ بھی ممکن ہے۔ کہ یہ پہاڑ یا بنگال کا کوئی شہر یا قلعہ ہو۔ کیونکہ یہاں کی برسات کی یہی خصوصیت ہے۔ جب شروع ہوتی ہے۔ تو مہینوں تک سلسلہ جاری رہتا ہے۔ طوفان اور طغیانی دیہات کے دیہات بہا لے جاتی ہے۔

غوری مذکور ہو چکا ہے۔ کہ جب تخت غزنی پر سلطان مسعود جلوہ آرا تھا تو غور میں عباس اپنے چچا ابو علی کو تہ تیغ کر کے برسرِ حکومت رونما ہوا۔

عباس ظالم۔لالچی اور مردم آزار شخص تھا۔ رعایا کا کوئی فرد اس سے خوش نہ تھا۔علاوہ ازیں وہ غزنویوں سے سخت متنفر تھا۔ اس نے دو کتے پال رکھے تھے۔ اور ان کے نام ابراہیم (غزنوی) اور عباس رکھے تھے۔ ان کو باہم لڑاتا تھا اور اگر عباس اپنے حریف پر غالب آجاتا تھا تو خوب بغلیں بجاتا۔ اور اس سے فتح غزنی کی فال لیتا تھا۔

عباس کچھ مدت نہایت ظالمانہ طریق پر خود مختارانہ حکومت کرتا رہا۔لیکن بالآخر رعایائے غور نے تنگ آکر سلطان ابراہیم کی خدمت میں اپنا وفد بھیجا اور عرض کی کہ ہمیں اس ظالم کے پنجے سے نجات دلائی جائے۔چنانچہ سلطان نے جرار فوج لے کر غور پر لشکر کشی کی۔خفیف مقابلہ ہوا۔ عباس کو خود امرا نے اسیر کر کے سلطان ابراہیم کے حوالے کیا۔ بہ غزنی لایا گیا۔ اور اسی حالت میں مر گیا۔

سلطان ابراہیم نے نہایت فیاضی دکھائی۔ غوریوں کی سابقہ متمردانہ روش سے بالکل اغماض کیا۔ ان سے ایک جبہ بھر زمین نہیں لی۔ بلکہ غور کی حکومت محمد بن عباس کو عطا کی۔جس نے عدل وحلم کے ساتھ حکومت کی۔ اس میں

اس قدر خوبیاں تھیں جس قدر اس کے باپ میں برائیاں۔

اسی ۔۔۔ زمانے میں ایک اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔

۔۔۔۔۔۔۔۔ غارت گروں کی ایک جماعت گرفتار ہو کر حضور سلطانی میں پیش ہوئی۔ سلطان نے تحقیقات کی اور اثبات جرم کے بعد حکم قتل دیا۔ یہ سن کر ان میں سے ایک شخص بے تحاشا چلایا کہ اسے خدا تو جانتا ہے۔ کہ میں بے گناہ ہوں۔ سلطان ابراہیم نے اس کی جانب التفات کیا۔ اور اسکی سرگزشت بغور سنی۔ اس نے کہا کہ میرا نام حسین بن سام ہے۔ میں نسل ضحاک سے ہوں۔ جب دولت ایران نے ہم سے بے وفائی کی۔ تو ہم لوگ ہندوستان چلے گئے۔ میرا باپ سام سوداگری کرتا تھا۔ اب ہمارا قبیلہ جہاز میں سوار ہو کر وطن کو واپس جا رہا تھا۔ کہ طوفان نے جہاز کو پاش پاش کر دیا۔ اور میرے سوا میرے خاندان کا کوئی آدمی جانبر نہ ہو سکا۔ بڑی مشکل سے خشکی تک پہنچا۔ اور گرتا پڑتا۔ ایک شہر کے دروازہ تک پہنچا۔ لیکن کوتوال نے مجھے چور سمجھ کر حوالات میں دے دیا۔ اور سات سال اسی حالت میں گزرے آخر والی ملک کی صحتیابی کی تقریب سے مجھے آزادی نصیب ہوئی۔ اور اب میں نے غزنی کا عزم کیا۔ میں اس شہر سے باہر نکلا ہی تھا۔ کہ مجھے چوروں کی یہ جماعت ملی اور اس نے مجھے اپنے مطلب کا آدمی سمجھکر میرے لئے گھوڑا، لباس وغیرہ مہیا کیا۔ اس کے بعد کی روداد خود حضور کو معلوم ہے۔ کہ میں گرفتار ہو کر

حضورِ سلطانی میں پیش ہوا۔ میں نے چوری بالکل نہیں کی۔

یہ واقعہ بالکل سچا تھا۔ اس لئے سلطان کے دل پر خاص اثر کیا جس کی جان بخشی کی گئی۔ سلطان نے اسے خدمتِ ربانی عطا کی۔ سلطان نے سنہ ۴۹۲ھ میں بعمر ۶۰ برس وفات پائی۔ ۴۲ سال حکومت کی۔

وفات و سیرت

سلطان ابراہیم شجاع منتظم اور دیندار حکمران تھا۔ جو اپنے جدِ امجد سلطان محمود کی بہت سی صفات اپنے میں رکھتا تھا۔

سلاجقہ کے ساتھ مصالحت واتحاد اور مہمات ہند کی کامیابی میں اس کی ذاتی شجاعت کو کامل دخل تھا۔

یہ اس کی انتظامی قابلیت ہی کا نتیجہ تھا۔ کہ دولت غزنویہ کا بگڑا ہوا ڈھانچہ اس نے چند روز میں درست کر دیا۔ سلاجقہ ڈھیلے پڑ گئے۔ انہیں مصالحت ہی کرتے بنی۔ ممالک محروسہ میں عالمگیر امن وامان قائم ہو گیا۔

سلطان ابراہیم نہایت متشرع۔ دیندار اور منکسر مزاج بادشاہ تھا۔ شباب کی بدعنوانیوں میں کبھی مبتلا نہیں ہوا۔ زہد و پرہیزگاری کا یہ حال تھا۔ کہ سال میں تین ماہ رجب۔ شعبان اور رمضان میں روزے رکھتا تھا۔

مجالس وعظ و پند منعقد کرتا۔ اور نہایت توجہ سے علماء دین کی پند و نصائح سنتا۔ عالمانِ باعمل کی نہایت قدر کرتا۔ اور ان کی درشتی کو بھی برداشت کرتا۔ اس زمانہ کے علماء دین بھی ابن الوقت نہ تھے۔ بلکہ صاف گو اور آزاد طبع

تھے۔ امام یوسف سجاوندی سلطان میں جو نقص یا قابل اعتراض بات دیکھتے بے دھڑک کہ گزرتے۔ اور سلطان نہایت حلم و ادب سے ان کی نصیحت قبول کرتا۔

سلطان ابراہیم، قرآن کریم اپنے ہاتھ سے لکھتا۔ اور ایک سال خانۂ کعبہ اور دوسرے سال مدینہ منورہ ہدیتاً بھیجتا۔ اپنے ذاتی خرچ کا بار شاہی خزانہ (بیت المال) پر نہ ڈالتا۔ بایں ہمہ بہبودیٔ رعایا۔ رفاہ عام خدمت اسلام اور حرفت کے صیغوں میں روپیہ پانی کی طرح بہاتا۔ غربا و گوشہ نشینوں کی خاص طور پر امداد کرتا تھا۔

گو ابراہیم کی فتوحات محمودی فتوحات کی ہم پلہ نہ تھیں۔ لیکن اس کی رعایا پروری سلطان محمود کے برابر اور زہد و ورع اور دینداری میں سلطان سے کچھ بڑھا ہوا ہی تھا۔

غزنی کے عام مسلمانوں میں وہی محمودی زمانہ کا جوش موجود تھا اور یہ سب سلطان ابراہیم کے دل و جان سے معاون و مددگار رہتے تھے جیسا کہ مہمات ہند کی تفصیل سے معلوم ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ رعایا پر بادشاہ کے کیرکٹر کا بہت بڑا اثر ہوا کرتا ہے۔ سلطان ابراہیم دیندار، شجاع اور حامیٔ دین تھا۔ تو کوئی وجہ نہ تھی۔ کہ غزنی کے عام مسلمان بھی اسی رنگ سے رنگین نہ ہو سکتے

ابوالفرح سیستانی رومی اور ارزقی سلطان ابراہیم کے زمانے کے مشہور شعرا تھے۔ کتاب الفیہ شلفیہ ارزقی نے اسی سلطان کے لئے مرتب کی۔ صاحب نامہ خسروان لکھتا ہے:-

"گویند نامۂ" الفیہ شلفیہ" را او (ارزقی) بنیاد نمود و برائے ایں بود کہ پادشاہ نمے توانست نزدیکی با زنان کند، چنانچہ پزشکان نیز چارۂ آں رنج نجستند، ارزقی آں نامہ را نوشت و در چہرہ ہائے نیکو نگاشت۔ و جوانے پزچہرہ و دختر ماہ روئے را۔ در شبستانے کہ از روزنہ پدیدار بود۔ فرستاد و فرمود مانند آں چہرہ ہائے گوناگوں بایک دیگر درآمیزند و شاہ را در پشت آں روزنہ بداشت۔ چوں چند بار آں کار را دید خواہش او بہ جنبش آمدہ و پارہ مانند پنیر بستہ از سوراخ مردی او بیروں افتاد۔ پس ازاں توانائی آں کار را پیدا کرد" (نامہ خسروان صفحہ ۱۴)

نمونہ کلام ابوالفرح۔ قطعہ

عنقائے مغرب است دریں دور خرمی	خاص از برائے محنت و غم زاد آدمی
ہر چند گرد عالم صورت برآمدم	غمخوار آدم آمد بے چارہ آدمی
ہر کس بقدر خویش گرفتار محنت است	کس را نداد اند برات مسلمی

سلطان مسعود سوم

سلطان ابراہیم کی وفات (سنہ ۴۹۲ھ) کے بعد اس کا فرزند شہزادہ مسعود صاحب تاج و تخت ہوا۔ اور نہایت عدل و سلیقہ سے حکومت شروع کی۔ اس کا ابتدائی کام یہ تھا۔ کہ اس نے اُن عمال کو سزائیں دیں۔ جو رعایا کے ساتھ جبر و زیادتی روا رکھتے تھے۔

اس زمانے میں سلجوقی فتنہ دبا رہا۔ کیونکہ غزنوی اور سلجوقیوں میں رشتہ اتحاد قائم ہو چکا تھا۔ سلطان سنجر (سلجوقی) کی دختر سلطان مسعود کے حبالۂ عقد میں منسلک تھی۔ اس لئے دونوں دولتوں میں فی الحال خوشگوار تعلقات رہے۔ کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہوئی۔

سلطان نے حسین بن سام کو (جس کا حال قبل ازیں مذکور ہوا) کارگزار غور مقرر کیا۔ اور اس کے بعد اس کی اولاد وہاں خود مختارانہ حکومت کرتی رہی۔

مہمات ہند

اس کے عہد میں حاجب طغاتگین گورنر لاہور نے پنجاب سے آگے بڑھ کر ہندوستان کو[1] غزنوی افواج کا جولانگاہ بنایا۔ اور سلطان محمود غازی کے مفتوحہ علاقہ (قنوج کالنجر)

[1] تاریخ فرشتہ

تک گیا۔ اس فوجی نقل وحرکت کا مطلب ہندو راجگان کو اپنی قوت وشوکت دکھانے اور سطوت اسلامی کا ان پر رعب ڈالنے سے زیادہ نہ تھا۔

ہندو راجگان کا طرز عمل جا بجا مذکور ہو چکا ہے۔ وہ جب غزنوی سلطنت کی ذرا بھی کمزوری محسوس کرتے تھے (اور اس کا عملی ثبوت یہ تھا کہ غزنوی فوجیں ہند نہ آئیں) تو وہ آنکھیں دکھانے لگتے اور خود مختار بن جاتے تھے۔ حاجب نے ایسے ہی ہندو سرداروں اور ہندو رعایا کو مرعوب کرنے کے لئے یہ فوجی نقل وحرکت کی تھی۔ اور ایسا آج بھی متمدن ومہذب اقوام اکثر دولتیں کرتی ہیں یہ فوج کشی کسی شہر یا علاقہ پر نہ تھی۔ بلکہ عام فوجی نمائش تھی۔ اس لئے کوئی خاص علاقہ فتح نہ ہوا۔ ہاں بعض متمرد ہندو سرداروں کو درست کیا گیا۔ بہرحال یہ مہم جس مقصد سے ہندوستان آئی تھی وہ بہ احسن وجوہ حسن اختتام تک پہنچی

سلطان مسعود نے ۵۰۸ھ میں وفات پائی۔ سولہ سال شان وشوکت کے ساتھ حکومت اور ظالموں کی سرکوبی کی۔ وہ عادل۔ کریم النفس اور نیک نہاد سلطان تھا۔

اولاد میں ۱۹ بیٹے یادگار چھوڑے۔

سلطان ارسلان

سلطان ارسلان سلطان مسعود سوم کی وفات کے بعد غزنی میں تخت نشین ہوا۔ اور عبدالحمید ابن احمد کو قلمدان وزارت سپرد کیا۔

تخت پر قبضہ کرنے کے بعد اسے سب سے ضروری کام صرف یہی معلوم ہوا کہ اپنے رقیبوں، حریفوں اور دعویداران سلطنت کا قلع قمع کرے۔ چنانچہ اس نے اپنے انیس[19] بھائیوں میں سے بعض کو تہ تیغ اور اکثر کو مقید کیا۔ منجملہ ان بدنصیب شہزادوں کے ایک شہزادہ بہرام (ابن مسعود) غزنی سے بھاگ گیا۔ اپنے ماموں سنجر (سلجوقی) کے پاس پہنچا۔ اور اس سے طالب امداد ہوا۔

بداندیش ارسلان نے اپنی ماں ملکہ مہد عراق (خواہر سنجر) کی بھی توہین روا رکھی۔ سنجر اس زمانے میں اپنے عم سلطان ملک شاہ کی جانب سے خراسان کا کارگذار تھا۔ بہرام اس سے طالب امداد ہوا۔ یہ اپنی فوجیں لے کر غزنی کی جانب چلا۔ جب وہ سکستان پہنچا۔ تو ابوالفضل اس سے آملا۔

ارسلان کو اس لاؤ لشکر کی اطلاع ہوئی۔ تو اس نے اپنی فوج دشمن

کے مقابلے کو بھیجی۔ آویزش سے قبل سنجر نے ارسلان کو فہمائش اور بہرام کی سفارش کی۔ لیکن اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ مقابلہ شروع ہوا۔ اور اس میں شک نہیں کہ ارسلان کی فوج نے جو تعداد میں بھی دشمن سے کم نہ تھی۔ نہایت شجاعت اور استقامت کا ثبوت دیا مگر بالآخر اُسے ہزیمت ہوئی۔ سنجر اپنے منصوبے میں کامیاب ہوا۔ بے شمار غزنوی خاک وخون میں مل گئے۔ بقیتہ السیف میدان سے فرار ہوئے۔

جب سلطان ارسلان کو اس ہزیمت کی اطلاع پہنچی۔ تو اس کا نشہ ہرن ہوا۔ اب اس نے بے شمار قیمتی تحفے تحائف سنجر کے پاس بھیجے۔ اور اپنی شفاعت و سفارش اپنی ماں ملکہ مہد (خواہر سنجر) سے کرائی۔

اب سنجر چاہتا تھا کہ یہیں سے واپس لوٹ جائے۔ لیکن بہرام شاہ اس پر رضامند نہ ہوا۔ اور اس نے زور دیا کہ غزنی چلیں۔

جب خراسانی لشکر غزنی کے بالکل قریب یعنی ایک فرسنگ کے فاصلہ پر جا پہنچا۔ تو غزنوی فوج اس کے مقابلے کو آئی۔ اس میں تیس ہزار سوار پیادے اور ڈیڑھ سو جنگی ہاتھی تھے۔

دونوں لشکروں میں مقابلہ شروع ہوا۔ کامیابی کا سہرا اب کے بھی سنجر کے سر رہا۔ غزنوی بھاگ نکلے۔

سنجر فاتحانہ طمطراق سے غزنی میں داخل ہوا۔ اور شہر پر فوجی قبضہ

کردیا۔ لیکن اعلان کردیا کہ خبردار کوئی سپاہی رعایا کو نہ ستائے۔

سنجر یہاں کامل چالیس روز مقیم رہا۔ غزنی کا شاہی خزانہ تصرف میں کیا۔ یہاں کی حکومت بہرام شاہ کے سپرد کی۔ اور جب سب کچھ ہوگیا۔ تو خود خراسان کو لوٹ گیا۔

ارسلان نے ابھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ بلکہ وہ قسمت آزمائی پر آمادہ تھا۔ چنانچہ ہندوستان کی جانب نکل آیا۔ اور فراہمی سپاہ میں مصروف ہوگیا چنانچہ جب اسے معلوم ہوا کہ سنجر غزنی سے چلا گیا ہے۔ تو اپنی چند ہندوستانی سپاہ ہمراہ لے کر غزنی پر حملہ آور ہوا۔ بہرام شاہ میں تاب مقابلہ کہاں تھی۔ وہ تو دوسروں کا بنایا ہوا سلطان تھا۔ غزنی سے نکل کر بامیان چلا گیا۔ لیکن چند روز بعد سنجر اپنا ٹڈی دل لشکر لے کر غزنی پر آپڑا۔ ارسلان کو مغلوب کرکے اسیر کرلیا۔ اور بالآخر اسے تہ تیغ کیا۔

ارسلان نے صرف پانچ سال حکومت کی۔ وہ شجاع۔ بے باک مگر بے رحم اور ظلم پسند تھا۔

ارسلان کے قضیہ نامرضیہ کے بعد بہرام شاہ ابن سلطان مسعود سوم تخت غزنی پر متمکن ہوا۔ لیکن وہ سلجوقیوں کا بنایا ہوا سلطان تھا۔ اس لئے حکومت غزنویہ کا اب عملاً کوئی اقتدار باقی نہ تھا۔

سلجوقیوں نے فی الحال غزنی کی سلطنت میں بظاہر رخنہ اندازی و قطع برید نہ کی۔ لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ ان کے اس قسم کے طرز عمل سے سلطان ابراہیم کی وقعت امرائے غزنی کی نظروں میں خاک بھی نہ رہی لغانستان میں غزنویوں کی قومی طاقت اور شاہی اثر نام کو نہ رہا۔ بہرام شاہ کا رعب اس علاقہ سے بالکل اٹھ گیا جو غزنی اور سلطان سنجر کے علاقہ کے درمیان واقع تھا۔ یہ درمیانی قومیں حسب ضرورت سلطان سنجر سے رابطہ اتحاد پیدا کرتی رہیں۔ اور اس نے اسے اپنے مفید مطلب سمجھ کر قبول کیا۔ ملوک غور نے وقت سے فائدہ اٹھا کر اور زیادہ ہاتھ پاؤں نکالے۔ تفصیل آئندہ آئے گی۔

مہمات ہند گو سلطنت غزنی میں اسی روز سے ضعف آگیا اور عام نگاہوں میں بے رعبی ہو گئی تھی۔ جب کہ سنجر نے غزنی

فوج کو شکست دی اور بہرام اس کی حمایت سے صاحب تاج ونگیں ہوا۔ تاہم ہندوستان اور پنجاب ابھی اس واقعہ سے متاثر نہ ہوا تھا۔ پنجاب اور قنوج تک کا تمام ملک غزنویوں کے زیر نگین تھا۔ سلطان بہرام نے اس ملک کی ترقی آبادی اور انتظام میں ہر طرح کی کوشش کی۔

ارسلان کے زمانہ سے غزنویوں کا نائب السلطنت ہند (والسرائے) محمد باہلم چلا آتا تھا۔ جس کا صدر مقام لاہور تھا۔ اب جبکہ انقلاب حکومت ہوا۔ یعنی ارسلان کا استیصال ہونے پر بہرام وارث حکومت ہوا۔ تو محمد باہلم نے تمرد دکھایا۔ اور ایسی روش اختیار کی گویا وہ ہندوستان کا خود مختار حاکم ہے۔ بہرام شاہ اس کی سرکوبی کے لئے فوج لے کر آیا۔ اور اسے قید کر لیا۔ لیکن اس کی تقصیرات سے درگزر کر کے اسے بدستور حکومت ہند پر بحال کر دیا۔ اور خود غزنی کو لوٹ گیا۔

اب محمد باہلم نے فتوحات ہند کی توسیع کا ارادہ کیا۔ چنانچہ وہ پیش قدمی کرتا ہوا ناگور جا پہنچا۔ اور یہ قلعہ فتح کر کے ملحقہ علاقہ پر قبضہ کر لیا۔

اب اس کی نظر پھر بدلی۔ اس نے لاہور کے بجائے اپنا صدر مقام ناگور کو بنایا۔ اور اپنا تمام مال و اسباب اور عیال و اطفال کو یہیں منگا لیا۔ اور دولت غزنویہ سے اظہار تمرد کیا۔ اس نے خیال کیا کہ میں ناگور جیسے

دور دراز علاقہ میں غزنویوں کی زد سے دور ہوں۔ اس لئے اس نے اپنے لئے ہند میں ایک خود مختار حکومت کی بنیاد ڈالنے کا ارادہ کیا۔

بہرام نے باہلم کے منصوبوں کی اطلاع پائی تو لشکر جرار لے کر عازم ہند ہوا۔ اور یلغار کرتا ہوا ملتان آپہنچا۔ یہاں سخت مقابلہ رونما ہوا ہزاروں مسلمانوں کا خون ملتان کے ریگستان نے پیا۔

یہ پہلا واقعہ تھا۔ کہ اہل ہند نے ایک باغی مسلمان کو مسلم سلطان سے مقابلہ کرتے دیکھا۔ بعض ہندو سرداروں نے باغی کو امداد بھی دی۔ کیونکہ اس میں ان کا فائدہ تھا۔

اگرچہ جنگ میں ابتداً محمد باہلم کا پلہ بھاری رہا۔ اور ایسے آثار نظر آنے لگے۔ کہ گویا وہ غالب آئیگا۔ لیکن بالآخر اس نے شکست کھائی۔ اور جبکہ وہ بھاگ جارہا تھا تو ایک دلدل میں آپھنسا۔ کہ پھر نہ نکل سکا۔ اور وہیں غرقاب ہوا۔ اس کے دو بیٹے بھی اس کے ہمراہ تھے۔

باغیوں کے قلع قمع کے بعد سلطان بہرام نے حکومت ہند کا چارج حسین بن ابراہیم کو دیا۔ اور ہندو سرکش سرداروں کو زیر و مطیع کر کے خود غزنی کو واپس ہوا

سلطان نے ہندوستان میں مدارس و خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ جن میں علمی و عملی طور پر اسلام کی تعلیم دی جاتی تھی ؛

غوری غوریوں نے کیونکر عروج حاصل کیا؟ اور سبکتگین۔ سلطان محمود اور اس کے جانشینوں کے ساتھ اہل غور نے کیا کیا؟ بالتفصیل اوپر گزرا۔ لیکن اس کے عہد میں غوریوں نے حکومت غزنی کی جان ہی نکال دی۔ بہرام نے ہزار حکمت عملی سے کام لیا۔ مگر اس کی ایک نہ چلی۔

ملک قطب الدین غوری (ملک الجبال) عباس ظالم کی نسل سے تھا یہ اپنے بھائیوں سے ناراض ہو کر غزنی آیا۔ اور سلطانی اُمرا میں داخل ہوا یہ وجیہہ وشاندار اور شائستہ سردار تھا۔ اس لیئے سلطان بہرام شاہ نے اُسے اپنے خویش ہونے کا اعزاز عطا کیا۔ اور اس طرح قطب الدین نہایت معززانہ حیثیت سے زندگی بسر کرنے لگا۔ لیکن غزنویوں کی دشمنی اور ہوس ملک گیری اس کو بزرگوں سے میراث میں پہنچی تھی۔ آخر وہ عباس کی نسل سے تھا۔ دولت غزنویہ اس وقت زوال پذیر تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دیوار حکومت شاہان سلاجیق کے سہارے کھڑی تھی۔ یہ رنگ دیکھکر قطب الدین نے غزنی میں اپنے لیئے میدان بنانا چاہا۔ داد و دہش سے عوام میں ہر دلعزیزی قایم کی۔ اور یہ تمہید تھی، حصول حکومت کی۔ لیکن ارادہ کو عمل میں لانے سے پیشتر ایک روز وہ دفعتًا مُردہ پایا گیا کہتے ہیں کہ اسے سُلطان کی تحریک سے زہر دیا گیا۔

یہ فتنہ یہاں آکر ختم نہیں ہوگیا۔ قطب الدین کے بھائی سیف الدین نے انعام کے بہانہ سے غزنی پر لشکر کشی کی۔ یہاں اب جان کہاں تھی۔ بہرام شاہ غزنی کو چھوڑ یا غستان کی جانب پسپا ہوا۔ حملہ آور نے تاج وتخت پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اہل غزنی نے اس کی حکومت کو قبول نہیں کیا۔ وہ غوریوں کے غیر مہذبانہ اور جاہلانہ اطوار کیونکر پسند کر سکتے تھے۔ امرائے غزنی نے خفیہ خفیہ بہرام شاہ کو طلب کیا۔ اور جب وہ آگیا تو تخت و تاج پر اس کا قبضہ کرا دیا۔

سیف الدین گرفتار ہوا۔ شہر میں اس کی تشہیر کرائی گئی۔ اس وقت عوام نے اس پر کنکر پتھر اور میلا پھینکا۔ بالآخر اسے مع وزیر کے سولی پر چڑھایا گیا۔

غوری خاموش بیٹھنے والے نہ تھے۔ خود ان کی شجاعت مسلمہ تھی پھر غزنویوں کی کمزوری نے ان کی جرأت اور بڑھا دی تھی۔ چنانچہ بہاءالدین سام بغرض انتقام لشکر کثیر لے کر غزنی کو چلا۔ مگر راستہ ہی میں اُسے موت نے مغلوب کر لیا۔ لیکن مرتے وقت اپنے بھائیوں (قطب الدین سیف الدین) کا خون بہا لینے اور غزنی فتح کرنے کی وصیت اپنے چھوٹے بھائی علاءالدین کو کی۔

علاءالدین نہایت شجاع اور پُرجوش بہادر تھا۔ تمام غوری جوش

انتقام سے پہلے تاب ہو رہے تھے۔ تیاریاں شروع ہوئیں۔ بہرام شاہ غزنوی نے مصالحت کے لئے سلسلہ جنبانی کی۔ مگر بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ علاءالدین اپنی اور حریف کی طاقت سے ناواقف نہ تھا۔ پھر وہ مصالحت کس طرح کر سکتا تھا۔ آخر علاءالدین بہادر غوریوں کو لئے ہوئے غزنی جا پہنچا۔

غزنوی سپاہیوں میں اب محمودی زمانے کا جوش نہ رہا تھا۔ ہندوستانی آب و ہوا اپنا کام کر چکی تھی۔ خود سلطان اور تمام فوج آرام طلب ہو گئی تھی۔ انہیں اپنی شجاعت پر اعتماد نہ رہا تھا۔ البتہ ہاتھیوں پر ناز تھا۔ اور ہندو فوج اور ہندو سرداروں کی امداد پر۔

بہرام شاہ کی فوج کا زیادہ تر حصہ ہندو فوج تھی۔ اور کچھ شک نہیں کہ یہ فوج غوریوں سے جان توڑ توڑ کر لڑی۔

جنگ عجیب طریقہ پر شروع ہوئی۔ غزنویوں نے دو جنگی ہاتھیوں کو دشمن کی جانب ہانکا۔ غوری کے دو پہلوانوں (خرمیل) نے ہاتھیوں پر حملہ کیا۔ ایک نے ہاتھی کے پیٹ میں خنجر مارا۔ لیکن اسے ہاتھی نے پیس ڈالا اور وہ جانبر نہ ہو سکا۔

دوسرے پہلوان نے شیرانہ دوسرے ہاتھی پر حملہ کیا۔ اور بالآخر اُسے ہلاک کر کے دوسرے ہاتھی کی پشت پر آ رہا۔ اب عام لڑائی شروع ہوئی۔

دونوں طرف کے بہادر جوہر شجاعت دکھانے لگے۔ بہرام شاہ کا بیٹا اور سپہ سالار دولت شاہ دشمنوں کے نرغے میں آگئے۔ اور بہت سے دشمنوں کو خاک و خون میں ملا کر بہادرانہ جان دی۔

نتیجہ جنگ غزنویوں کے حق میں اچھا نہ نکلا۔ انہیں شکست ہوئی۔ بہرام شاہ میدان سے پسپا ہوا۔ علاء الدین غزنی تک اس کے تعاقب میں گیا۔ دو مواقع پر بہرام شاہ نے پھر پھر کر دشمن سے راہ میں مقابلہ کیا۔ مگر عہدہ برآنہ ہوا۔ آخر اُسے ہندوستان چلا آنا پڑا۔

۱۱۵۲ء میں علاء الدین غزنی میں داخل ہوا۔ سات یوم تک قتل عام و غارت گری کا بازار گرم رہا۔ شہر میں آگ لگائی۔ سلاطین محمود و مسعود اور ابراہیم کے سوا باقی بادشاہوں کی قبریں اکھیڑ پھینکیں۔ علاء الدین دسویں روز بھائیوں کی نعشوں کے صندوق ہمراہ لے کر غور گیا۔

علاء الدین نے بہرام کو تین بار شکست دی۔ غزنی میں ۱۱۵۶ء تک حکمران رہا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا۔ پھر دو بھتیجے قابض رہے۔ ان میں سے چھوٹا مشہور و معروف محمد غوری ہے۔

ہندو فوج کی شرکت و حمایت اور بہرام شاہ کے زیر علم ہو کر اکثر راجگان ہند کے غوریوں کی فوج سے نبرد آزما ہونے کا تذکرہ خود فاتح علاء الدین ابیات ذیل میں کرتا اور رائے سردایان ہند کی

مغلوبیت پر فخر کرتا ہے۔

آنم کہ ہست فخر ز عالم زمانہ را | آنم کہ ہست جور ز بذلم زمانہ را
بہرام شاہ بکینہ من چوں کماں کشید | کندم بکینہ از کمر او رکنانہ را
پیشی خصم گرچہ ہمہ رائے ورانا بود | کردم بہ گرز خود شیر رائے ورانہ را

اس واقعہ سے محمود، اولاد محمود اور ہندوستان کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

سلطان بہرام شاہ علم دوست اور علماء و فضلا کا سرپرست اور قدردان تھا۔ اس کا زمانہ علمی سرپرستی کے لئے مشہور ہے۔

مشہور کتاب انوار سہیلی و کلیلہ دمنہ اس کے عہد ہی میں عربی سے ترجمہ کی گئی۔

نظامی نے مخزن اسرار اسی عہد میں تصنیف کی اور بہرام شاہ نے اس کی قدردانی کی ؎

ختم شد

نکاتِ رموزی حصہ دوم

اس میں حصہ اول سے سوا دلفریب دلکش مضامین ہیں جو انداز خطاب اور فصاحت نگاری کا اچھوتا نمونہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ)

صبح لطافت

اسے نکات رموزی کا حصہ سوم سمجھئے۔ مگر اس میں علم و ادب سیاست و اخلاق کے جن حالات پر بحث ہے حق یہ ہے۔ ادب اردو اس کے جواب سے عاجز ہے۔ قیمت (عا)

مقالاتِ گلابی اردو

ملا رموزی کے ایجاد کردہ طرز خاص کے بے مثل نمونوں کا دوسرا مجموعہ جو سیاسی ظرافت کے مشہور و معروف نکات پر مشتمل ہے۔ قیمت بارہ آنے (۱۲)

ملنے کا پتہ

مہتمم کتب خانہ ارا الادب اندرون بھاٹی دروازہ لاہور

تاریخ کی بہترین کتابیں
تاریخ سلاطین آلِ عثمان
ترکوں کی ۷۰۰ سالہ حکومت کے مفصل و مکمل حالات معہ تصاویر۔ یہ کتاب
خاص طور پر مطالعہ کرنے کے قابل ہے۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے (عہ۱۲)
تاریخ مدینہ منورہ
مدینہ منورہ کی مفصل و مکمل تاریخ معہ فوٹو مدینہ شریف۔ اُردو زبان میں
بہترین کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)
تاریخ مکہ معظمہ
مکہ معظمہ کی مستند اور صحیح تاریخ گھر بیٹھے بیت اللہ شریف کے حالات معلوم کرنے
کے لئے بہترین کتاب۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

جو اسے پڑھکر چار آنسو نہ بہا سکے۔ کتاب کے ساتھ دو تین عکسی فوٹو بھی شامل ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ/)

تذکرہ اولیائے ہند

ہندوستان کے تمام اولیائے کرام کے حالات نہایت تفصیل سے درج ہیں۔ قیمت صرف چار روپے (للعہ)

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
تاریخ خلفائے عرب و اسلام	عمہ/	سیرۃ الصحابہ	صہ/	سوانح حضرت عمر بن عبد العزیز	عہ/
تاریخ سیالکوٹ	۱۰/	صحابیات	عمہ/	سیرت امام حسین	۱۲/
تبان حرم	۸/	سیرۃ النبی حصہ اول مجلد	صہ/	سیرت حضرت فاطمہ	عہ/
محمد بن قاسم	۲/	" حصہ دوم	للعہ/	رسائل شبلی	عہ/
ابراہیم ادہم	۱۲/	" " سوم	سے/	ابو مسلم خراسانی	عمہ/
سوانح خالد بن ولید	عہ/	سیرۃ حضرت عائشہؓ	سہ/	ایک روپیہ سے کم قیمت کا وی پی نہ کیا جائے گا۔	

ملنے کا پتہ

کتب خانہ دار الادب اندرون بھاٹی دروازہ لاہور

سوانح سلطان صلاح الدین اعظم رح

اگر آپ کو یہ معلوم کرنے کا شوق ہو۔ کہ تمام دنیا کے عیسائی آج تک کس کے نام سے لرزہ براندام ہوجاتے ہیں۔ تو کتاب "سوانح سلطان صلاح الدین اعظم" کا مطالعہ کیجئے۔ جس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ شاہان یورپ جو ہر وقت مسلمانوں کو مٹانے کی کوشش میں رہتے تھے۔ اور ہمیشہ پاپائے روما کے جھنڈے کے تلے جمع ہوکر قسمیں اُٹھاتے تھے۔ کہ یا تو خود مٹ جائیں گے۔ اور یا دنیا کو مسلمانوں سے پاک کردیں گے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ خلفائے فاطمہ اور خلفائے عباسیہ کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے مصر و بغداد کی سلطنت کمزور ہوکر مسلمانوں کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ تو انھوں نے اپنی قسم کو پورا کرنے کے لیئے ٹڈی دل لشکر کے ساتھ مسلمانوں پر دھاوا بول دیا۔ ایسے خطرناک وقت میں جس شخص نے اسلام کی حفاظت کے لیئے تلوار میان سے کھینچی وہ غازی سلطان صلاح الدین اعظم تھا۔ جو بادل کی طرح گرجا۔ بجلی کی طرح چمکا۔ اور آخر کار ان دشمنوں کے سروں پر چمکے

لشکر شام و فلسطین کے میدانوں میں آندھی و طوفان کی طرح آرہے تھے،
قہرِ عظیم بن کر ٹوٹ پڑا۔ دنیا کی تمام عیسائی سلطنتوں کے جرار لشکر اور
پاپائے روما کے پاس قسمیں اٹھانے والے بہادر مقابلہ میں تھے۔ لیکن شیر اسلام
صلاح الدین غازی کے لشکر کی سیل فنا تلواریں دشمنوں کو مولی گاجر کی طرح کاٹتی
جاتی تھیں۔ اور خداوند یسوع مسیح کے پرستاروں پر اسلام کی ہیبت و جبروت کا
سکہ بٹھاتی جاتی تھیں۔ جب عیسائیوں نے دیکھا۔ کہ ہمارا لشکر غازی صلاح الدین
کی تلوار کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تو وہ گڑگڑا کر معافی کے خواستگار اور صلح کے متمنی
ہوئے۔ فراخ دل سلطان نے ان کو اپنی رحمدلی کی وجہ سے معافی دے کر اپنی
اسلامی شان کا سکہ جما دیا۔

صلیبی جنگوں کی خونیں داستان طویل ہیں۔ لیکن صلاح الدین غازی کے
حالات پڑھنے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ مسلمان دنیا میں عیش و عشرت
کے لئے نہیں آیا۔ بلکہ وہ خود تکالیف اور دکھ اٹھاتا ہے اور دنیا میں امن و امان
قائم رکھتا ہے۔ اس کتاب کو پڑھکر مردہ دل مسلمان کے دل میں بھی ایک دفعہ مجاہدانہ
شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ شروع میں سلطان کی عکسی تصویر اور اخیر میں سلطان کے
مقبرے کا فوٹو دیا گیا ہے ÷ قیمت صرف دو روپے (عہ)

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم
حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم

حاصلِ عمر

یہ طبع زاد ناول زبانِ اردو کے مشہور افسانہ نگار و شاعر جناب نیر قرشی کا انمول شاہکار ہے جس میں تین بگڑے دلوں کا "راہ راست پر آنا" ایسے قدرتی انداز میں دکھایا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول محض افسانہ ہی نہیں بلکہ سچا واقعہ ہے۔ فاضل مصنف نے جا بجا ظرافت کی چاشنی دیکر عبارت کو نہایت دلاویز بنا دیا ہے قیمت بارہ آنے (۱۲/)

ملنے کا پتہ

شیخ علی بخش احمد بخش مالکان
کتب خانہ ذوالادب اندرون بھاٹی دروازہ لاہور

عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم پرنٹر کے چھپا